ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

برہان

مُرتّبہ

سعید احمد اکبرآبادی

ایم اے۔ فاضل دیوبند

بُرہان

جلد ہفتم　　　شمارہ (۱)

جمادی الاخریٰ ۱۳۶۰ھ مطابق جولائی ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ندوۃ المصنفین کا قیام شروع سے اب تک جس مکان میں رہا ہے وہ اگرچہ اپنی مکانیت اور طرزِ تعمیر کے لحاظ سے ایک چھوٹی سی کوٹھی کہلا سکتا ہے۔ اور اس بناپر ہر مہینہ اسکے کرایہ میں ایک معقول رقم ادا کرنی پڑتی ہے لیکن اب وہ ندوۃ المصنفین کی روز افزوں ضرورتوں کے پیش نظر ناکافی اور نہایت تنگ ثابت ہو رہا ہے اب ادارہ کیلئے ضرورت ایسے وسیع مکان کی ہے جس میں مصنفین و رفقا کیلئے الگ الگ کمرے ہوں جن میں وہ اپنے تصنیفی ساز و سامان کے ساتھ یکسوئی سے کام کر سکیں پھر کتبخانے کیلئے ایک بڑا ہال ہونا چاہیے جس میں کتابوں کی الماریاں قرینے سے ترتیب وار رکھی ہوئی ہوں۔ عملہ انتظام کیلئے الگ کم سے کم دو کمروں کی ضرورت ہے۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ایک مہمان خانہ بھی نہایت ضروری ہے تاکہ جو معزز مہمان ندوۃ المصنفین کے تعلق سے تشریف لاتے رہتے ہیں ان کے قیام و آرام کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ مکتبہ برہان کی تجارتی کتابوں اور ندوۃ المصنفین کی خود اپنی مطبوعات کیلئے جدا جدا بڑے کمروں کی ضرورت ہے کہ کتابیں محفوظ اور ترتیب کے ساتھ رہیں۔ پھر ادارہ کے کاتبوں کے بیٹھنے اور ایک دو ملازموں کے رہنے کیلئے بھی جگہ ہونی چاہیے یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد ضرورتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک وسیع اور خاص طرز کے بنے ہوئے مکان کی شدید ضرورت ہے اتنا بڑا مکان اگر کرایہ پر لیا جائے تو علاوہ اس کے کہ اس کیلئے ہر ماہ ایک بڑی رقم ادا کرنی پڑیگی۔ اس میں ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ اول تو کسی مناسب علمی ماحول میں اس طرح کے مکان کا ملنا آسان نہیں ہے اور اگر مل بھی جائے تو بھی کرایہ کا مکان بہر حال کرایہ کا ہوتا ہے۔ جس میں رہنے کا دار و مدار مالک مکان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ندوۃ المصنفین ایسے ادارہ کیلئے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہنا نہ صرف یہ کہ چند در چند دقتوں اور دشواریوں کا سبب ہوگا بلکہ کاروباری لحاظ سے بھی یہ چیز ایک مشہور و معروف ادارہ کیلئے سخت مضرت رساں ہے۔

ان سب امور کا اقتضا یہ ہے کہ ندوۃ المصنفین کا خود اپنا ایک مکان ہونا چاہیے جسمیں ادارہ کے تمام کام خاطر خواہ طریقہ پر انجام پذیر ہوسکیں۔ ہم بہت دنوں سے اس ضرورت کا احساس کر رہے تھے لیکن ملک کے عام پریشان کن حالات کے پیش نظر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ندوۃ المصنفین کے قدردانوں کو اس کی طرف توجہ دلائیں لیکن اب اس ضرورت کے اظہار کی جسارت محض اس بنا پر ہو رہی ہے کہ ہمارے ادارہ کے گرامی قدر مربی و محسن جناب محترم شیخ فیروز الدین صاحب پروپرائیٹر جے۔ بی فیروز کمپنی حسب معمول پچھلے دنوں ادارہ میں تشریف لائے اور مختلف باتوں کے ضمن میں آپ سے مکان کی ضرورت کا بھی ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ واقعی ادارہ کا اپنا مکان ہونا چاہیے۔ موجودہ مکان کرایہ کا ہے اور پھر ضرورتوں کیلئے بہت ناکافی اور تنگ بھی ہے۔

ہم نہایت مسرت اور جذبات سپاس گذاری کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ شیخ صاحب موصوف و ممدوح نے مکان کی ضرورت کا صرف زبان سے ہی اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ اپنی دیرینہ روایاتِ جود و کرم کے مطابق ندوۃ المصنفین کے اپنے مکان کی تعمیر کیلئے پندرہ ہزار روپیہ کی رقم خطیر بھی عنایت فرمادی جو اب تک آپ کے پاس ہی بطور امانت رکھی ہوئی ہے اور تعمیر کا کام شروع ہونے پر فوراً ہمارے پاس آجائے گی۔

دہلی میں آجکل زمینوں کی اور سامانِ تعمیر کی جو روز افزوں گرانی ہے اسکا خیال کرتے ہوئے تعمیر کا تجربہ رکھنے والے حضرات کا تخمینہ ہے کہ ندوۃ المصنفین کے اس مکان کیلئے کم و بیش چالیس ہزار روپیہ درکار ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بادی النظر میں یہ رقم بہت بڑی رقم ہے جس کا فراہم کرنا ملک کے موجودہ اقتصادی حالات میں آسان کام نہیں ہے۔ لیکن خدا کارساز مطلق ہے۔ اس نے جس طرح اب تک چند ضعیف و ناتوان بندوں کو اس ادارہ کی اہم ذمہ داریوں کو اٹھانے اور انھیں خاطر خواہ طریقہ پر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ ہمیں اس کے فضل و کرم سے پوری توقع ہے کہ وہ اسی طرح ہماری اس ضرورت کو بھی باحسن وجوہ پورا کرنے کا سامان کریگا، ہم نے آجتک اپنے کسی کام کیلئے نہ عام چندہ کیا ہے اور نہ اب کریں ہم طبعاً اسے پسند نہیں کرتے۔ اگرچہ ارباب خیر مگر با ذوق حضرات جو اس ادارہ کے کام کو وقت کی ایک اہم اسلامی

ضرورت کی تکمیل سمجھتے ہوں، ہمت کر بیٹھیں تو ان کیلئے مزید پچیس ہزار روپیہ کی رقم کا فراہم کر لینا چنداں دشوار نہیں ہے مسلمانوں کا متمول طبقہ روزانہ ہزار ہا روپیہ اپنے ذاتی تعیش اور راحت و آرام پر خرچ کر دیتا ہے اس کیلئے یہ کونسی بڑی بات ہے کہ وہ ایک معتمد علمی و مذہبی ادارہ کی اہم ضرورت کی تکمیل کیلئے چند ہزار روپیہ کی رقم کا انتظام کر دے اللہ تعالیٰ بیش از بیش جزائے خیر دے جناب محترم شیخ فیروز الدین صاحب کو کہ انھوں نے اس باب میں عملی اقدام کر کے دوسرے اربابِ خیر مسلمانوں کیلئے ایک نمونہ قائم کر دیا۔ اور ان کیلئے ایک ایسا ذریعۂ ترغیب پیدا کر دیا ہے کہ وہ بے تکلف اس کارِ خیر میں شریک ہو کر اپنے لئے اجرِ اخروی کا سامان کر سکتے ہیں۔

جو صاحب اس کام میں دستِ تعاون دراز کر کے سعادت اندوز ہونا چاہیں یا اس سلسلہ میں خط و کتابت کرنے کے خواہشمند ہوں وہ براہِ راست مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی سے مراسلت کریں۔

ذوالقرنین اور سدِّ سکندری

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

اسلامی مسائل میں مستشرقینِ یورپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اکثر تاریخی حقائق کو نظر انداز کر کے اپنے اندازے اور قیاس سے چند ایسے مقدمات وضع کر لیتے ہیں جن سے ان کو اپنے مزعومات اور خیالات میں مدد ملے اور اسلام بلکہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ حقائق کی تردید کی جاسکے۔

چنانچہ اصحابِ رقیم (پیٹرا) کے متعلق قرآنِ عزیز نے جب چند حقائق کا اظہار کیا اور موعظت و عبرت کے لئے ان کے حالات و واقعات کو روشنی میں لایا تو ناواقفیت اور جہل کو چھپانے یا ازراہِ تعصب قرآن کی تکذیب کے لئے رقیم (پیٹرا) کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور جرأتِ بے جا کے ساتھ یہ کہدیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عرب کے سنے سنائے جھوٹے قصے کو وحی الٰہی کہکر بیان کر دیا ہے۔ مگر جب قدرت کے ہاتھوں نے قرآن کے اعلانِ حق کے تیرہ سو سال کے بعد پیٹرا کو ٹھیک اسی مقام پر ظاہر کر دیا اور اسکے عظیم الشان کھنڈر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے تو ان کو حقیقت کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ندامت و شرمساری کے ساتھ قرآنِ عزیز کے اعلان حق کو تسلیم کئے بغیر ان کے لئے کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔

اسی طرح جب قرآنِ عزیز نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک مصر میں فراعنۂ مصر اور قبطیوں کے غلام رہے ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) نے صدیوں کے بعد ان کو خدا کے بخشے ہوئے اعجاز کے ذریعہ نجات دلائی، اور اس مسئلہ میں توراۃ نے بھی ایک حد تک قرآن عزیز اور وحی الٰہی کے علم و یقین کا ساتھ دیا۔ مگر اس کے باوجود ان مدعیان علم نے ایک عرصہ تک بنی اسرائیل کی غلامی

کا انکار کیا اور علمِ حقیقی کی تکذیب کے درپے رہ کر اس کا مذاق اڑایا مگر مصری حفریات نے جب فرعون کے مشہور سنگی کتبہ کا انکشاف کرایا اور کتبہ کی کندہ عبارت نے بنی اسرائیل کی غلامی پر گونہ روشنی ڈالی تو آہستہ آہستہ جہل نے علم کے سامنے شکست قبول کرلی اور اب ان نظریات میں بھی تبدیلی ہونے لگی جو فلسفۂ تاریخ کے نام پر ظن و تخمین سے قائم کئے گئے تھے اور جن کو علم کا درجہ دیا گیا تھا یہانتک کہ اب انکار اقرار کی شکل میں تبدیل ہونے لگا۔

ٹھیک اسی طرح ذوالقرنین، یاجوج ماجوج اور سد کا معاملہ ہے۔ قرآنِ عزیز نے ایک ایسے بادشاہ کا تذکرہ کیا ہے جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق و مغرب تک فتوحات کیں اور دورانِ فتوحات میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج و ماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کرکے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں آپ ہم کو ان سے نجات دلائیے۔ ذالقرنین نے یہ سُنکر ان کو تسلی و تشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی "سد" قائم کردی کہ شکایت کرنے والے یاجوج و ماجوج کے فتنہ سے محفوظ ہوگئے۔

مستشرقینِ یورپ نے جب اس واقعہ کا مطالعہ کیا تو حسبِ عادت اپنے پیشرو مشرکینِ مکہ اور کفارِ عرب کی طرح فوراً یہ کہدیا۔

اِن ھِیَ اِلّا اساطیرُ الاولین   یہ (قرآن) کچھ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں۔

اور بڑے زور شور کے ساتھ یہ دعوٰی کیا کہ ذوالقرنین کا یہ قصہ اخبارِ قرآنی کا اعجاز اور عبرت و موعظت کیلئے حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ عرب کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو "وحی الٰہی" کی حیثیت دیدی گئی ہے۔ ورنہ تاریخی دنیا میں ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کی شخصیتیں اور سدِ ذوالقرنین کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی اعتقاد کی بنا پر بلکہ تاریخی

نقطۂ نگاہ سے یہ واضح کرے کہ قرآنِ عزیز کا بخشا ہوا علم اور وحی الٰہی کا عطا کیا ہوا یقین دوسرے مختلف فیہ مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی اپنی جگہ علم، یقین اور حقیقت ہے اور معترضین کا انکار بلا شبہ جہل، ظن و تخمین، اور باطل مزعومات کا طومار ہے اور ان تاریخی حقیقتوں کا انکار بیجا تعصب اور ہٹ دھرمی کی راہ سے ہے نہ کہ اظہارِ حقیقت کے پیش نظر۔

پس آج کی صحبت میں ہماری بحث کا روئے سخن یہی مسئلہ ہے اور ہماری خواہش ہے کہ اس سلسلہ کے تمام رطب و یابس کے بیان کر دینے کے بعد حقیقتِ حال کو منصۂ شہود اور منظرِ عام پر لایا جائے، تاکہ حق و باطل میں امتیاز ہو سکے۔ اور گمراہی ہدایت سے بدل جائے۔ لیکن اصل بحث سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ قرآنِ عزیز نے اپنے مقصد "موعظت و عبرت" کے پیش نظر جس صاف اور سادہ رنگ میں اس واقعہ کو بیان کیا تھا۔ اسرائیلی روایات اور ان کی پیروی میں مفسرین و مورخین نے اس کے بالکل برعکس ایسے عجوبہ اور دور از کار باتوں سے مزین کر کے پیش کیا کہ بڑی حد تک حقیقتِ حال مستور ہو گئی اور نئے نئے قسم کے الجھاؤ پیدا ہو گئے۔ اور اس پر کسی عقلمند کا یہ مقولہ صادق آنے لگا کہ "جو شے جسقدر زیادہ مشہور ہوتی ہے وہ اسی قدر حقیقت سے دور ہوتی جاتی ہے۔" چنانچہ اس واقعہ کے تحلیل و تفصیل کے بعد عنقریب یہ حقیقت آشکار ہو جائیگی۔

ذو القرنین کی وجہ تسمیہ

اس بحث سے قبل کہ ذوالقرنین کا مصداق کون سی شخصیت ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس ہستی کو ذوالقرنین کیوں کہا گیا اور کیا یہ لقب قرآن عزیز کا دیا ہوا ہے یا اس کے بارہ میں یہ تخیل قرآنِ عزیز سے پہلے قائم ہو چکا تھا اور قرآنِ عزیز نے اسکو صرف روشناس کرایا ہے۔

مشہور حافظِ حدیث، جلیل القدر مفسر اور ممتاز ترین ناقد و مبصر مورخ علامہ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں ابن جریر نے اپنی شہرۂ آفاق تاریخ میں اور ابن عساکر، ابن خلکان، ابن اثیر، ابن خلدون نے اپنی اپنی تاریخوں میں مسعودی نے مروج الذہب میں پھر متاخرین میں بستانی اور

فرید وجدی نے دائرۃ المعارف میں اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس لقب سے ملقب ہونے کے جو وجوہ نقل کئے گئے ہیں اور عربی اور عبرانی رعایات بیان کی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) ذوالقرنین اس لئے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور قرن جس کا ترجمہ سینگ ہے بطور استعارہ کے طاقت و حکومت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی دو حکومتوں کا مالک و والی ــــ یہ اہلِ کتاب کی رائے ہے۔ اور بعض مفسرین اسلام بھی اس کے موئد ہیں۔

(۲) "اس کے سر میں سینگ کے مشابہ دونوں جانب میں دو غدود ابھرے ہوئے تھے" یہ وہب بن منبہؒ کی رائے ہے۔

(۳) وہ فتوحات کرتا ہوا مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہت میں بہت سے ممالک پر قابض و مسلط بنا یہ زہریؒ کا قول ہے۔

(۴) اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصے کر کے اور ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا۔ ان دونوں کو قرن سے تشبیہ دیکر یہ لقب دیا گیا۔ یہ قول حسن بصریؒ کی طرف منسوب ہے۔

(۵) اس نے ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی بادشاہ یا قوم نے غضبناک ہوکر اس کے سر کے ایک جانب میں سخت چوٹ لگائی اور جب اس پر بھی اس نے دعوت توحید کو جاری رکھا تو دوسری جانب چوٹ مار کر اس کو شہید کر دیا۔ اس ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے ان کی وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا۔ اس توجیہ کو حضرت علیؓ کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

(۶) وہ نجیب الطرفین تھا اسلئے والد اور والدہ کی نجابت کو قرن کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور ذوالقرنین کہا گیا۔

(۷) اس نے اسقدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) تک زندہ رہا۔

(۸) وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

(۹) اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

(۱۰) وہ ظاہر اور باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔[1]

ان تمام توجیہات کے مطالعہ سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں حقیقتِ حال کے انکشاف کی جانب متوجہ ہونے کے بجائے جس قدر بھی عقلی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی بیان کر دیئے گئے ہیں اور ہر ظن اور ہر وہم کو روایت کہہ کر اہم بنانے کی سعی کی گئی ہے حتیٰ کہ مشہور تابعی اور اسرائیلی روایات کے مدار وہب بن منبہ سے تو یہاں تک نقل کر دیا گیا کہ ذوالقرنین کا لقب اسلئے دیا گیا کہ بادشاہ کے سر میں واقعی تانبے کے رنگ کے دو ابھرے ہوئے سینگ کے نشان موجود تھے۔[2]

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اس قول کو ترجیح دی ہے کہ قرنین سے مراد دو حکومتوں کا قران السعدین ہے جو ذوالقرنین کی سطوت کے ہاتھوں انجام پایا۔ اور ان دو حکومتوں کی تعیین کرتے ہوئے جس کی وجہ سے یہ بادشاہ ذوالقرنین کہلایا؟ یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے میڈیا (ماده) اور فارس کی حکومتیں مراد ہیں جو صدیوں تک الگ الگ رہیں اور جب اس بادشاہ کے زمانہ میں دونوں ایک ہی حکمرانی میں آگئیں تو حکمران اور اس کی قوم کی عظیم الشان سطوت وحشمت کا باعث بنیں اور شرق وغرب تک حکمران کی وسعتِ مملکت کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

اور انھوں نے قیاس وتخمین سے الگ ہو کر تاریخی حقائق اور حفریاتِ فارس سے یہ ثابت کیا ہے کہ "ذوالقرنین" کا یہ لقب قرآنِ عزیز کا ایجاد نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل اپنے انبیاء علیہم السلام کی پیشگوئیوں کی بنا پر اور اہل فارس وعراق اس کی جبرتنا سطوت اور میڈیا وفارس کے قران السعدین کے

[1] دائرۃ المعارف بستانی جلد ۸ ص۱۴۱ ۔ [2] جلد ۲ ص۳۹۹ و ۴۳۰

پیش نظر شروع ہی سے اس کو اس لقب سے یاد کرتے اور اس کے متعلق ایک خاص تخیل رکھتے تھے
اور اس لقب سے ملقب شخصیت کی تعیین کرتے ہوئے اپنی تحقیق کی تائید میں اصطخر کے ایک مرمریں
مجسمے کو پیش کرتے ہیں جو حفریاتِ فارس کی بدولت ہاتھ آیا ہے اور جس میں فارس و میڈیا کی مشترک
حکومت کے ایک بادشاہ سائرس (کیخسرو) کو اس طرح دکھایا ہے کہ گویا وہ ایک فرشتۂ غیبی ہے جس
کے دونوں بازوؤں پر پر ہیں اور سر پر دو سینگ ظاہر کئے گئے ہیں اور مقدسین کا لباس زیب تن ہے۔
جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عظیم الشان سطوت و صولت اور زبردست فتوحات کے باوجود اس
ہستی کی اخلاقی اور روحانی سربلندی اور خدا ترسی و خدارسی اس درجہ مسلّم تھی کہ اس کی قوم نے اس کو
انسانیت سے بالاتر ظاہر کرتے ہوئے اس کے متعلق ملکوتی تخیل قائم کر لیا تھا، اور فارس و میڈیا کو اس
کی طاقت و قہرمانیت کے دو سینگ قرار دیکر اسکے مجسمہ میں ان کو محسوس دکھایا اور یہود بھی اس تمثیل میں ہمنوا تھے

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے ان اقوال میں سے اس قول کو قریب بہ صواب بتایا ہے کہ
"چونکہ وہ مشرق و مغرب دونوں کناروں تک پھر آیا تھا اور دونوں سمت میں فتوحات بھی کی تھیں اسلئے
ذوالقرنین کے لقب سے مشہور ہوا۔ گویا مطلع الشمس اور مغرب الشمس کو قرنین (دو سینگ) کے ساتھ
تشبیہ دی گئی ہے۔

بہر حال مسطورہ بالا تمام احتمالات و اقوال میں سے قابل ترجیح اور معقول دو ہی قول نظر آتے ہیں۔

(الف) یہ کہ "قرنین" کی تشبیہ مشرق و مغرب کی سیاحت و فتوحات کی وجہ سے ہے۔

(ب) یہ کہ یہ تشبیہ دو حکومتوں کی متفقہ شاہنشاہیت کی جانب اشارہ ہے کہ جن کے قران السعدین
سے ذوالقرنین کی شخصیت میں امتیازی شان پیدا ہوئی اور اس کو اس لقب سے ملقب کیا جانے لگا۔

مگر ان دو حکومتوں سے فارس اور روم مراد نہیں ہو سکتے جیسا کہ مسطورہ بالا اقوال میں سے
کسی قول میں ظاہر کیا گیا ہے اسلئے کہ یہ قول ان حضرات کا مختار ہے جو ذوالقرنین کو سکندرِ مقدونی سمجھتے

ہیں اور آئندہ سطور سے معلوم ہوگا کہ یہ خیال قطعاً باطل اور قرآنِ عزیز کی تصریحات کے خلاف ہے۔

پس اس دوسری تشبیہ کے پیشِ نظر قرینِ صواب وہ قول نظر آتا ہے جس کو نہایت بسط کے ساتھ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں بیان کیا ہے

ذوالقرنین کی شخصیت

اب اس مسئلہ کو اسی حد پر رہنے دیجئے اور آگے بڑھکر یہ زیرِ بحث لائیے کہ قرآنِ عزیز نے جس کو ذوالقرنین کہا ہے وہ کس شخصیت کا لقب ہے؟ تاکہ نفس مسئلہ پر روشنی پڑ سکے اور اس کے ضمن میں لقب کی تشریح و ترجیح کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔

قرآنِ عزیز میں ذوالقرنین کے واقعہ کا آغاز اس طرح ہوا ہے کہ ایک مرتبہ یہود کی تلقین پر مشرکین مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر یہ سوال کیا کہ اگر آپ خدا کے سچے نبی اور رسولؐ ہیں تو بتائیے کہ ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا اور وحی الٰہی کا انتظار کیا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔[1]

یسئلونک عن ذی القرنین ۔ قل	(اے پیغمبر) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں۔ تم
سأتلوا علیکم منہ ذکرا ۔ انا	کہدو۔ میں اس کا کچھ حال تمہیں (قرآن میں) پڑھکر سنا دیتا ہوں۔
مکنا لہ فی الارض واتینٰہ من	ہم نے اسکو زمین میں حکمرانی دی تھی اور اس کیلئے ہر قسم کا
کل شی سببا ۔ فاتبع سببا ۔	سازوسامان مہیا کر دیا تھا تو اس نے (ایک مہم کا) سامان کیا
حتی اذا بلغ مغرب الشمس	یہانتک کہ (پچھم کی جانب چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی
وجدھا تغرب فی عین حمئۃ	جگہ پہنچ گیا تو سورج ایسا دکھائی دیا کہ وہ دلدل کی جھیل میں
ووجد عندھا قوما ۔ قلنا یا	ڈوب رہا ہے اور وہاں لوگوں کو (بھی آباد) پایا۔ ہم نے کہا۔
ذالقرنین اما ان تعذب و	اے ذوالقرنین (اب تجھ کو اختیار ہے کہ) تو ان لوگوں کو تکلیف

[1] روح المعانی جلد ۱۶ سورۂ کہف ۔

اما ان تتخذ فیہم حسنا ۝ قال
اما من ظلم فسوف نعذبہ
ثم یرد الی ربہ فیعذبہ
عذابا نکرا ۝ واما من امن
وعمل صالحا فلہ جزاء ن
الحسنی ۝ وسنقول لہ من
امرنا یسرا ۝ ثم اتبع سببا ۝
حتی اذا بلغ مطلع الشمس
وجدہا تطلع علی قوم لم
نجعل لہم من دونہا سترا ۝
کذلک ۝ وقد احطنا بما
لدیہ خبرا ۝ ثم اتبع سببا ۝
حتی اذا بلغ بین السدین
وجد من دونہما قوما لا یکادون
یفقہون قولا ۝ قالوا یذا القرنین
ان یاجوج وماجوج مفسدون
فی الارض فہل نجعل لک خرجا
علی ان تجعل بیننا وبینہم سدا ۝
قال ما مکنی فیہ ربی خیر

اور عذاب میں ڈالے یا ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ
کرکے (ان کو اپنا بنالے) ذوالقرنین نے کہا کہ جو شخص بھی سرکشی
کریگا اور بے انصافی تو ہم اس کو ضرور سزا دینگے پھر اس کو اپنے
پروردگار کی طرف لوٹنا ہے اور وہ اس کو سخت عذاب میں
مبتلا کریگا اور جو ایمان لائیگا اور اچھے اعمال کریگا تو اسکے بدلے
اسے بھلائی ملیگی اور ہم اسکو اپنے ایسے ہی حکم دینگے کہ جس
میں اس کیلئے راحت و آسانی ہو۔ پھر اس نے ایک (مہم) کا
سامان کیا یہانتک کہ جب (پورب کی جانب چلتے چلتے) سورج
کے نکلنے کی جگہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر نکلتا
ہے کہ ہم نے اس کے اور سورج کے درمیان کوئی آڑ نہیں رکھی
ہے (واقعہ) یونہی ہے۔ اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ تھا ہمیں
اس کی پوری پوری خبر ہے۔ پھر اس نے ایک (مہم) کا سامان
کیا یہانتک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو وہاں اس نے
پہاڑوں کے ورے ایسے لوگوں کو پایا کہ جو بات ان سے کہی جائے
وہ نہیں سمجھتے۔ وہ (اپنی زبان میں) کہنے لگے اے ذوالقرنین!
یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں، کیا ایسا
ہوسکتا ہے کہ ہم تیرے لئے خراج مقرر کردیں اس شرط پر کہ تو ہمارے
اور ان کے درمیان ایک روک بنادے ذوالقرنین نے کہا میرے
پروردگار نے جو کچھ مجھ کو دے رکھا ہے وہ میرے لئے بہتر ہے (تمہارے

فاعینونی بقوۃ اجعل بینکم وبینھم ردماً آتونی زبر الحدید حتی اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتی اذا جعلہ نارا قال اتونی افرغ علیہ قطراً فما اسطاعوا ان یظھروہ وما استطاعوا لہ نقباً قال ھذا رحمۃ من ربی فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء وکان وعد ربی حقاً وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض ونفخ فی الصور فجمعنٰھم جمعاً

خراج کی حاجت نہیں ہے) مگر اپنی قوت سے اس کام میں میری مدد کرو میں تمہارے اور یاجوج وماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دونگا۔ اس نے کہا تم میرے لئے لوہے کی سلیں مہیا کردو (اور سامان مہیا ہونے کے بعد) جب دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھاکر ان کے برابر کردی تو حکم دیا کہ اسکو دھونکو یہانتک کہ جب اسکو (دھونک دھونک کر) لال انگارا کردیا تو کہا کہ پگھلا ہوا تانبا لاؤ کہ اس پر انڈیل دیں کہ پھر یاجوج ماجوج اس پر نہ چڑھ سکیں اور نہ سوراخ کرسکیں۔ ذوالقرنین نے (اس سے فارغ ہوکر) کہا کہ یہ سب میرے پروردگار کی مہربانی ہے پھر جب میرے پروردگار کا وعدہ آئیگا تو وہ اس کو ڈھاکر ریزہ ریزہ کردیگا اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے اور اس وعدہ کے دن ہم اُن یاجوج ماجوج کو ایسا کردینگے کہ بھیڑ میں ایک دوسرے کے اندر موجیں مار رہے ہیں اور پھونک ماریںگے ہم صور میں پھر جمع کرلائینگے ہم ان سب کو۔

سورۂ کہف کی ان آیات کے شانِ نزول کو پیش نظر رکھنے اور ان کے معانی پر بہ نظر امعان غور کرنے سے حسب ذیل چند امور صاف اور نمایاں طور پر واضح ہوتے ہیں۔

(۱) یہ واقعہ کسی نہ کسی انداز میں بنی اسرائیل کے یہاں جانا بوجھا واقعہ تھا۔

(۲) یہود نے اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کی حقیقت کے متعلق خود استفسار کیا یا مشرکین مکہ سے استفسار کرایا تاکہ آپ کی صداقتِ رسالت کا امتحان کریں۔

(۳) جس شخص کی نسبت یہود نے سوال کیا ہے وہ ان کے یہاں پہلے سے ذوالقرنین کے

نام سے مشہور تھا، قرآنِ عزیز نے اس کیلئے یہ لقب از خود تجویز نہیں کیا۔ آیۃ "یسئلونك عن ذی القرنین" ان چہارگانہ امور کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اس کیلئے حکمرانی کے تمام سازوسامان عطا فرمائے تھے اور وہ زبردست حکمران تھا۔ "انا مکنا لہ فی الارض وآتیناہ من کل شیءٍ سبباً"

(۵) اس کی تین مہمیں قابل ذکر ہیں۔ مغربی کنارہ تک پہنچنا، مشرقی کنارہ تک جانا۔ اور ایسے مقام تک پہنچنا جہاں پہاڑی درہ تھا اور دو پہاڑوں کے اتصال سے پرے ایک قوم یاجوج ماجوج آباد تھی جو درے سے باہر آکر لوٹ مار مچایا کرتی تھی۔ "حتی اذا بلغ مغرب الشمس" "حتی اذا بلغ مطلع الشمس" "حتی اذا بلغ بین السدین وجد من دونہما قوماً" "قالوا یاذا القرنین ان یاجوج و ماجوج مفسدون فی الارض" الآیات)

(۶) اس نے درہ میں ایک مضبوط دیوار (سدّ) قائم کردی اور اس جانب سے یاجوج وماجوج کی راہ بند ہوگئی۔ "قال ما مکنی فیہ ربی" (الی) فما استطاعوا لہ نقباً" الآیہ

(۷) یہ سدّ ایسی جگہ قائم ہے جہاں قدرتی طور پر دو پہاڑوں کے درمیان درہ ہے اور لوہے اور تانبے کی آمیزش سے بنائی گئی ہے۔

(۸) وہ ایک عادل اور منصف حکمران تھا اس لئے اس نے مغربی سفر میں قوموں کے سامنے یہ اعلان کردیا کہ ظالم اور سرکش کو تو ضرور سزا دیجائے گی لیکن نیکوکاروں کیلئے کوئی خطرہ نہیں "قال امّا من ظلم فسوف نعذبہ (الی) واما من آمن وعمل صالحاً فلہ جزاءن الحسنیٰ"

(۹) وہ مسلمان اور خدا رسیدہ بادشاہ تھا اور آخرت پر یقین رکھتا تھا۔ "ثم یرد الی ربہ فیعذبہ عذاباً نکراً" "قال ھذا رحمۃ من ربی (الی) وکان وعد ربی حقاً"

(۱۰) وہ طامع وحریص نہ تھا اور خدا کی مخلوق پر شفیق اور مہربان تھا کیونکہ جب تیسری مہم میں

ایک قوم نے یاجوج و ماجوج سے بچنے کیلئے سد قائم کردینے کی درخواست کرتے ہوئے خراج (محصول) ادا کرنے کا وعدہ کیا تو اس نے یہ کہکر انکار کردیا "ما مکنّی فیہ ربی خیر" میرے لئے وہ بہت کافی ہے جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے۔

ذوالقرنین کے بارہ میں قرآنِ عزیز کے بتائے ہوئے یہ امتیازات کس بادشاہ میں جمع ہیں اور کون شخص ان خصوصیات کا واقعی حامل ہے۔ مورخین و مفسرین کو اس کے متعلق سخت حیرانی ہے اور وہ آپس میں بہت زیادہ مختلف نظر آتے ہیں ؟

امام رازی رحمہ اللہ اور ان کے اتباع میں سید آلوسی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ سکندر یونانی (رومی) ہے اور اس کو سکندر مقدونی بھی کہتے ہیں۔ لیکن اس دعویٰ کے باوجود جو اعتراضات اس قول پر وارد ہوتے ہیں ان کی قوت کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قرآنِ عزیز کا ذوالقرنین بلاشبہ مسلمان، خداپرست اور آخرت پر یقین رکھنے والا تھا اور سکندر مسلمان نہ تھا جبکہ مشہور یونانی فیلسوف ارسطو اس کا استاذ اور اتالیق تھا۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگرچہ ارسطو اس کا وزیر اور استاذ ضرور تھا لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاگرد اور بادشاہ بھی اپنے استاد و وزیر کا ہم مشرب ہو، حتیٰ کہ ملا نظام الدین شیرازی کے حوالہ سے یہاں تک ثابت کردیا کہ خود ارسطو بھی کافر نہ تھا۔

لیکن امام صاحب کا یہ جواب منطقی اعتبار سے صحیح ہو تو ہو تاریخی لحاظ سے درست نہیں ہے اسلئے کہ سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب "دیوتاؤں کی پرستش" کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔ رہا ارسطو تو اس کا فلسفۂ الہیات آج بھی مدون موجود ہے اور ادنیٰ بصیرت سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلامی الہیات اور یونانی فلسفۂ الہیات میں کسقدر بونِ بعید ہے ؟ اس کے علاوہ سکندر باتفاق اصحابِ تاریخ جابر و قاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس۔ نیز یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے

کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔ اسلئے امام صاحب کا اس بارہ میں بے دلیل دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال تفسیر کبیر اور روح المعانی کے مطالعہ سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ سکندر مقدونی کو ذوالقرنین تسلیم کرنے میں خود امام صاحب اور سید آلوسی کو بھی اطمینان نہیں ہے۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس قول کو بہت سختی کے ساتھ رد کیا ہے فرماتے ہیں۔

وانما نبهنا علیہ لان کثیراً من الناس یعتقد انہما واحد وان المذکور فی القرآن ھو الذی کان ارسطاطالیس وزیرہ فیقع بسبب ذلک خطاء کبیر و فساد عریض طویل کثیر فان الاول کان عبداً مومناً صالحاً وملکاً عادلاً وکان وزیرہ الخضر وقد کان نبیاً علی ما قررناہ قبل ھذا واما الثانی فکان مشرکاً وکان وزیرہ فیلسوفاً[1]

ہم نے اس پر اسلئے متنبہ کر دیا کہ بہت سے لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہیں اور یہ کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ وہی ہے جس کا وزیر ارسطو تھا، اس اعتقاد سے بہت سخت غلطی پیدا ہوتی اور بہت زیادہ فساد لازم آتا ہے اسلئے کہ پہلا شخص (ذوالقرنین) مسلمان صالح اور بادشاہ عادل تھا اور اسکے وزیر خضر علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں بلاشبہ وہ نبی ہیں اور دوسرا (سکندر یونانی) مشرک تھا اور اس کا وزیر فلسفی تھا۔

اور آگے چلکر فرماتے ہیں

ولا یشتبھان الا علی غبی لا یعرف حقایق الامور[2]

اور یہ دونوں شخصیتیں اس غبی ہی پر مشتبہ رہ سکتی ہیں جو حقائق امور سے ناواقف ہو۔

اور حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابن جریر نے ایک روایت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین سکندر تھا۔ لیکن یہ روایت ناقابلِ اعتماد اور ضعیف ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۶ ۔ [2] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۹۴ و ۲۹۵

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ذوالقرنین کا باب اسی لئے قائم کیا ہے کہ اس شخص کے قول کو غلط ثابت کریں جو یہ کہتا ہے کہ ذوالقرنین سکندرِ یونانی تھا۔[1]

ذوالقرنین کی شخصیت کی تعیین میں دوسرا قول اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ تاریخ میں دو جدا جدا اسکندر رہیں ایک یونانی اور دوسرا رومی اور ذوالقرنین رومی ہے نہ کہ صاحبِ ارسطو یونانی۔ مگر یہ قول تو کسی طرح بھی درخورِ اعتنا نہیں ہے اسلئے کہ تاریخ کی ابجد سے واقف شخص بھی یہ جانتا ہے کہ سکندر صاحبِ ارسطو ہی یونانی ہے اور رومی بھی بلکہ مقدونی بھی۔ یونان کا باشندہ ہے۔ اور روم و مقدونیہ دونوں اس کی حکمرانی اور شاہنشاہی میں داخل تھے اسلئے رومی اور مقدونی بھی کہلاتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ فارس کا مشہور بادشاہ فریدوں "ذوالقرنین" ہے لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس پر بھی ان خصوصیات و امتیازات کا بحیثیت مجموعی اطلاق نہیں ہوتا جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے۔ مثلاً اس کی فتوحات و سیاحت کی مہم شرق و غرب اور بین السدین تک ثابت نہیں ہے۔

ان آرار و خیالات کے مقابلہ میں حافظ عماد الدین بن کثیر، حافظ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے اربابِ تحقیق نے اپنا رجحان اسطرف ظاہر کیا ہے کہ زیر بحث ذوالقرنین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر ہے اور وہ یونانی نہیں بلکہ حمیری عرب ہے اور یہ کہ اگر اسکندر یونانی کو ذوالقرنین کہا گیا ہو تو حمیری کی بعض نمایاں صفات و امتیازات کی مشابہت کے پیش نظر کہدیا گیا ورنہ "ذو" کی نسبت عجم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی اور حمیری بادشاہوں کے ناموں میں اس نسبت کا اطلاق بہ کثرت پایا جاتا ہے مثلاً ذونواس ذوعین، ذی یزن، ذوجدن۔ اور یہ کہ اس کا نام مصعب بن عبداللہ تھا یا عبداللہ بن ضحاک وغیرہ وغیرہ اور یہ کہ حمیری شعراء کے بعض اشعار میں اس پر فخر کیا گیا ہے کہ ذوالقرنین ان ہی کے خاندان سے تھا۔

یہ قول اگرچہ اکثر عرب مورخ اور جلیل القدر محدثین و مفسرین کا مختار ہے اور حافظ ابنِ حجرؒ نے

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۹۴ و ۲۹۵

اس سلسلہ میں بعض آثار بھی نقل کئے ہیں تاہم عرب مورخین اور مفسرین کی بیان کردہ اُس تاریخ کے پیش نظر جو حمیری اور یمنی بادشاہوں کے نام، لقب اور نسب سے متعلق ہے یہ قول بھی درست نہیں بیٹھتا اسلئے کہ یمن کے حمیری بادشاہوں میں ان اوصاف وامتیازات کا کوئی بادشاہ نظر نہیں آتا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بھی ہو اور ان خصوصیات کا حامل بھی۔ نیز اگر یہ صحیح بھی مان لیا جائے کہ وہ حمیری تھا اور حضرت ابراہیمؑ کا معاصر تو پھر اس قول کے تسلیم کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت خضرؑ اس کے وزیر تھے حالانکہ وہ صاحب موسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ کا فاصلہ تقریباً پندرہ سولہ سو سال ہوتا ہے اس کے علاوہ اس قول کے قائل یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے شرق وغرب کو فتح کیا اور اپنے تین بیٹوں پر مملکت کو تقسیم کر دیا تو یہ واقعہ کسی ایسے حمیری بادشاہ پر صادق نہیں آتا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر ہو۔ البتہ تاریخی حقائق کے اعتبار سے فارس کے بادشاہ فریدوں پر یہ ضرور صادق آتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کا معاصر کہا جاتا ہے اور جس نے زبردست فتوحات کے بعد اپنی مملکت کو اپنے تین بیٹوں پر تقسیم کر دیا تھا۔ ان اشکالات کے ماسوا اور بھی چند اہم اشکال سید آلوسی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں جو قابلِ مراجعت ہیں[۱]۔ ان تمام شواہد ونظائر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قول بھی محقق نہیں ہے۔ نیز قرآن عزیز کا اس قصہ کو حضرت موسیٰؑ کے واقعہ سے متصل بیان کرنا بھی کچھ اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ ذوالقرنین حضرت ابراہیمؑ کا معاصر نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کی شخصیت ہے مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ایسی شخصیت کا مصداق سکندر یونانی کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے جیسا کہ سید آلوسی کا خیال ہے۔

ان تمام اقوال سے جدا ایک وہ رائے ہے جو استاذ محترم آیۃٌ من آیاتِ اللہ علامہ انور شاہ (کشمیری)

---

[۱] روح المعانی جلد ۱۶ صفحہ ۲۴ و ۲۵۔

نوراللہ مرقدہ کا مختار ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اہلِ مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال فغفورِ چین کی جانب ہے اسلئے کہ اگر وہ مشرقی ہوتا تو قرآنِ عزیز اس کے سفرِ مغرب کے بعد یہ کہتا کہ پھر وہ مشرق کو لوٹ گیا یعنی اپنے وطن کی جانب مراجعت کر گیا، یہ نہ کہتا" واخابلغ مطلع الشمس" (الآیہ) اور نہ وہ اہل مغرب میں سے تھا بلکہ مشرق و مغرب کے درمیانی علاقہ کا باشندہ تھا، اور راجح یہی ہے کہ وہ یمن کے حمیری بادشاہوں (اذواءِ الیمن) میں سے بھی نہیں تھا اور نہ عجمی بادشاہوں میں سے وہ کیقباد تھا اور نہ سکندر بن فیلقوس (یونانی) بلکہ عربی نژاد تھا اور قدیم سامی قبائل میں سے کسی قبیلہ کا فرد تھا۔[1]

دراصل حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے مختلف آرار کی تحقیق و تفتیش کے بعد صاحبِ ناسخ التواریخ کے قول کو ترجیح دی ہے جیسا کہ خود انھوں نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ نیز یہ کہ صاحبِ ناسخ نے اس کا نام مصعب بن روم بن یونان بن تارخ بن سام بن نوح بتایا ہے۔ انھوں نے صاحب ناسخ کا یہ حوالہ بھی نقل کیا ہے کہ اگر ذوالقرنین کو عجمی بادشاہ گورش (کے ارش یا کیخسرو) ہی مان لیا جائے تو بھی وہ کیقباد نہیں ہے اور یہ دونوں شخصیتیں جدا جدا ہیں اور گورش سلاطینِ بابل (عراق) کے دوسرے طبقہ کا بادشاہ ہے۔[2]

ان اقوال و آرار کے علاوہ بعض اور بھی بہت ضعیف اور کمزور اقوال ہیں جن کو قصداً نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ بہرحال ان تمام نقول کا مقصد یہ ہے کہ تعیینِ شخصیت میں تاریخی اختلافات کے باوجود انبیارِ بنی اسرائیل کے صحیفوں، یہودی روایات اور تاریخِ قدیم کے ابواب سب اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ذوالقرنین کوئی فرضی اور افسانوی شخصیت نہیں ہے بلکہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے اور اسکا سامی اقوام اور سامی قبائل سے تعلق تھا۔ البتہ یہود کے یہاں اس کی تاریخ کی تفصیلی کڑیاں گم ہو گئی تھیں۔

---

[1] عقیدۃ الاسلام عربی صفحہ ۱۹۷ - [2] صفحہ ۱۹۷

ان کو قرآن عزیز نے اس حد تک روشن اور نمایاں کر دیا جس حد تک سائلین کے امتحانی سوال سے تعلق تھا یا جس حد تک اس کے مقصدِ موعظت کیلئے مناسب تھا۔ باقی تفصیلی تاریخ اسکے موضوع سے خارج ہے۔

لیکن اس حد پر پہنچ کر بھی ذوالقرنین کی شخصیت سے متعلق ہم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے تاآنکہ یہ واضح نہ کر دیں کہ ان اقوالِ بالا میں سے کونسا قول راجح اور قرین بہ صواب ہے اور قرآن کے بیان کردہ مجموعی اوصاف کس پر ٹھیک صادق آتے ہیں۔

کتب تاریخ و تفسیر کے مطالعہ اور مراجعت کے بعد ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں دو رائے زیادہ قابل توجہ اور قرینِ صواب نظر آتی ہیں۔ اگر ان قرائن و شواہد کو ترجیح دیجائے جن سے ذوالقرنین کا وجود انبیاء بنی اسرائیل کے زمانے سے پہلے ثابت ہوتا ہے تو اُستاذِ محترم حضرت علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ نے جس قول کو اختیار فرمایا ہے صرف وہی قرین صواب ہے وہ یہ کہ ذوالقرنین قدیم سامی قبائل میں سے کسی قبیلہ کا فرد ہے۔ صاحب ناسخ التواریخ یہ زمانہ ہبوط آدم سے (۳۴۶۰) سال بعد بیان کرتا ہے - اور یہ مدت زمانۂ تاریخ سے قبل کی ہو جاتی ہے۔"

اور اگر ان قرائن و شواہد کو قابل ترجیح سمجھا جائے جو ذوالقرنین کو انبیاء بنی اسرائیل کے زمانہ میں تسلیم کرتے ہیں تو مولانا ابوالکلام آزاد کا مختار قول اقرب الی الصواب ہے اور اس صورت میں ذوالقرنین کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل کا زمانہ ہے اور بلاشبہ وہ سکندر یونانی نہیں ہے۔ پھر ان ہر دو اقوال میں یہ فرق ہے کہ حضرت استاذ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب (عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام) میں اس مسئلہ کو ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے اور اس جگہ ان کا مطمح نظر ذوالقرنین کی شخصیت کی تعیین نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) کی ان ہفوات کی تردید مقصود ہے جو یاجوج ماجوج سد اور دجال کے متعلق ہیں اور جن پر قادیانی نے اپنی نبوت اور یسوع مسیح کے دعوے کی بنیاد قائم کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یورپ کی موجودہ متمدن اقوام ہی وہ یاجوج ماجوج ہیں

جن کا ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے اور یہ کہ دجّال ان کے پادری ہیں اور یہیں ہی وہ یسوع مسیح ہوں جو قربِ قیامت میں آکر ان سب کا استیصال کریگا۔

حالانکہ قادیانی مشن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اُسنے اقوامِ یورپ کے الحاد و زندقہ فساد فی الارض اور دجل کو روکنے یا ختم کردینے کی بجائے ممالک اسلامیہ کو یورپ کی بعض حکومتوں کے استعماری عزائم کے حوالہ کرنے اور غلام بنانے، جہاد جیسے فریضہ کی منسوخی کا اعلان کرکے بزعم خود یاجوج ماجوج کو خوش کرنے اور اپنے منکرین پر کفر کا عام فتویٰ دیکر کروروں پرستاران توحید کو کافر اور خارج از اسلام قرار دینے کی علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ اور نام نہاد تبلیغ اسلام کے پردہ میں بھی اپنے مشن کی کامیابی کے علاوہ اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔"

بہرحال حضرت شاہ صاحب نے اس مقام پر اس مقصد کو پیش نظر رکھکر بحث فرمائی ہے اور ذوالقرنین کے مسئلہ کو اس طرح نہیں لیا کہ گویا وہ تاریخی حیثیت سے اس کا دوٹوک فیصلہ کررہے ہیں کہ ذوالقرنین کی شخصیت فلاں شخص میں منحصر ہے اسلئے جو کچھ فرمایا ہے کتبِ تاریخ و تفسیر میں بیان کردہ اقوال میں سے ایک قول کو صرف ترجیح دینے پر اکتفا کیا ہے۔

اس کے برعکس مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں اس مسئلہ کی جانب خصوصیت کے ساتھ یہ مقصد پیش نظر رکھکر توجہ کی ہے کہ مستشرقینِ یورپ قرآنِ عزیز کے اس واقعہ کو اساطیرِ اولین کہکر مذاق اڑاتے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ عرب کا اختراعی افسانہ ہے کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے اور نہ دنیائے تاریخ میں اس شخصیت کا کوئی اتا پتا ہے"۔ پس انھوں نے تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت تاریخی شخصیت ہے اور قرآنِ عزیز کا ذوالقرنین اپنے مجموعۂ اوصاف و امتیازات کے ساتھ بلاشبہ تاریخ کا ذوالقرنین ہے۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر بہت تفصیلی بحث کی ہے جو اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔ انھوں نے اس بحث میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ذوالقرنین

فارس ومیڈیا کا شاہنشاہ "گورش" ہے جسکو خورس، سائرس اور عربی میں "کیخسرو" کہتے ہیں اور جو دارا کا جدِ اعلیٰ ہے اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت کے لئے تاریخی حقایق سے یہ ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سے متعلق قرآنِ عزیز کے بیان کردہ امتیازات سب کے سب اس کے اندر موجود ہیں۔ مثلاً

(۱) بابل کی شاہنشاہیت کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی اور پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں دوبارہ اس کی تعمیر نیز سائرس کے ذریعہ بنی اسرائیل کی خوشحالی و آزادی کے متعلق ایکسو ساٹھ سال قبل یسعیاہ نبی کی (۲۱-۲۴) اور ساٹھ سال قبل یرمیاہ نبی کی (۵۰-۱) پیشگوئی اور بشارت (بلکہ یسعیاہ نبی کی پیشگوئی میں تو خدا کی طرف سے خورس کو اپنا چرواہا بتایا گیا ہے۔)

اس کے بعد دانیال علیہ السلام نے بیت المقدس کی تباہی اور بنی اسرائیل کی غلامی کے دور میں جو خواب دیکھا تھا۔ اس میں دو سینگوں والے مینڈھے کا تفصیلی تذکرہ اور حضرت دانیال علیہ السلام کو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا اس کی تعبیر یہ بتانا کہ دو سینگوں والے مینڈھے سے مادہ اور فارس کی شاہنشاہیت مراد ہیں سو یہی وہ تخیل تھا جس نے بنی اسرائیل میں سائرس (خورس) کو ذوالقرنین کے لقب سے ملقب کرایا۔ اور آخر کار ان انبیاء علیہم السلام کی یہ پیشگوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں اور میڈیا و فارس کی شاہنشاہیت کو قران السعدین بنانے والے خورس نے تقریباً ساڑھے پانچسو سال قبل مسیح بابل جیسے ناقابل تسخیر شہر کو برباد کر کے اور حکومت بابل کو شکست فاش دے کر بنی اسرائیل کو آزاد کیا اور بیت المقدس (ہیکل) کی دوبارہ تعمیر کرائی اور اس کا بیحد احترام کیا (عزرا باب ۱)

پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت یہود کے یہاں ایک جانی پہچانی شخصیت تھی اگرچہ ایک عرصہ کے بعد اس کی حقیقی تصویر اور متعین و مشخص زندگی کی تفصیلات نظر سے اوجھل ہو گئیں اور بنی اسرائیل ان تفصیلات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ مگر آہستہ آہستہ اس تاریکی سے پردہ اٹھ گیا خصوصاً اصطخر کی کھدائی کے سلسلہ میں خورس (سائرس) کے مجسمہ کا اسی اسرائیلی تخیل کے مطابق

دو سینگوں والا ہونے اور ملکوتی اوصاف سے متصف ظاہر ہونے نے نیز دارا کے کتبۂ بے ستون کی تاریخی تفصیلات نے اس معاملہ کو حقیقی صورت و شکل میں ظاہر کر کے تمام گنجلکوں کو دور کر دیا۔

(۲) اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ذوالقرنین کا یہ لقب قرآنِ عزیز کا تجویز کردہ نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل اور خود اس کی اپنی قوم کا تجویز کردہ ہے۔

(۳) بنی اسرائیل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بنا پر امتحان و آزمائش کے طور پر یہ سوال کیا یا کرایا کہ عرب عام طور سے اس کی شخصیت سے نا آشنا تھے اور بنی اسرائیل کیلئے یہ شخصیت خاص طور پر متبرک و مقدس تھی اور انبیا بنی اسرائیل کی بشارت و پیشگوئیوں کا نتیجہ۔

(۴) انھوں نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ سائرس کی تاریخ ان تین مہموں سے اسی طرح وابستہ ہے جس طرح قرآنِ عزیز نے ان کا ذکر کیا ہے۔

(۵) پہاڑی علاقہ کی جانب سفر میں جس سدّ کا قرآنِ عزیز نے ذکر کیا ہے اور اپنے خاص انداز میں سدّ کے جائے وقوع اور مختصر تفصیل کو جس طرح بیان کیا ہے وہ صرف اسی سدّ پر صحیح اترتی ہے جو سائرس (خورس) نے تعمیر کرائی (اس کے متعلق تفصیل عنقریب یاجوج ماجوج کی بحث میں بیان کی جائیگی)۔

(۶) وہ بلاشبہ عادل اور شفیق و مہربان بادشاہ تھا اور مظلوم قوموں کیلئے اس کی شخصیت خدا کے فرستادہ کی طرح ثابت ہوئی یہود کی آزادی، انکا اور بیت المقدس کا احترام اور ماتحت قوموں کے ساتھ انصاف کے واقعات اسکی روشن دلیل ہیں

(۷) دارا کے کتبۂ بے ستون سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائرس (کیخسرو) مسلمان، خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور اپنے زمانہ کے پیغمبر کی سچی تعلیم کا مبلغ و داعی تھا۔

(۸) اس کی سدّ نے یاجوج و ماجوج کے لئے واقعی پہاڑ کے اُس طرف کی راہ کو بند کر دیا اور اِدھر کی قومیں ان کی لوٹ مار سے بچ گئیں۔

(۹) وہ طامع نہ تھا اس لئے اس نے اس سدّ کے بنانے میں شکایت کرنیوالی قوم پر کوئی ٹیکس

نہیں لگایا اوران کو اپنے حرص و آز کا شکار نہیں بنایا۔ اور یہ سب واقعات سائرس کی تاریخ میں محقق ہیں)

غرض تاریخ کی روشنی میں اس کی شخصیت قرآن عزیز کے بیان کردہ ذوالقرنین پر بغیر کسی تاویل اور توڑ مروڑ کے ٹھیک ٹھیک منطبق ہوتی ہے اس لئے اس کی شخصیت کو افسانوی قصہ بنانا تاریخی حقائق کو جھٹلانا ہے۔

پس سطورہ بالا تفصیلات کے بعد ہمارا خیال یہ ہے کہ ذوالقرنین کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد متعین ہے اور اگر وہ واقعی خورس (کیخسرو) ہے تو یہ مستبعد نہیں ہے اسلئے کہ اس کی شاہنشاہیت کا مشہور کارنامہ یعنی بنی اسرائیل کو بابل کی حکومت سے آزاد کرانا، بیت المقدس کو دوبارہ تعمیر کرانا، اور مذہب یہود کی عزت و حرمت کو اپنا شعار بنانا۔ اس بات کو بہت زیادہ وزنی بنادیتا ہے کہ یہود کو اس سے خاص شغف رہا ہے اور اس لئے اس کا سکہ ان کے قلوب پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ کسی نبی کی صداقت کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اس کو خدا کے مقبول مذہب موسوی کے نجات دہندہ کا حال معلوم ہونا چاہئے کہ جس کی آمد کا حال انبیاء بنی اسرائیل نے آمد سے پہلے سنا دیا تھا۔

نیز یہ کہ یہ نہ رومی ہے اور نہ یونانی بلکہ اگر عرب مورخین کی روایات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی استبعاد نہیں ہے کہ فارس کے بادشاہوں کا یہ سلسلہ کہ جس میں ضحاک کیقباد اور کیخسرو داخل ہیں اصل نسب کے اعتبار سے "سامی النسل" ہیں۔ نہ کہ آرین قبائل کی نسل سے۔

پس تعیین و تشخیص کے متعلق مولانا آزاد کی رائے اگرچہ بحث و نظر کا دروازہ حتمی اور قطعی طور پر بند نہ کرتی ہو لیکن اس کے راجح اور محقق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

اور سکندر یونانی اور اس کے استاذ و وزیر ارسطو کو مسلمان ماننے اور قرآنِ عزیز کی آیات کا اس کو مصداق بنانے کے مقابلہ میں تو ان کی یہ تحقیق بدرجہا زیادہ قابل قبول اور جاذبِ توجہ ہے۔

(باقی)

بنی اسرائیل کی تاریخ حیات

اور صیہونی تحریک

سید جمال حسن صاحب شیرازی بی۔اے

دنیا میں قومیں بگڑتی ہیں اور سنورتی بھی، کبھی محکوم ہوتی ہیں اور کبھی حاکم۔ کبھی خود کسی دوسرے ملک کے زیر اقتدار رہتی ہیں اور کبھی دوسری حکومتوں کو اپنا حلقہ بگوش بنالیتی ہیں۔ کبھی ترقی و فلاح اور تہذیب و تمدن کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ جاتی ہیں اور دوسری قوموں پر اپنی برتری اور عظمت کا سکہ بٹھا دیتی ہیں اور کبھی انحطاط اور تنزل کی ایسی پست گہرائیوں میں گر جاتی ہیں کہ دنیا انھیں دیکھکر عبرت اور موعظت حاصل کرتی ہے۔ غرضکہ نظام قدرت میں جس طرح ایک انسان اپنی زندگی میں راحت و رنج، دکھ سکھ، تکلیف و آرام ترقی و تنزل تمام چیزوں سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم کو بھی مجموعی حیثیت سے زندگی کی دشوار گذار گھاٹیوں اور سرسبز و شاداب وادیوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ عروج و زوال کا اصول ہر جگہ اور ہر دور میں کارفرما نظر آئیگا۔ لیکن بنی اسرائیل ہی ایک ایسا گروہ ہے جس کی قومی زندگی کا بیشتر حصہ مصائب و آلام اور درد و کرب میں گذرا ہے۔

بنو اسرائیل سب سے پہلے بابل سے مصر گئے۔ لیکن جب مصر میں بھی فرعون نے ظلم کرنا شروع کیا تو وہاں سے بھی ہجرت کر کے جزیرہ نمائے سینا پہنچے اور ایک عرصہ دراز تک عرب کے ریگستانوں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے رہے، پھر سنہ ۱۲ ق۔م۔ میں شام اور فلسطین میں آباد ہو گئے اور اپنی

حکومت قائم کی۔ لیکن پہلی صدی عیسوی میں دوبارہ پراگندگی اور انتشار پیدا ہوا جو ابتک جاری ہے۔
اس قوم کی مسلسل زبوں حالی اور پراگندگی کے دنیاوی اسباب کچھ بھی بتائے جائیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ خدائے عزوجل کا عتاب اس قوم پر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس فرد یا قوم پر خدائے واحد کا عتاب نازل ہوا سکا ٹھکانا دین و دنیا میں سوائے ذلت اور عذاب جہنم کے اور کہاں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اللہ تعٰ بنی اسرائیل پر یوں عتاب فرماتا ہے "وضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ وباؤ بغضب من اللہ۔" (اور ڈالی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور پھرے وہ اللہ کا غصہ لیکر (سورہ بقرہ آیتہ ۵۸) یعنی بنی اسرائیل پر خواری اور نامرادی کی مار پڑی۔ اور خدا کی پھٹکار کے سزاوار ہوئے۔ اور یہ اسلئے ہوا کہ یہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے۔ اور نبیوں کو ناحق قتل کر دینے میں بیباک تھے۔ اور گمراہی اور شقاوت کی یہ روح ان میں اسلئے پیدا ہو گئی تھی کہ اطاعت کی جگہ سرکشی چھائی ہوئی تھی۔ اور حق وہدایت کی حدیں توڑ کر بے لگام ہو گئے تھے [۵]۔

اس آیۂ قرآنی کے علاوہ چند ایسی احادیث بھی ہیں جن میں بنی اسرائیل پر خدا کے غیظ و غضب کا ذکر ہے اور صرف اسلام کی ہی نظر میں بنی اسرائیل اس عتاب الٰہی کے مستحق نہیں سمجھے جاتے بلکہ عیسائیت میں بھی اس قسم کی متعدد روایتیں پائی جاتی ہیں۔ ان روایتوں میں سے ایک مشہور روایت یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے کیلئے لیجایا جا رہا تھا تو ایک یہودی نے جسکا نام کارٹافیلس تھا (Cartaphilus) اور جو پائیلیٹ (Pilate) کا دربان تھا حضرت عیسیٰؑ کی گردن پر ایک طمانچہ مارا اور کہا! "جا اے یسوع جا! جلدی جا ٹھٹھک ٹھٹھک کر کیوں چلتا ہے۔" اس پر حضرت عیسیٰؑ نے جواب دیا "میں تو جا رہا ہوں لیکن تو اس دنیا میں اس وقت تک مارا مارا پھرتا رہیگا جبتک کہ میں واپس نہیں آؤں۔ بہت سے عیسائیوں کا خیال ہے کہ یہ بددعا صرف اس یہودی کے حق میں نہیں تھی بلکہ ساری

[۵] ترجمان القرآن صفحہ ۱۹

قوم یہود کیلئے تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ قوم اسوقت سے آجتک پراگندہ اور پریشان حال ہے۔[1]

بنی اسرائیل کے انتشار کا آغاز | پہلی صدی عیسوی میں روم سے شہنشاہیت کا ایک سیلاب اٹھا اور بڑی تیزی کے ساتھ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا گیا۔ اس سیلاب کا ایک رخ شام اور فلسطین کی طرف بھی ہوا۔ اور رومی بھیڑیوں کا ایک خونخوار غول بنی اسرائیل پر ایسی درندگی اور خون آشامی کے ساتھ ٹوٹا کہ تمام اسرائیلی گلہ منتشر ہو گیا۔ بیشمار یہودی قتل کردیئے گئے۔ ان کے گھر بار لوٹ لئے گئے ان خانماں بربادوں کی ایک بہت بڑی تعداد فلسطین و شام سے مختلف سمتوں کو چلی گئی۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی گئے انھیں اطمینان اور چین نصیب نہیں ہوا۔ مسیحی اقوام نے تعصب اور دشمنی کا پورا جوش دکھایا اور ہر جگہ ان کو تباہ و برباد کیا۔

ظہور اسلام اور اسرائیلی گلہ | اس کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں آفتاب اسلام طلوع ہوا اور عرب و عجم، شام و فلسطین، افریقہ اور اسپین میں جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو اسرائیلی گلہ کو رومی بھیڑیوں کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت سے نجات ملی اور چند صدیوں کے بعد ایک بار پھر وہ امن و سکون کی فضا میں سانس لینے لگا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام نے یہودیوں اور نصرانیوں کے ساتھ جو انصاف اور مذہبی رواداری برتی اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس دور میں یہودیوں کو مکمل مذہبی ازادی حاصل تھی۔ جہانتک شہری اور معاشرتی حقوق کا تعلق تھا وہ مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ غرض ان کی تہذیب، ان کا تمدن، اور ان کا مذہب ہر طرح سے محفوظ تھا۔ چنانچہ بہت سے یہودی مصنفوں نے اپنی تصانیف میں اس امر کا خاص تذکرہ کیا ہے کہ اگر ساتویں صدی میں اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو یہودی مذہب، یہودی تہذیب اور یہودی کلچر دنیا سے یکقلم مٹ گیا ہوتا۔

مغضوبیت کا دوسرا دور | پھر چند صدیوں بعد مسلمانوں کے انحطاط کا دور آیا تو یہودیوں پر ایک بار پھر

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹینکا جلد نمبر ۱۳

ظلم اور تشدد کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ دور قوم یہود کی تاریخ حیات کا تاریک ترین دور ہے۔ مشہور ہے کہ قرونِ وسطیٰ (Dark Ages) میں ساری دنیا کے یہودیوں پر جو مظالم کئے گئے اس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں ملتی۔ عیسائیوں نے سارے یورپ میں یہودیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں کی تعداد میں یہودی تہ تیغ کر دیئے گئے۔ ان کی عورتیں اور بچے زندہ آگ میں جلائے گئے۔ ان کے تمام علمی اور مذہبی ادارے بند کر دیئے گئے۔ ایک بہت بڑی تعداد کو جور و ستم اور جبر و تشدد کے ذریعے عیسائی بنا لیا گیا۔ غرض اس دور میں یورپ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں کی زمین یہودیوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو۔ قرونِ وسطیٰ کا یورپین لٹریچر ان مظالم کے واقعات و حادثات سے بھرا ہوا ہے۔ ملکہ الیزبتھ (Elizabethan age) کے دور کا ایک مشہور مصنف مارلو (Marlow) اپنی معرکتہ الآراء تصنیف باراباس (Barabas.) میں عیسائیوں کی یہود دشمنی کا ایک بھیانک نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں کو سوسائٹی میں "پلیگ" سے بھی زیادہ خطرناک اور نفرت انگیز سمجھا جاتا۔ اور روزانہ زندگی میں انھیں ایک کتے سے بھی زیادہ ذلیل و خوار خیال کیا جاتا تھا۔ خود مارلو کے الفاظ میں "یہودی ایک ایسا عفریت صفت انسان تھا جو دائرہ انسانیت سے خارج شمار کیا جاتا تھا"

شکسپیر نے بھی اپنے ڈرامہ مرچنٹ آف وینس (Merchant of Venice) میں اس دور کے یہودیوں کی مظلومیت اور مغضوبیت کی تصویر کھینچی ہے۔ اس ڈرامہ کا کردار شائلاک (Shylock) (ایک یہودی سوداگر) عیسائیوں کے ظلم اور نفرت سے عاجز آ کر انتقام پر آمادہ ہوتا ہے اور انٹونیو (Antonio) (ایک عیسائی سوداگر) سے انتقام لینے کے سلسلے میں یوں بول اٹھتا ہے "اس نے مجھے ذلیل کیا ہے میرے نقصان پر شادیانے بجائے ہیں۔ میری قوم کا مذاق اڑایا ہے۔ میرے دوستوں کو میرا مخالف بنایا۔ اور میرے دشمنوں کو میرے خلاف ابھارا ہے اور یہ سب کیوں ہو رہا ہے

صرف اسلئے کہ میں ایک یہودی ہوں . . . کیا ایک یہودی کے آنکھیں نہیں ہوتیں، کان نہیں ہوتے، اسکے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے، احساس نہیں ہوتا، جذبات نہیں ہوتے . . . کیوں! ایک یہودی بھی وہی غذا کھاتا ہے جو ایک عیسائی، وہ بھی انھیں ہتھیاروں سے مجروح ہوسکتا ہے جس سے ایک عیسائی، اور اس کے زخم کا علاج بھی اسی دوا سے کیا جاتا ہے جس سے ایک عیسائی کا، وہ بھی اسی موسم سرما اور گرما میں سانس لیتا ہے جس میں ایک عیسائی . . . پھر اگر تم ہمیں سوئی چبھوتے ہو تو کیا ہمارے جسم سے خون نہیں نکلتا۔ اگر تم ہمیں گدگداتے ہو تو کیا ہمیں ہنسی نہیں آتی، اور اگر تم ہمیں زہر کھلا دیتے ہو تو کیا ہم ہلاک نہیں ہوجاتے۔ پھر اگر تم ہم پر ظلم کروگے تو کیا ہم اس کا انتقام نہ لیں۔" یہ شائلاک کی آواز نہیں ہے بلکہ قرونِ وسطیٰ کے تمام یہودیوں کے دکھے دل کی پکار ہے اور انسانیت کے سامنے ایک اپیل ہے۔

دورِ مادیت کا اثر یہودیت پر | اس کے بعد یورپ میں نئی تہذیب کا آفتاب طلوع ہوا۔ سائنس کی نت نئی ایجادات نے فکر و نظر مذہب اور روح کی دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا۔ اوہام پرستی اور مذہبی تنگ نظری کا دور تو ختم ہوا۔ لیکن خدا پرستی اور روحانیت سے بُعد پیدا ہوگیا۔ خیالات و افکار میں وسعت اور تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور یوروپی دنیا کے ہر گوشہ سے مادی ترقی کی صدا بلند ہونے لگی۔ مادیت (Materialism.) کا یہ سیلاب ایسا ہمہ گیر اور انقلاب انگیز تھا کہ پہلے زمانے کے تمام افکار و نظریات پر چھا گیا۔ اب اگر یوروپی اقوام کو لگن تھی تو صرف ایک بات کی اور وہ یہ کہ مادی ترقی میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں۔ مادیت پرستی نے سرمایہ پرستی کا بیج بویا اور سرمایہ پرستی نے ایک ملک کا دوسرے ملک پر اقتصادی اقتدار جمایا۔ غرضکہ اس اقتصادی اقتدار (Economic Contrl) کو حاصل کرنے کیلئے مختلف ممالک میں باہمی رسہ کشی شروع ہوگئی۔ اور اس رسہ کشی کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کیلئے ہر ملک میں جذبہ قومیت (Nationalism.) پیدا ہوا۔ اور حکومت نے

اس جذبہ کو زیادہ سے زیادہ ابھارا۔ جذبۂ قومیت کی اس طوفانی تحریک کا اثر جس طرح تمام یوروپی اقوام پر پڑا اسی طرح یہودیوں پر بھی اس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ اور ان کا یہ جذبہ جو اب تقریباً مردہ ہو چکا تھا، دوبارہ زندہ ہو گیا۔ لیکن یہ وہ دور تھا جب یوروپ کے یہودی اپنے سیاسی اور شہری حقوق کیلئے سخت جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جب تک یہودی اپنی مذہبی، قومی اور نسلی خصوصیت و امتیاز سے دستبردار نہیں ہوں گے اسوقت تک یہ عیسائیوں کے جور و ستم کے شکار بنے رہیں گے۔ اس لئے انھوں نے اس تحریک قومیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ یوروپی اقوام میں گھل مل جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لباس اور دیگر معاشرتی خصوصیات میں تبدیلیاں کیں۔ مذہبی معاملات میں بھی موقع اور مصلحت کے لحاظ سے الٹ پھیر کرنے لگے۔ اور یہودیت کے مخصوص اور محدود پہلوؤں کو پس پشت ڈالکر اس کے ہمہ گیر پہلوؤں کو روشنی میں لانیکی زیادہ کوشش کی۔ یہانتک کہ آداب عبادت میں بھی چند تبدیلیاں کر بیٹھے۔ اور بعض مقدس کتابوں سے صیہون اور یروشلم وغیرہ کے نام تک خارج کر دیئے گئے۔ عبرانی زبان کو ترک کر دیا گیا۔ اور یوروپ کی مختلف زبانوں میں یہودیوں کے مذہبی لٹریچر کا ذخیرہ منتقل ہو گیا۔[۵]

اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو قوم یہود ہمیشہ کیلئے امن و سکون کی زندگی بسر کرتی۔ لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی اور ہوتی بھی کس طرح جب کہ اس کا مقصد آیت قرآنی سے ٹکراتا تھا۔ کیا قرآن عزیز کی تکذیب کبھی ممکن ہے؟

ہوا کا رُخ پلٹ گیا جدید تصورات و نظریات کے اس طوفانی دور میں یہودیوں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے دوبارہ اپنی قوم کے نسلی اور مذہبی جذبات و احساسات کو ابھارنا شروع کیا۔ اس نے پہلی تحریک کا یکقلم رخ پھیر دیا۔ اس تحریک کے ذریعے فلسطین اور یروشلم سے یہودیوں کی قدیم

---

[۵] دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اتھکس اینڈ ریلیجنس جلد ۱۲۔

محبت اور روحانی وابستگی کو زندہ کیا جانے لگا۔ ۱۸۶۲ء میں موزز ہس (Moses Hess) نے ایک کتاب "روم اینڈ یروشلم" (Rom and Jerusalem) کے نام سے لکھی اور جرمنی میں شائع کرائی۔ اس کتاب میں دنیا کے سامنے یہودی قوم کو ایک واحد قوم کی حیثیت سے پیش کرنے کے بعد اس امر پر زور دیا گیا تھا کہ انھیں فلسطین میں واپس آنے اور ایک یہودی اسٹیٹ قائم کرنے کی اجازت دیدی جائے۔ لیکن اس تحریک میں عام یہودیوں سے قطع نظر خود جرمنی کے یہودیوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اور لیتے بھی کس طرح۔ جب کہ وہ جانتے تھے کہ صرف قدیم روحانی وابستگی کی بنا پر یروشلم اور فلسطین میں ایک یہودی اسٹیٹ قائم کرنے کا مطالبہ بالکل لغو اور بے معنی تھا۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہندوستان کی ڈراویڈین قوم آج پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل آئے اور انگریزوں سے یہ مطالبہ کرے کہ چونکہ یہ ہمارا پرانا دیش ہے اور ہمارے باپ داداؤں نے اس پر حکومت کی ہے اسلئے ہم یہاں دوبارہ اپنی حکومت قائم کریں گے۔ تم لوگ بدیشی ہو یہاں سے نکل جاؤ۔ یا انگلینڈ کے اصلی باشندے آج اینگلو سیکشن نسل (Anglo Saxonrace.) سے اسی بنا پر انگلینڈ کی حکومت سے دست بردار ہوجانے کا مطالبہ کریں۔ بہرحال اگرچہ اس وقت یہودیوں نے اس تحریک پر لبیک نہیں کہا لیکن درحقیقت صیہونی تحریک کی ابتدا یہی تھی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس تحریک کے حقیقی باعث یوروپ کے عیسائی ہی تھے جنھوں نے یہودیوں کو سیاسی اور معاشرتی حقوق سے محروم کرکے اور ان پر پے درپے مظالم ڈھاکر ان میں کنارہ کشی اختیار کرنے اور ایک علیحدہ اسٹیٹ قائم کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔

اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں لیو پنسکر (Leo Pinsker) نے سارے دنیا کے یہودیوں کو منظم اور متحد کرنے کی تحریک شروع کی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک کتاب بھی لکھی اور اس امر پر زور دیا کہ بنی اسرائیل کے گلہ میں چونکہ اتحاد اور تنظیم نہیں ہے اور وہ دنیا کے مختلف حصوں میں پراگندگی اور

انتشار کی زندگی بسر کر رہے ہیں اسی لئے ذلیل وخوار ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ کسی ایک ملک میں جمع ہو جائیں اور منظم اور متحد ہو کر اپنی فلاح وبہبود کے لئے کوئی راہ عمل تلاش کریں۔ اس تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں فلسطین میں واپس آنے اور اسٹیٹ قائم کرنے کی قید نہیں تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ دنیا کے کسی گوشے میں ایک قومی تنظیم کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ اس تحریک کا عام طور پر یہودیوں نے خیر مقدم کیا اور اس کے عملی پہلوؤں سے بھی دلچسپی لینے لگے۔ لیکن آگے چل کر یہ تحریک بھی ناقابل عمل ثابت ہوئی اور ایک عرصہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

جدید صیہونی تحریک کا احیاء ۱۸۹۶ء میں وائنا کے ایک یہودی تھیوڈ ہرزل نے دوبارہ اس تحریک میں روح پھونکی۔ دراصل صیہونی تحریک کی موجودہ شکل اسی شخص کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس نے جوڈن اشاٹ (Judenstaat) کے نام سے ایک کتاب لکھی اور یہ تحریک کی کہ دنیا کے تمام یہودیوں کو بے رحم ممالک سے نکل کر ایک مرکز پر جمع ہونا چاہیئے اور ایک دولت مشترکہ (Common wealth) قائم کرنے کی اسکیم مرتب کرنی چاہیئے۔ تھیوڈ ہرزل ایک اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے بہت جلد اپنی قوم کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ بالآخر ساری دنیا کے یہودیوں نے ملکر ۲۹ اگست ۱۸۹۷ء میں بیسل (Besel) کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی۔ اور اسی کانفرنس میں صیہونی انجمن کی بنیاد ڈالی گئی۔ صیہون اس پہاڑ کا نام ہے جس پر بیت المقدس واقع ہے۔ صیہونی تحریک کے اغراض ومقاصد مرتب کئے گئے اور ایک مفصل پروگرام تیار کیا گیا۔ اس کا مقصد قوم یہود کیلئے فلسطین میں ایک تسلیم شدہ اور قانونی نقطۂ نگاہ سے مکمل اسٹیٹ قائم کرنا قرار پایا۔ کانفرنس نے حسب ذیل قرارداد پاس کی۔

(۱) ایک یہودی اسٹیٹ قائم کرنے کی غرض سے تمام دنیا کے زراعت پیشہ، تجارت پیشہ، اور صنعت پیشہ یہودیوں کو فلسطین میں لاکر بسانا۔

(۲) تمام دنیا کے یہودیوں کو منظم کرنا اور اس مقصد کے لئے مقامی اور مرکزی جماعتوں کی تشکیل کرنا۔

(۳) یہودیوں کے جذبۂ قومیت کو بیدار کرنا اور ان میں خود شعوری پیدا کرنا۔

(۴) اس تجویز کو دنیا کی اہم حکومتوں کے سامنے پیش کرنا اور ان کی منظوری حاصل کرنا۔[۱]

اس تجویز کی منظوری حاصل کرنے کیلئے سب سے پہلے تھیوڈ ہرزل نے سلطان عبدالحمید سے ۱۹۰۱ء میں کئی بار ملاقات کی لیکن سلطان نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد تھیوڈر نے دوسری حکومتوں کی طرف بھی رجوع کیا لیکن ہر جگہ اسے مایوسی ہوئی۔ بالآخر ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے اینگلو مصری حکومت سے درخواست کی کہ جزیرہ نمائے سینا (Sinai Peninsula) کا علاقہ یہودیوں کی نوآبادی کیلئے حکومت کی طرف سے انھیں دیدیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے اسے منظور کرلیا۔ لیکن چونکہ یہ علاقہ زرخیز نہیں تھا اس لئے اس میں آبادی نہیں بسائی جا سکی۔ اس کے بعد مسٹر جوزف چیمبرلین نے مشرقی افریقہ کے انتدابی علاقہ میں غوث غنیشو (Gaus Gnishu) کا خطہ یہودی نوآبادی کیلئے پیش کیا۔ صیہونی انجمن نے ایک کمیشن مقرر کیا کہ اس خطہ کا دورہ کرکے اس کی ایک رپورٹ تیار کی جائے۔ بالآخر کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے پر یہ پیشکش بھی مسترد کردی گئی اس کے بعد یہودیوں نے اس تحریک سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور ایک دوسری انجمن کی بنیاد ڈالی اس انجمن کا مقصد دنیا کے مختلف گوشوں میں یہودیوں کے لئے چھوٹے چھوٹے علاقے خرید کر خود مختار اسٹیٹ قائم کرنا قرار پایا۔ انجمن نے حصول مقصد کیلئے سارنیکا (Cyrenica) کینیڈا، اسٹریلیا اور مسوپوٹامیا (Mesopotamia) وغیرہ کا دورہ کیا لیکن کوئی مناسب اور موزوں علاقہ دستیاب نہ ہوسکا۔

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اتھکس اینڈ ریلیجنس جلد ۱۲۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ آج یہودی فلسطین میں اسٹیٹ قائم کرنے کی جدوجہد میں اس ملک سے اپنی مذہبی وابستگی اور روحانی لگاؤ پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں حالانکہ اوپر کی سطور سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اگر دنیا کے کسی دوسرے علاقہ میں کوئی زرخیز خطہ انھیں ملجاتا تو وہ یروشلم اور فلسطین کے دعوی سے دستبردار ہوجاتے۔ ۱۹۰۵ء میں تھیوڈ ہرزل مرگیا اور پھر یہ تحریک ایک عرصہ کیلئے خاموش ہوگئی۔

گذشتہ جنگِ عظیم اور صیہونی تحریک

۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ اس نے صیہونی تحریک کیلئے ایک نیا باب واکردیا۔ فلسطین کی جغرافیائی پوزیشن بحر روم اور نہر سوئز سے قربت۔ اور عراق کے تیل کے ذخیرے، ان تمام چیزوں نے فلسطین کو برطانیہ کے لئے بہت زیادہ اہم بنادیا تھا۔ برطانیہ کی انتہائی تمنا تھی کہ فلسطین پر قبضہ کرکے اس پر اپنا اقتدار جمائے۔ لیکن فلسطین کے عربوں کو ابھارکر ترکی کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا بھی مقصود تھا۔ اسلئے فلسطین کے عربوں سے آزادی کا وعدہ کرکے انھیں ترکوں کے خلاف لاکھڑا کیا۔ ادھر امریکہ کے سرمایہ دار یہودیوں کو بھی مالی امداد کے لئے آمادہ کرنا ضروری تھا۔ اسلئے یہودیوں سے بھی فلسطین میں ایک نیشنل اسٹیٹ کے قیام کا وعدہ کیا گیا اس سے امریکہ کے سرمایہ دار یہودیوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور انھوں نے اتحادی کازمیں کئی سو کروڑ ڈالر دیئے۔ کہاجاتا ہے کہ جنگِ عظیم میں برطانیہ کی کامیابی یہودیوں کی مالی امداد کی ایک بڑی حد تک مرہون منت ہے۔

اعلان بیلفور کا افسانوی پہلو

اس اعلان کے متعلق ایک نہایت عجیب وغریب روایت مشہور ہے ۱۹۱۶ء میں جنگ عظیم پوری ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ جاری تھی اور برطانیہ کے لئے نہایت نازک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ اسی دوران میں اسی ٹون (acetone) (ایک قسم کا تیزاب) جو پھٹنے والے بموں کی اجزا ترکیبی کا ایک اہم جزو تھا اس کی پیداوار بہت

کم ہوگئی۔ اس کی کمی برطانیہ کے لئے نہایت پریشان کن ثابت ہورہی تھی۔ اسوقت مانچسٹر یونیورسٹی میں ڈاکٹر ویزمین (Weizman) ایک مشہور ماہر کیمیا پروفیسر تھے۔ ڈیوڈ لائڈ جارج نے جو اسوقت وزیر اعظم تھے ڈاکٹر ویزمین کو بلایا اور صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر موصوف نے محکمہ تجربہ کے دارالتجربہ میں بیٹھکر بڑی کاوشوں کے بعد اسی ٹون کا مصنوعی قائم مقام ایجاد کرلیا۔ اسی ٹون کا یہ قائم مقام پھل اور اشیائے خوردنی وغیرہ کے رس سے تیار ہوا تھا۔ لائڈ جارج کو جب اس عظیم الشان کامیابی کی اطلاع ملی تو وہ اچھل پڑا کیونکہ اب برطانیہ کو پھٹنے والے بموں کی کمی کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لائڈ جارج نے ڈاکٹر ویزمین کو بلایا اور کہا "ڈاکٹر ویزمین تم نے اس آڑے وقت میں حکومت برطانیہ کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے صلہ میں میں ملک معظم سے سفارش کرونگا کہ تم کو حکومت کی طرف سے کوئی بڑا اعزاز عطا کیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر موصوف نے اعزاز اور مالی انعام دونوں کے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس نے لائڈ جارج سے کہا "میں ملک معظم سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ فلسطین میں میری قوم کے لئے ایک قومی اسٹیٹ قائم کردی جائے۔"

۱۹۱۷ء میں لارڈ النبائی (Lard Allemby) نے ترکوں کو شکست دیکر اس پر قبضہ کرلیا اور ملک معظم کی حکومت نے بیلفور کا تاریخی اعلان شائع کردیا۔ اس اعلان میں یہودیوں کے لئے فلسطین میں ایک قومی اسٹیٹ کے مطالبہ کو تسلیم کرلیا گیا۔ صیہونی تحریک کی یہ شاندار کامیابی تھی۔

اس کے بعد یہودی فلسطین میں آنا شروع ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں ۸۳۷۹۰ یہودی فلسطین میں پہنچ چکے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انکی تعداد ۱۵۸۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ عربوں نے حکومت برطانیہ کو دوران جنگ کے وعدے یاد دلائے لیکن کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملا۔ بالآخر فلسطین کے عربوں نے

مفتئ اعظم فلسطین کی سرکردگی میں ایجی ٹیشن شروع کردیا۔ برطانیہ نے جب اس تحریک کو فوجی طاقت سے دبانا چاہا تو عربوں نے بھی تشدد شروع کردیا اور ایک سخت خونریز خانہ جنگی شروع ہوگئی بالآخر ۱۹۳۶ء کے اپریل میں برطانیہ نے ۳۰ ہزار فوج فلسطین بھیجدی۔ لیکن خانہ جنگی جاری رہی بالآخر ۱۹۳۷ء میں حکومت برطانیہ نے پیل رپورٹ شائع کی جس کے مطابق فلسطین کو عربی، یہودی اور برطانوی علاقوں میں تقسیم کردیا گیا تھا لیکن عربوں نے اس کو ماننے سے انکار کردیا۔ اس دوران میں ہولناک خانہ جنگی ہوتی رہی۔ ہزاروں عرب اور یہودی تباہ وبرباد ہوگئے۔ بعض اوقات ان کی لاشوں سے فلسطین کی سڑکیں پٹ جاتی تھیں۔ بالآخر ۱۹۳۸ء کے آغاز میں ایک گول میز کانفرنس بلائی گئی اور اس کے ختم ہونے پر قرطاس ابیض (White paper.) شائع ہوا۔ لیکن عربوں کے مفاد اس میں بھی محفوظ نہیں تھے۔ یہ بدامنی اور خونریزی جاری تھی کہ دنیا کی دوسری ہولناک جنگ شروع ہوگئی اور فلسطین کا معاملہ معرض التوا میں پڑگیا۔ امید ہے کہ اس جنگ کے بعد برطانوی تدبر اپنے ناخن تدبیر سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریگا اور اسکا اطمینان بخش حل تلاش کرلیگا۔

اکثریت و اقلیت کا مسئلہ

از جناب حافظ محمد یوسف صاحب انصاری گنگوہی

فی زماننا اکثریت و اقلیت کا مسئلہ اس قدر معرکۃ الآرا اور عام ہے کہ کوئی محفل اور کوئی اخبار اس بحث سے خالی نہیں ۔ عوام تو بجائے خود، خواص بھی اس وقتی سیلاب میں بہتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ہر شخص اور ہر جماعت قومی نکبت کا واحد سبب اقلیت میں ہونے کو سمجھ رہا ہے ۔ اور ہر جائز ناجائز سعی اقلیت سے نکلنے پر مصروف عمل ہے حالانکہ ضرورت اس کی تھی کہ پوری قوم پستیِ اخلاق سے نکلنے کی کوشش کرتی جو قومی نکبت کا حقیقی سبب ہے ۔ قومی بد مذاقی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ جو امور بداخلاقی کا انتہائی پہلو لیے ہوئے ہیں اُن پر فخر و مباہات کیا جاتا ہے اور دوسروں کے ہر بُرے فعل کی تقلید یہی کہہ کر کیجاتی ہے کہ وہ بھی تو ایسا کرتے ہیں ۔ یہ نہیں سوچتے کہ یہ کورانہ تقلید عین پستیِ اخلاق ہے جو لاریب سببِ نکبت ہے ۔ اسلئے آئیے اس صحبت میں اکثریت و اقلیت کے مسئلہ پر "کتٰبٌ ینطقُ بالحق" کی روشنی میں نظر ڈالیں، اور دیکھیں کہ اس کے متعلق وہ شمع ہدایت کیا فرماتی ہے ۔

سورۂ مدثر میں ولید ابن مغیرہ کا قول فقال اِنْ ھٰذَا اِلَّا سحرٌ یُوثَر اِنْ ھٰذَا اِلَّا قول البشر (قرآن تو بس جادو ہے کہ جادوگروں ہی سے نقل کیا جاتا ہے یہ تو کسی بشر کا کہا ہوا ہے) نقل فرما کر ارشاد ہوتا ہے سَاُصلیہ سَقَر وَمَا ادرٰکَ مَا سَقَر لَا تُبقی ولَا تَذَر لوّاحۃٌ للبشر علیھا تسعۃَ عشَر ۔ وما جعلنا اصحٰبَ النّار اِلَّا ملٰئکۃً (میں عنقریب اُس کو دوزخ میں ڈالونگا ۔ تو کیا سمجھا کہ دوزخ ہے کیا نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے جھلس دینے والی تن بدن کو ۔ اُس پر اُنیس فرشتے تعینات ہیں اور ہم نے جو دوزخ کے

موکل مقرر کیے ہیں وہ فرشتے ہی ہیں) بعض یہود کے دریافت کرنے پر کہ دوزخ پر کتنے فرشتے ہیں؟ تعداد
بتلائی گئی کہ اُنیس ہیں۔ اس پر ابوالاسد قریشی نے جماعت قریش سے خطاب کرکے کہا۔ گھبرانے کی
بات نہیں اُنیس ۱۹ ہی تو ہیں۔ ہم تو ہزاروں ہیں۔ ذرا دیر میں ہم اُن کو ختم کردینگے۔ اس قلت و کثرت کے
سوال اور کثرت پر تفاخر اور بھروسہ کے خیال کو باطل کرنے کے لیے ارشاد ہوا۔ وما جعلنا عدتهم
الا فتنۃً (اور ہم نے اُن کا شمار اور تعداد جانچ اور آزمائش ہی کے لیے رکھا ہے) حضرت مولانا رومی
علیہ الرحمہ 'فیہ مافیہ' میں اس آیت کو نقل کرکے حسب ذیل توضیح فرماتے ہیں۔

این شمار خلق فتنہ است کہ گویند این یکے
و ایشاں صد یعنی ولی را یک گویند و
خلقان بسیار را صد و ہزار گویند این فتنۂ
عظیم است۔ این نظر و اندیشہ کہ ایشاں
را بسیار بیند و او را یک فتنۂ عظیم است
وما جعلنا عدتهم الا فتنۃً۔ کدام
صد کدام پنجاہ و کدام شصت قومی بے دست
و پا و بے ہوش و بے جان چوں طلسم و
سیماب می جنبند۔ اکنوں ایشاں را
شصت یا صد یا ہزار گوئی و ایں را
یکے۔ ملک ایشاں ہیچند۔ و این ہزار و
صد ہزار و ہزاراں ہزار قلیل اذا عدوا
کثیرا اذا شدوا۔

مخلوق کی یہ شمار کہ یہ ایک اور وہ سو۔ خود فتنہ ہے۔ یہ جو کہتے ہیں
کہ عامۂ خلائق ہزاروں لاکھوں ہے اور ولی ایک ہے یہ فتنۂ
عظیم ہے۔ یہ نظر اور یہ تخیلہ کہ عامۂ خلائق کو بہت سمجھنا اور
ولی کو ایک یہ فتنۂ عظیم ہے۔ وما جعلنا عدتهم الا
فتنۃ (اور ہم نے ان کا شمار اور تعداد جانچ ہی کے لیے رکھا
ہے) ایک بے جان بے دست و پا، بیہوش مخلوق کو
پچاس، ساٹھ، سو یا ہزار شمار کرنا کونسی دانشمندی ہے
اُن کی حرکت طلسمی اشیاء اور پارہ کی حرکت کے مشابہ
ہے۔ ایسی بے جان مخلوق تو ایک شمار ہونے کے بھی
قابل نہیں۔ چہ جائیکہ سو یا سو ہزار۔ بلکہ اولیاء اللہ جو
فی الحقیقت زندہ مخلوق ہیں اور ایک نظر آتے ہیں وہ ایک بھی
ہزاروں لاکھوں کی برابر ہیں۔ قلیل اذا عدوا کثیرا اذا شدوا
(گنتی میں کم لڑائی میں بہت)

جس قوم کے اخلاق خراب ہوں، جس میں ایثار نہ ہو جس کے افراد اپنے ذاتی ترفع اور رفاہ پر ساری قوم اور قوم کے مفاد کو ہر وقت قربان کرنے کے لیے طیار رہوں۔ وہ قوم شمار میں کتنی ہی زیادہ ہو، کتنی ہی بڑھ جائے۔ بالکل بے جان مخلوق ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ تعداد میں بڑھ کر کوئی کارنمایاں انجام دے یا محکومی اور غلامی کی زنجیریں توڑ سکے یا دوسروں پر فائق اور حکمراں ہو سکے۔ ایسی بداخلاق قوم کے لیے جو پستیٔ اخلاق کی وجہ سے مردوں کی صف میں آچکی ہو۔ ضُرِبَتْ علیهمُ الذِّلَّةُ ابدی ذلت، دائمی نکبت مقدر ہو چکی ہے۔ اس قانون میں تبدیلی ناممکن ہے۔

قرآن شریف میں ایک دوسرے موقعہ پر کثرتِ تعداد پر تفاخر سے روکا گیا ہے۔ کثرت پر گھمنڈ اور غرور اور اس کو ذریعۂ تفوق و غلبہ سمجھنے کو نہ صرف منع کیا گیا بلکہ اسکی سزا کا بھی ذکر ہے۔

دسویں پارہ میں ارشاد ہے۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فی مَواطِنَ كَثِيرَةٍ ويوم حُنَيْنٍ اذ اعجبتكم كثرتكم فلم تغن عنكم شيئًا وضاقت عليكم الارض بما رحبت ثم وليتم مُدْبِرِين ” (اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے بہت میدانوں میں۔ اور حنین کے دن جب تمہیں مغرور کر دیا تھا تمہاری کثرت نے۔ تو وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ اور تم پر تنگ ہو گئی زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر تم ہٹ گئے پیٹھ دیکر)۔ ایک جنگ بدر کا نقشہ ہے کہ مسلمان انتہائی قلت اور بے سروسامانی میں ہیں۔ بس اللہ کی رضا میں جان دینے کے سوا نہ کوئی امید ہے اور نہ سہارا۔ کفار تعداد میں کئی گونہ ہیں۔ جنگی سامان سے لیس اور مکمل۔ مگر باہمہ قلت تعداد و بے سروسامانی مسلمان فتحیاب ہوتے ہیں۔ اس کے بعد حنین کا معرکہ ہوتا ہے۔ تو صورت بالکل برعکس ہے مسلمان ۱۲ ہزار۔ اسباب و سامان جنگ کی بھی کمی نہ تھی۔ اور کفار کل ۴ ہزار۔ مسلمانوں کو اپنی کثرتِ تعداد پر ناز ہے۔ اور دلوں میں یہ خیال ہے کہ جب قلت تعداد اور بے سروسامانی میں ان کو کامل شکست دے چکے ہیں اب تو دشمنانِ دین کو مار بھگانا بچوں کا کھیل ہے۔ یہاں اس کثرت پر گھمنڈ اور تعداد پر نازاں ہونیکے خیال کو باطل کرنے کیلئے

مسلمانوں کو ایسی شکست سے دوچار کرایا گیا جسکا تصور بھی ناممکن تھا۔ پیٹھ دیکر ایسے بھاگے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گنتی کے چند صحابہ رہ گئے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ جب کثرت کا غرور ٹوٹ گیا اور اقلِ قلیل جماعت رہ گئی تو پھر فتح و نصرت نے خیر مقدم کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ طاقت وسطوت اور غلبہ کا راز تو وحدت میں مضمر ہے۔ چہ جائیکہ کثرت میں۔ وحدت دو قسم کی ہوتی ہے۔ حقیقی اور معنوی یا اعتباری۔ حقیقی وحدت تو صرف ایک ہی ذات میں ہے۔ اسی کو حقیقی قوت وسطوت اور غلبہ حاصل ہے۔ وہ ہی مستحق ہے لیکن معنوی یا اعتباری وحدت دنیا میں ہی پائی جاتی ہے۔ اور یہ ثانی الذکر وحدت جس جماعت یا قوم میں ہوگی۔ وہ ہی جماعت اور قوم ہر اعتبار سے دنیا پر فائق اور حکمراں ہوگی۔ خواہ دوسروں کے مقابلہ میں باعتبار شمار اور تعداد کتنی ہی کم ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ تعداد تو فتنہ اور ابتلا ہے۔ جو قوم بھی عدد کے اعتبار سے تفوق کی متلاشی ہوگی۔ کثرت تعداد پر نازاں ہوگی۔ سمجھ لیجئے کہ اُس قوم کے ایام تفوق ختم ہو گئے اور آثار زوال نمایاں ہو گئے۔ کثرت تو زوال کی یقینی علامت ہے۔ حقیقتاً ترقی اور عروج کا راز تو تمام قوم کی قوتِ ارادی ایک مرکز پر جمع ہونے میں مضمر ہے۔ اس طرح کہ تمام قوم کی قوت ارادی میں وحدت ہو جائے۔ اس کی مثال آتشی شیشہ سے دیجا سکتی ہے جبتک انعکاس منتشر رہتا ہے اسکا اثر نہیں ہوتا۔ اور جب انعکاس ایک چھوٹے مرکز پر جمع ہو جائے تو آگ لگا دیتا ہے۔ اسی طرح پوری قوم کی قوت ارادی اگر ایک مرکز پر جمع ہو جائے تو اسکے مقابلے میں بڑی سے بڑی تعداد۔ بڑی سے بڑی مشکلات ہیچ ہو جاتی ہیں۔ کوئی بام ترقی ایسا نہیں جس پر وہ فائز نہ ہو جائے۔ قوت ارادی ایک مرکز پر جب ہی جمع ہو سکتی ہے جبکہ تمام قوم کی سیرت اور اخلاق اعلیٰ ہوں۔ قوم کے ہر فرد میں ایثار ہو۔ اور اجتماعی مقصد کیلئے۔ ذاتی مفاد۔ ذاتی رجحانات کو قربان کرنیکی خوگر ہو۔ یہ سچ ہے کہ ذاتی ترفع اور ذاتی جذبات سے کوئی فرد بھی یکسو نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ ساری قوم۔ لیکن عام قومی اور ملکی مفاد کیلئے۔ ذاتی جذبات قربان کرنے کی ہر اس قوم میں صدہا مثالیں ملینگی۔

جس نے حال یا قرونِ ماضیہ میں ترقی کی ہے۔

جوزیف مزینی نجات دہندہ اٹلی۔ جو مصلحین اور انقلاب آور رہبروں کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی تقریر میں کہتا ہے "مناسب موقعوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ مناسب موقعہ پیدا کرنے چاہئیں۔ یہ جنگ صرف آسٹریا کے خلاف نہیں ہے بلکہ اہل روما کی جہالت۔ ان کے باہمی اختلافات اور مضرہ خرابیوں کے خلاف ہے۔ مظالم پر بیٹھکر آنسو بہانا بیکار ہے۔ غلامانہ عادتیں۔ حب مال اور حب جاہ کو چھوڑو حصول مقصد کیلئے قوم میں بہتر اخلاق ہونا شرط ہے۔ فتحمندی اور کامرانی کیلئے مسلسل قربانیاں لازم ہیں"

ہٹلر کی کتاب مین کیف، دنیا کی مقبول ترین کتاب ہے۔ بائبل کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت کتاب ہے اسکے حصہ دوم باب دوم میں اسی مضمون کو حسب ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے "یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہئے۔ کہ اگر کسی قوم میں سے چند ایسے باہمت اور باکمال اشخاص چن لئے جائیں جن کا نصب العین ایک ہی ہو۔ اور ان کو عام جمود یا بے عملی سے الگ رکھا جائے تو یہ چند مٹھی بھر اشخاص ترقی کر کے سب پر حکومت کرینگے۔ دنیا کی تاریخ ہمیشہ اقلیتوں نے بنائی ہے بشرطیکہ ان کی قوت ارادی ان کی پشت پر ہو۔ لہذا اقلیت جو بہت سوں کے نزدیک ایک کمی نقص یا رکاوٹ ہے۔ وہ فی الحقیقت کامیابی کی ضروری شرط ہے" اس موقعہ پر ہٹلر ایک عجیب نکتہ بھی لکھ گیا ہے اکثر کم ہمت اشخاص نصب العین کی راہ میں دشواریوں سے ڈر کر نہ خود اس کے حصول کیلئے جدو جہد کرتے ہیں نہ دوسروں کو شامل ہونیکی رائے دیتے ہیں۔ اس کے متعلق لکھتا ہے "ہمارے کام کی عظمت اور اسکی مشکلات ہی سے یہ گمان غالب پیدا ہوتا ہے کہ صرف بہترین لڑنیوالے ہی ہماری جدو جہد میں شریک ہونگے۔ اور ہر کامیابی کا راز بہتر انتخاب ہی میں پوشیدہ ہے"

مسٹر سیل جنھوں نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں حضرت محمدؐ

صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی شخصیتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں
حضرت عیسیٰ کے حواریین گیلیلی کے مچھیرے تھے۔ ان میں کوئی الوالعزم شخصیت نہ تھی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جملہ ایسی الوالعزم شخصیتیں تھیں کہ جہاں بھی ہوتے دنیا پر بھاری اور فائق ہوتے۔ یہ حضورؐ کی جاذبیت تھی کہ ان کو تابع کر لیا۔ اسی لئے اس مٹھی بھر جماعت نے اپنے کارناموں سے تھوڑی ہی مدت میں دنیا کو حیران کر دیا۔"

مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ وحدت ارادی ہی کا کرشمہ تھا۔ تاریخ عالم ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ وحدت ارادی یا قبائلی عصبیت کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی جماعت نے بڑی سے بڑی تعداد والی قوموں کو جن میں نہ وحدت ارادی تھی اور نہ قبائلی عصبیت پامال اور محکوم بنا لیا۔ ۴۸۰ء قبل مسیح علیہ السلام۔ خسرو پرویز نے بیس لاکھ فوج سے یونان پر حملہ کیا۔ یونان اُسوقت چھوٹی چھوٹی نوابیوں میں تقسیم تھا۔ ہر نواب شاہ کہلاتا تھا۔ علاقہ اسپارٹا میں درہ تھرمالی پر مقابلہ ہوا۔ لیونیڈاس شاہ اسپارٹا کے پاس کل سات سو آزار لڑنے والے تھے۔ تنگ درہ پر دو یوم اس نے دشمن کے دریا ذخار کو روکا۔ ایک غدار نے عقبی راستہ خسرو کو بتلا دیا۔ تمام مدافعین ایک جگہ قتل ہو گئے۔ لیکن ملک بیدار ہو گیا۔ قبائلی عصبیت کی وجہ سے ہر یونانی اپنی انفرادی شخصیت کو بھول گیا۔ اور وحدت ارادی کے ساتھ سارا ملک دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ خسرو کو واپس ہونا پڑا اور بعد میں کل مملکت ایران یونان کی محکوم ہو گئی۔ پلاسی میں کلایو کے ساتھ کل تین ہزار فوج تھی۔ سراج الدولہ کے ساتھ پچاس ہزار پورے جنگی سامان سے مکمل فوج تھی۔ مگر وحدتِ ارادی نہ تھی۔ میر جعفر کی غداری کی وجہ سے پچاس ہزار کو ۳ ہزار سے شکست ہوئی اور پھر اسی سارے بر اعظم پر ایک جزیرہ کے مٹھی بھر انگریز آج تک حکمراں ہیں۔ مسٹر آرم سٹرانگ مصنف "گرے ولف" سوانح نگار مصطفٰے کمال لکھتے ہیں "سلیمان شاہ کی وفات سے تین سو برس کے اندر اسکے دسویں جانشین سلطان سلیمان اعظم مقنن نے انصاف اور قوت کے ساتھ ایک ایسی عظیم الشان سلطنت

پر حکمرانی کی۔ جس کی حدود سواحل ایڈریاٹک پر البانیہ سے ایران کی سرحد تک اور مصر سے قفقاز تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہنگری اور کریمیا اس کے باجگذار تھے۔ دول یورپ اپنے جھگڑوں میں استمداد کیلئے تحفہ تحائف لئے اس کے دربار میں کھڑے رہتے تھے۔ اس کے عساکر قاہرہ مشرقی ممالک کے ناکوں پر متعین تھے۔ بحر روم میں اس کا بحری بیڑہ کوس لمن الملک بجاتا تھا۔ شمالی افریقہ اس کے شہنشاہی علم کے نیچے تھے۔ قسطنطنیہ پر اسکا قبضہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے بعد تباہی اور ابتری کا دور تھا ۔ ۔ ۔ اس کے بعد کم و بیش ۲۷ سلطان ہوئے اور ہر ایک اپنے پیشرو سے زیادہ نالائق تھا ۔ ۔ ۔ ۔ صحیح رہنمائی ختم ہو جانیکی وجہ سے ترکوں میں ذلیل ترین خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ ان کی قوت برداشت اور قوت عمل۔ یعنی انکا فولادی جوہر فنا ہو گیا۔ نسل بھی خراب ہو گئی اخلاق بھی گر گئے"۔

اس تاریخی عبارت کو پڑھکر غور فرمایئے کہ کثرت ہی کے بعد عزم، ارادہ، ہمت اور وحدت ارادی ختم ہوئی۔ اخلاق ہی کی پستی نے یکے بعد دیگرے ممالک، سلطنت عثمانیہ کے حلقہ اثر سے خارج کئے۔ اس راز کو مصطفےٰ کمال سمجھا اور اس نے پہلا کام یہ ہی کیا کہ ان تمام عناصر کو جو وحدتِ ارادی میں حارج تھے الگ کیا۔ کثرت کے خیال کو چھوڑ کر خود قلت اختیار کی۔ مگر وحدتِ ارادی کو حاصل کیا جسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج پھر دول عظمیٰ ٹرکی سے استمداد کی اتنی ہی متمنی ہیں جسقدر کہ سلیمان اعظم کے زمانے میں تھی۔

دوسری مثال جرمنی کی ملاحظہ فرمایئے۔ جنگ عظیم سے بیشتر جرمنی کا کل رقبہ معہ مقبوضات ۴۳ لاکھ مربع کیلومیٹر تھا۔ اور آبادی ۷ کروڑ ۲۷ لاکھ۔ مگر وحدتِ ارادی نہ تھی بالخصوص یہودی اور کچھ دیگر عناصر ایسے تھے جو وحدتِ ارادی میں حارج تھے۔ فرانس سے ایسی شکست کھائی کہ اعضا بریدہ اور بے دست و پا ہو کر رہ گئی۔ تمام مقبوضات نکل گئے پانچ لاکھ مربع کیلومیٹر رقبہ اور ۶ کروڑ آبادی رہ گئی۔ ذرائع ترقی ختم اور مسدود ہو گئے۔ ہٹلر نے پہلا کام یہ ہی کیا کہ ان عناصر کو خارج کیا جو وحدت ارادی میں حارج تھے۔ قوم میں یکجہتی پیدا کی۔ آج وہ ہی بے دست و پا جرمنی مقابلۃً قلت میں آجانیکے بعد جو کچھ

کر رہی ہے دنیا کے سامنے ہے۔ اسکا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اپنی مردم شماری یا تعداد بڑھانیکی سعی نہ کیجائے یہ تو ہر مسلم کا اول فریضہ ہے۔ اسلام کا حقیقی مشن ہے۔ لیکن یہ سعی بذریعہ تبلیغ ہونی چاہیئے مگر تبلیغ کا اثر بھی جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ ہر مبلغ کا کیرکٹر خود اعلیٰ ہو۔ بہترین اخلاق ہوں۔ اعلیٰ اخلاق میں ایسی جاذبیت ہے کہ وہ بلا زبان سے کہے مخلوق کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جذب کرتے ہیں۔ چنانچہ پادری ٹائی ٹس نے لکھا ہے کہ ۱۸۳۲ئ کے قریب اسلامی تبلیغ اسقدر پُر اثر تھی کہ دس لاکھ آدمی سالانہ مسلمان ہوتے تھے۔ یہ تبلیغ حقوق حاصل کرنے کیلئے نہ تھی بلکہ سچا مسلمان بنانے کیلئے تھی۔

اقلیتوں کی کامیابی کی جو مثالیں دی گئی ہیں ان کی نسبت یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ وہ جنگ میں کامیابی کے متعلق ہیں درآنحالیکہ اس زمانہ میں اور بالخصوص اس ملک میں حکومت میں حصہ ملنے کا انحصار اس امر پہ ہے کہ انتخابی جماعتوں میں نمایندگی کافی تعداد میں ہو جو اقلیت کو کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کی تردید میں رُوس کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اس ملک میں تمام انقلابات کمیونسٹ پارٹی نے کئے اور اپنی مسلسل جدوجہد سے سوشلسٹ حکومت قائم کی۔ کمیونسٹ یا "اشتمالی" وہ تھوڑے لوگ ہیں جنھوں نے جدوجہد کر کے ملک میں جدید نظام قائم کیا۔ اور سوشلسٹ یا "اشتراکی" وہ کثیر تعداد باشندگان ہیں جنھوں نے اُس نظام کو اختیار کر لیا۔ اور اس کے تحت میں ہر قسم کے کاروبار اور ملازمتوں اور پیشوں میں مصروف ہیں۔ کمیونسٹ افراد کے پیش نظر ہر وقت انسانی بھلائی اور بہبودی ہوتی ہے اور حصولِ مقصد کیلئے وہ ہر قسم کی تکالیف اٹھاتے ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ادنیٰ مزدور سے لیکر وزرا تک ہیں۔ مگر پارٹی کی ممبری انھیں تمام بڑے عہدوں اور وزارتوں سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس کارخانہ میں تین یا تین سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہوں وہ فوراً اپنی مجلس شوریٰ قائم کر دیتے ہیں اور اس بات کی نگرانی رکھتے ہیں کہ کارخانہ میں کوئی بیعنوانی، بے ایمانی، کام چوری نہ ہونے پائے۔ اور کوئی شخص اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ بیجا

طریقے پر حکومت نہ کرے ان چیزوں کی نگرانی وہ اپنے ذاتی فرائض میں سمجھتے ہیں۔ اس فرض کے ادا کرنے میں انھیں اسقدر انہماک ہوتا ہے کہ اگر کوئی کمیونسٹ تنہا کہیں سفر کر رہا ہو اور وہاں کوئی بے عنوانی دیکھے تو پھر وہ اپنا سفر ملتوی کر کے اور ہر قسم کا نقصان اٹھا کر مظلوم کی امداد کرنے پر کمر بستہ ہو جائے گا۔ اگر کسی حاکم کی بے عنوانی دیکھے تو باوجود خود مزدور ہونے کے اس حاکم کی شکایت کریگا۔ اور بلا لحاظ نتائج کے پوری جدوجہد کرے گا۔

کمیونسٹ پارٹی کے ممبران کی تعداد ۱۹۳۵ء تک دو فیصدی سے زیادہ نہ تھی مگر وہ اپنی ایمانداری ایثار اور صداقت کی وجہ سے تمام ملک پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ صداقت اور سچائی کے مقابلے میں عہدوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اسی لئے تمام ملک کی حکومت ملک کی پالیسی اسی دو فیصدی جماعت کے ہاتھوں میں ہے وہاں بھی کارخانوں اور زراعتی فارموں اور تجارتی کوٹھیوں سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ کابینوں تک انتخابات کا سلسلہ جاری ہے مگر باوجود حد درجہ کی اقلیت میں ہونیکے کمیونسٹوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور انھیں سچا اور اچھا سمجھکر ہر مجلس میں سر آنکھوں پر جگہ دیجاتی ہے۔

اسوقت ہندوستان میں جماعتی کشاکش نے ملک کی فضا کو بالکل مکدر کر دیا ہے۔ بالخصوص فرقہ وارانہ انتخاب نے ناواجب اور ناجائز طریقہ پر اپنے ہم مذہبوں کو فائدہ پہنچانے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے اور ان کے ساتھ ناانصافی کرنے کو ایک نیک کام بنا دیا ہے۔ یہانتک کہ جو لوگ انصاف کی کرسیوں پر بیٹھتے ہیں وہ بھی اس پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ہم مذہبوں کی طرفداری کی۔ یہ فضا صرف اسوقت بدلی جا سکتی ہے جبکہ مسلمان اپنے اسلاف کے طریقے اختیار کر کے اپنے نفس اور اپنی اولاد کے مفاد پر انصاف کو مقدم رکھیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تمام اخلاق کا منبع عدل کو قرار دیا ہے۔ تمام اخلاق میں اسی کو افضلیت کا درجہ دیتے ہیں۔ اور ہمارے اسلاف کا یہی طرۂ امتیاز تھا اگر ہم "عدل" کو مضبوط ہاتھوں سے نہیں بلکہ دانتوں سے پکڑ لیں تو پھر نہ اکثریت کا خوف باقی رہے اور

مخلوط انتخاب کا۔ ۱۸۳۲ء میں راجہ رام موہن رائے نے جبکہ وہ انگلستان میں تھے پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں وکالت پیشہ لوگ بالعموم ایماندار نہیں ہیں۔ البتہ مسلمان وکیل بالعموم سچ بولتے ہیں اور ایماندار ہیں۔

ساٹھ ستر سال سے زیادہ نہ گذرے ہوں گے کہ ضلع سہارنپور کے قصبہ انبٹھ میں کسی چبوترہ پر ہندو مسلمانوں کا جھگڑا تھا۔ ہندو کہتے تھے کہ وہ انکا مٹھ تھا مسلمان کہتے تھے کہ نماز پڑھنے کا چبوترہ تھا۔ ہندؤں نے اس قصبہ کے ایک عالم کو جن کا نام مولانا سالار بخش تھا۔ کلکٹر صاحب کے ہاں طلب کیا۔ مولوی صاحب نے عدالت میں جانے سے اس بنا پر انکار کیا کہ وہ انگریز کی صورت نہیں دیکھتے۔ کلکٹر نے کہلا کر بھیجا کہ آپ شہادت سے گریز کر کے گنہگار ہوں گے۔ بالآخر طے ہوا کہ مولوی صاحب آنکھوں پر پٹی باندھ کر اجلاس میں جائیں گے۔ چنانچہ آپ گئے اور کلکٹر سے پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا " پوچھ کافر کیا پوچھتے ہے " کلکٹر صاحب نے پوچھا " یہ چبوترہ مسلمانوں کی مسجد تھا یا ہندؤں کا مٹھ " مولوی صاحب نے جواب دیا " مسلمان جھوٹے ہیں یہ تو ہندؤں کا مٹھ تھا " اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سچے مسلمان ہوں تو کیا ہندو انھیں اپنا نمایندہ بنانے میں تامل کریں گے۔ اور اگر ہندو تامل بھی کریں تو کیا ادنیٰ درجہ کے مادی منافع کیلئے مسلمان کیلئے جائز ہے کہ وہ ایمان فروشی کرکے اور جائز و ناجائز طریقوں سے اپنوں کو نفع اور دوسروں کو نقصان پہنچائے۔ اگر ایسا کریگا تو ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات اپنی اولاد اور اپنے احباب کو کچھ فائدہ پہنچائے۔ مگر اسلام کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اسلام کا نفع تو صرف اس میں ہے کہ انصاف کیلئے اپنی جان و مال کو فنا کر کے اسلام کا ایک عمدہ نمونہ بنے تاکہ دوسروں کو سچا مسلمان بننے کی ترغیب ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دوسرے مذہب والوں کی ناواجب طرفداریوں اور بے ایمانیوں کو دیکھکر کوئی شخص کس طرح اپنے مذہب کو بدل سکتا ہے۔ بہرحال قومی ترقی کا راز بہتر اخلاق اور بہتر انتخاب میں مضمر ہے۔ چنانچہ رہنما کا انتخاب سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ

رہنما اور قائد جس سیرت کا ہوگا وہی سیرت قوم میں پیدا ہوگی۔ گندم از گندم بروید جو زجو۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قائد کیلئے حسب ذیل شرائط تحریر فرماتے ہیں

"قائد ایسا منتخب کیا جائے جو عبادات اور تقرب الی اللہ کے اعتبار سے عامۃ الناس سے افضل ہو۔ دلیر صاحب الرائے فقیہ اور فعال ہو۔ تن آسان نہ ہو۔ صاحب مروت ہو۔ کبائر مجتنب ہو صغائر پر مصر نہ ہو۔ سیاسیات میں مہارۃ رکھتا ہو۔"

استدراک

از مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

محترم جناب حافظ محمد یوسف صاحب انصاری ایک نہایت مخلص، ایثار پیشہ، اور اسلام کا درد رکھنے والے بزرگ ہیں، بلقان کی جنگ میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے وفد کے رکن کی حیثیت سے ترکی جہاد میں اہم خدمات انجام دیچکے ہیں، تحریک خلافت میں کامیاب سرکاری ملازمت ترک کرکے معاشی زندگی کے سلسلہ میں بہت بڑی قربانی پیش کرچکے ہیں اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ جدید و قدیم علوم میں سنجیدہ معلومات کے حامل ہیں آپ کا یہ مضمون بہت سے نقاط کے اعتبار سے قابل قدر اور لائق توجہ ہے۔ لیکن اس میں چند باتیں ایسی ہیں جن سے ادارۂ برہان کو سنجیدگی کے ساتھ اختلاف ہے۔ بنابریں حافظ صاحب کے مضمون کے ساتھ یہ چند سطور سپرد قلم کی جاتی ہیں۔

حافظ صاحب کے مضمون میں جس مسئلہ پر قلم اٹھایا گیا ہے اسکو دو ایسے مسلّم الثبوت اور ناقابل انکار مقدمات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جن سے زیر بحث مسئلہ پر روشنی پڑنے کے ساتھ ساتھ غلط فہمی پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ حافظ صاحب کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی اور عقلی نقطہ نظر سے کسی قوم کی سربلندی کیلئے صرف اخلاقی برتری اور اجتماعی وحدت کافی ہے اور یہ کہ اکثریت فی نفسہ کوئی اہم شے نہیں، بلکہ اکثر اوقات قوموں کی قوتِ فکر و عمل میں سدِ راہ اور باعث فتنہ بنجاتی ہے اور قلتِ تعداد باعث خطرہ یا موجب نکبت نہیں ہے بلکہ بیشتر حالات میں برتری اقوام کا سبب اور ذریعہ

نبتی رہتی ہے حافظ صاحب نے اپنے نظریوں کے استشہاد میں قرآن عزیز کی آیات اور تاریخی وقائع کو پیش فرماکر انکو زیادہ محکم اور مضبوط بنانے کی سعی فرمائی ہے۔

ہم حافظ صاحب کے ان مقدمات کو بغیر کسی بحث و نظر کے تسلیم کرتے ہیں کہ کسی قوم کی برتری اور اسکے تفوق و اقتدار کیلئے اور کوئی نیا نظریہ کارفرما ہو تو ہو لیکن مسلمانوں کے مذہبی نشوونما اور سیاسی اقتدار کی برتری اسوقت تک ناممکن ہے جبتک ان میں اخلاقی سربلندی اور عملاً اجتماعی وحدت بروئے کار نہ آئے اور عوام کی زندگی میں اسکے پیدا ہونے کیلئے ضروری ہے کہ یہ دونوں وصف انکے ارباب حل و عقد کا مستقل شعار بنجائیں۔

وَاَطِیعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (انفال) — اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ایسا کروگے تو تمہاری طاقت سست پڑجائیگی اور ہوا اکھڑ جائیگی۔

اِنِّی بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ — میں اسلئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کریمانہ کی تکمیل کروں۔

مگر اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ بدقسمتی سے اگر مسلمان کسی ملک میں حکومت و اقتدار اعلیٰ سے محروم ہوں اور وہ ملک مختلف اقوام و مذاہب کا گہوارہ ہو اور ملکی دستور و آئین بھی یورپین جمہوریت کے طرز کا ہو یا اپنے وطن اور ملک کی آزادی کے بعد اسی قسم کے دستور و آئین سے انکا سابقہ پڑجائے تو انکا اقلیت و اکثریت کو بحث میں لانا اور اقتدار اعلیٰ میں اپنے حق اقتدار کو سربلند دیکھنے کیلئے اس قسم کے سوالات اٹھانا اسوجہ سے ناجائز قرار پائے کہ ہم میں وحدت اجتماعی نہیں پائی جاتی یا اسلامی نقطۂ نظر سے ہمارے اخلاق میں بجد پستی آچکی ہے اپنی اکثریت پر گھمنڈ کرکے کوئی کام کرنا اور خدا کے فضل کو بھول جانا یا اپنی اقلیت سے گھبراکر احکام اسلام کے خلاف امور پر آمادہ ہوجانا اور اسطرح خدا تعالیٰ کو ناراض کرکے کامیابی کی راہیں تلاش کرنا یقیناً غلط اور گمراہی ہے۔

چنانچہ سورۂ مدثر میں کافروں کے اسی نظریہ کی تردید کی گئی ہے کہ جنگ میں ہر جگہ کثرت تعداد کو کامیابی کی کلید سمجھنا گمراہی ہے نیز اس نکتہ کی جانب اشارہ ہے کہ اگر ایک جانب خدا کی نافرمانی اور اسکے احکام کی خلاف ورزی میں کثرت تعداد غول اور بھیڑ کی شکل میں نظر آتی ہو اور دوسری جانب خدا کے فرمانبردار اور اہل حق بہت تھوڑے نظر آتے ہوں تو وہاں کثرت کو حق سمجھنا اور قلت کو بوجہ قلت تعداد کے ناحق سمجھنا بہت بڑی غلطی اور سخت گمراہی کا باعث ہے۔ مولانائے رومی رحمۃ اللہ نے بھی "فیہ مافیہ" میں اسی کی وضاحت فرمائی ہے۔ اسی طرح سورۂ انفال اور دوسری ان آیات میں جو جہاد کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے پیش نظر ہر وقت خدا و رسول کی اطاعت اور امر حق کی سربلندی رہنی چاہئے اور طریق کار میں اسکے فضل کو کبھی نہ بھولنا چاہئے نیز مخالف کی کثرت اور اپنی قلت کی صورت میں جبن و نامردی پاس نہ پھٹکنے پائے اور اپنی کثرت اور مخالف کی قلت کی حالت میں بیجا گھمنڈ سامنے نہ آجائے لیکن ان آیات کی یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ دنیوی اسباب و وسائل اور جائز وقتی اور برمحل ذرائع کو یکسر بھلا دینا چاہئے اور اقلیت و اکثریت کے مسئلہ کو ہیچ سمجھکر مطلق نظرانداز کردیا جائے

بلکہ ایسا کرنا اپنے کاز کو سخت نقصان پہنچانے اور اپنی اجتماعی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کے مرادف ہے چنانچہ آیت واعدوا لھم ما استطعتم مِن قُوَّۃٍ ومِن رِباطِ الخَیلِ (انفال) اور تم (دشمنوں کے مقابلہ میں) حسب استطاعت تیاری کرو طاقت اور (جہاد کی تیاری کیلئے) گھوڑوں کے باندھنے کے ذریعہ"

اسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اسباب ظاہری توکل، خود اعتمادی، اور وحدت اجتماعی یا اخلاقی برتری کیلئے ممد و معاون ہیں نہ کہ مخالف،

پس اگر کسی جگہ اکثریت و اقلیت کی بحث بھی ظاہری ساز و سامان کے اعتبار سے ضروری ہو تو اسکو کیوں زیر بحث نہ لایا جائے۔ بہر حال ان آیات کا اس مسئلہ سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے کہ اسباب ظاہری میں ہمکو ایک اکثریت کے مقابلہ میں اپنے اقتدار اور اپنی آزادی سے متعلق کچھ نہ سوچنا چاہیے۔

بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں "عدم تشدد" کا طریق کار اور مدنی زندگی میں "جہاد بالسیف" کا عملی نظام نیز آیت الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا ان یکن منکم صابرۃ یغلبوا مائتین" (انفال) "اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے تو اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہونگے تو دو سو پر غالب آجائیں گے"

میں ایک مسلمان کا دس کافروں کے مقابلہ میں پیٹھ نہ دکھانا منسوخ ہو کر دو گنے کافروں پر غالب رہنے کی دعوت دینا اس بات کی شہادت ہے کہ معرکۂ قتال میں بھی فی الجملہ اکثریت و اقلیت کا لحاظ ضروری سمجھا گیا ہے البتہ مسلمانوں کو یہ تلقین ضرور کی گئی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اسباب و وسائل کو صرف اسباب و وسائل سمجھیں اور کامیابی کا راز صرف خدا کے فضل و کرم سے وابستہ رکھیں اور صرف اسی پر بھروسہ کریں۔ پس آئین و دستور کی بحث میں مسلمانوں کا اقلیت و اکثریت کی بحث کو درمیان میں لانا ان اقوال و بیانات کے منافی نہیں ہے جو حافظ صاحب موصوف نے دنیا کی اولوالعزم شخصیتوں کے حوالہ سے نقل فرمائے ہیں اور جن میں بتایا گیا ہے کہ کامیابی کا راز اقلیت و اکثریت پر نہیں ہے بلکہ ہمت و بسالت، یکجہتی، ایثار و قربانی اور پارٹی کی یکرنگی پر ہے۔

• اسلام کی مقدس تعلیم اور صدیقی و فاروقی دور خلافت کی عملی زندگی میں وہ سب کچھ موجود ہے جس میں دنیا اور دین کی قران السعدین ترقی کا راز مضمر ہے۔ پس اگر ایک جانب وہاں وحدت اجتماعی اور اخلاقی برتری نظر آتی ہے تو دوسری جانب اسلامی حدود میں رہ کر ظاہری اسباب و وسائل ترقی کا استعمال بھی اجتماعی زندگی کا اہم جزء نظر آرہا ہے۔ پس کمیونسٹوں (اشتمالیوں) کی مثال اس موقعہ پر اسلئے بھی برمحل نہیں ہے کہ اقلیت کے باوجود انکی کامیابی کا معاملہ اسوقت بروئے کار آیا جبکہ جنگ عظیم میں زار روس کی حکومت کے خاتمہ کے اسباب مہیا ہو گئے اور انقلابی جماعت نے ملک کی اکثریت کو اپنے ساتھ لیکر جارحانہ انقلاب پیدا کر دیا یہ نہیں ہوا کہ ملک کے آئین و دستور میں ووٹوں کے ذریعہ اقلیت نے اکثریت کو ختم کر دیا۔ اور اکثریت والوں کیلئے فتنہ بنکر اقلیت کیلئے کامیابی کا باعث بن گئی۔ ۔ ختم مضمون پر حافظ صاحب نے مسلمانوں کو یہ تلقین فرمائی ہے کہ وہ دوسری اقوام کی تقلید میں بد اخلاقی کو طریق کار نہ بنائیں بلکہ "عدل" اور "ایمانداری" کو اپنا شعار بنائیں کہ یہی اسلامی تعلیم کا خصوصی امتیاز ہے۔ سو ہم اس ارشاد کی حرف بحرف تائید کرتے ہوئے صرف اسقدر اضافہ چاہتے ہیں کہ عدل و دیانت کو شعار بناتے ہوئے مسلمان کا یہ بھی اسلامی فرض ہے کہ جسطرح وہ "ظالم" نہ ہو اسی طرح دوسرے کے "ظلم" کا شکار بھی نہ بنے۔ فقط

تلخیص و ترجمہ

اسلام کے عالمگیر اثر و نفوذ کی راہیں

(مترجمہ مولوی محمد علیم اللہ صاحب شاہجہانپوری جامعی)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا ظہور ایک بے آب و گیاہ، بنجر اور غیر آباد سرزمین میں ہوا اس کے باشندے نہ صرف علم سے بے بہرہ تھے بلکہ ان پر جہل، ناشائستگی اور فقر و افلاس کی بھی حکومت تھی، ان کے پڑوسی ایرانی (جن کا تہذیب و تمدن اس وقت نمایاں حیثیت رکھتا تھا) اور رومی (جو جاہ و جلال کے ساتھ ساتھ ثروت میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے) انہیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ساتویں صدی کے آغاز میں اگر کسی شخص کی زبان سے یہ نکل جاتا کہ اس چٹیل جزیرہ سے ایک روح اٹھیگی جو روم و ایران کا تختہ اُلٹ دیگی تو لوگ یہی کہتے کہ اس شخص کو جنون یا ہذیان ہوگیا ہے، مگر ہوا یہی اور ایک صدی بھی جزیرۂ عرب میں اسلام کے ظہور پر گذرنے نہیں پائی تھی کہ اس جاہ و جلال کے عقاب نے اپنے بازوؤں کو پھیلانا شروع کردیا۔ اور آناً فاناً ایک بازو سندھ کی وادیوں اور بحر ہند تک اور دوسرا بازو بلاد مغربی، اسپین اور بحر اوقیانوس پر سایہ فگن نظر آنے لگا، یہ وہ زمانہ تھا جب چوپایوں سے نقل و حمل کا کام لیا جاتا تھا، اور سفر میں آج کل کی طرح گھنٹے اور دن کافی نہیں ہوتے تھے بلکہ مہینے اور سالہا سال لگ جاتے تھے

اسلامی اثر و نفوذ کی عالمگیری اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اسلامی اثر جس سرعت کے ساتھ پھیلا اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی، یہ چیز اس قابل ہے کہ ہم چند لمحے اس کی حقیقت اور

خصوصیات پر غور و خوض کرنے میں صرف کریں تاکہ اسے اچھی طرح سے سمجھ سکیں، غور کرتے وقت ہمارا یہ فرض ہونا چاہیے کہ ہر قسم کے مذہبی عقیدہ سے ہٹ کر محض علمی نقطۂ نظر سے اس کے عناصر کی تحلیل کریں اور ان کی خصوصیات معلوم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔

یہ عام اثر و نفوذ صرف مذہب اسلام یا عربی زبان کا نہ تھا بلکہ ایک جدید روح کا تھا جس نے دنیا کو ایسے وقت میں جھنجوڑا اور بیدار کیا جب اسے اس کی واقعی ضرورت تھی، اس روح کو سب سے پہلے اُن مسلمانوں نے لیا جنکی زبان عربی تھی پھر دوسرے مذہب اور دوسری زبانیں بولنےوالی قوموں نے اُسے لبیک کہا۔ جو چیز اس بے پناہ سرعت کے ساتھ پھیلی اور جس کا دامن اکناف عالم تک وسیع ہوگیا وہ صرف مذہب اسلام یا عربی زبان نہ تھی بلکہ وہ درحقیقت یہی جدید روح تھی جو جزیرۂ عرب سے اٹھی اور دنیا کے چپہ چپہ میں پہنچی اور اس کے راستہ میں پہاڑ، سمندر اور لق و دق میدان حائل نہ ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ اس روح کے انتشار نے عربی زبان اور مذہب اسلام کو بھی اپنے زمانہ میں پھیلایا مگر ان کی سُرعت اتنی غیر معمولی نہ تھی جتنی اسلامی اثر و نفوذ اور اس جدید روح کی تھی جو اسلام کا سرچشمۂ اولین تھی اور جس نے امکانی حد تک اس مختصر زمانہ میں اس کی تبلیغ کی تھی۔ بالفاظ دیگر اسلامی روح اور اُس کا اثر بے حد سرعت کے ساتھ پھیلا۔ اُسی کے پہلو بہ پہلو عربی زبان بھی پھیلی مگر آہستہ آہستہ، اس بنا پر ہمیں ایک طائرانہ نظر ان مختلف عناصر پر ڈالنا چاہیے جن سے اس حیرت انگیز واقعہ کی تخلیق ہوئی ہے۔ جسے اصطلاح میں اسلام کی نشر و تبلیغ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے جس چیز کی ہیبت اس ناقابل انکار واقعہ کے سلسلہ میں ہمارے اوپر طاری ہوتی ہے، وہ اس کی بے پناہ سرعت ہے، جس کے سامنے عقلیں دنگ ہیں اور نہ صرف دشوار بلکہ قریباً ناممکن ہے کہ ہم اس کی کوئی ایسی عقلی توجیہ کر سکیں جس سے ایک مفکر اور صاحب بصیرت

کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوں۔ انگریزی مورخ آرنلڈ جے۔ ٹوائنبی (Arnold, J. Toynbee)
نے اعتراف کیا ہے کہ "اناطولیہ میں اسلام کی اشاعت ترکوں کے ہاتھوں اور وہ انقلاب جس نے
چشمِ زدن میں بازنطینی سلطنت کو اسلامی ترکوں کی حکومت میں تبدیل کر دیا۔ ایک اہم واقعہ ہے
جس کی ایک مورخ کوئی اطمینان بخش عقلی تاویل نہیں کر سکتا ہے۔"

یہ اہم واقعہ جس نے پروفیسر آرنلڈ کو حیرت زدہ کر دیا اسی اہم واقعہ کی نشاۃ ثانیہ ہے جس میں
ہم نے اسلامی روح کو دیکھا تھا کہ وہ جزیرۂ عرب کے ایک گوشہ سے اُٹھی تھی اور تمام دنیا میں غیر معمولی
سرعت کے ساتھ پھیل گئی تھی، مزید براں عربوں کو ترکوں کی بہ نسبت اس روح کو پھیلانے میں دشواریاں
بھی کم پیش آئی تھیں۔

تاریخ کے اس اہم واقعہ کی یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں کی حکومت میں
ضعف آ گیا تھا اور دوسری طرف عربوں کی شجاعت اور دلیری مسلم تھی مگر ان طفل تسلیوں سے ایک
سمجھ دار انسان کی قلبی تسکین نہیں ہوتی!

دوسری وجہ اسلام کے پھیلنے کی یہ ہے کہ وہ ایک جبریہ مذہب کی حیثیت سے نہیں پھیلا
اور مسلمان کبھی اپنے دین کی اشاعت پوشیدہ طور سے کرنے پر کسی سلطان کے خوف و خطر سے مجبور
نہیں ہوے بلکہ اُس کی اشاعت علانیہ اور ڈنکے کی چوٹ ہوئی۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ اسلام
ہمیشہ فتح و نصرت اور جنگ کے سایہ میں پھیلا گو یہ صحیح ہے کہ بااوقات اسلام جرنیلوں، بادشاہوں اور
ممالک اسلامیہ کے امراء کا مذہب رہا ہے لیکن دوسری طرف ہم وسط ایشیا اور افریقہ کے بعض ان علاقوں
میں بھی اسلام پھیلا ہوا پاتے ہیں جہاں نہ کوئی جنگ پیش آئی اور نہ کوئی قابل ذکر اسلامی فتح ہوئی ہے، بلکہ
ایک دوسرا گوشہ ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ اسلام کے دورِ اول کے بعض جاہ پسند مسلمان امراء غیر مسلموں کے
مسلمان ہونے کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے کیونکہ اس کی وجہ سے وہ ان کے جزیہ سے محروم ہو جاتے تھے یہاں

یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام رضا و رغبت سے پھیلتا تھا اور دوسرے مذاہب کے دوش بدوش زندگی گذارتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے کبھی کسی ایسے شہر کو بسانے کا ارادہ تک نہیں کیا جس کے تمام باشندے مسلمان ہوں۔

اسلامی اثر کے عناصر اب ہم ان عناصر پر نظر ڈالتے ہیں جن سے اس عالمگیر اسلامی اثر کی ترکیب ہوئی ہے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان تمام عناصر پر علٰحدہ علٰحدہ تبصرہ اور ان کی خصوصیات کو نمایاں کریں، ان ذیل کے امور میں پہلے امتیاز کر لیا جائے۔

(۱) اسلامی فتوحات (وہ ممالک جو مسلمانوں نے فتح کیے اور وہاں زیادہ مدت یا تھوڑی مدت تک ان کی حکومت رہی)

(۲) اسلام کا خود بغیر کسی کی امداد کے پھیلنا۔

(۳) تہذیب کے ان مختلف عناصر کی اشاعت جنہیں اسلامی حکومت کے قیام نے سہارا دیا مثلاً عربی زبان، عربی رسم خط۔

(۴) ان علوم وفنون اور فلسفہ وحکمت کی اشاعت جو اسلامی اثر کے سایہ میں پروان چڑھے۔

یہ وہ مختلف عناصر ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں، ان میں کوئی باہمی مشابہت نہیں ہے، دوسرے وہ جغرافیائی حد جہاں ان عناصر میں سے کوئی عنصر پہنچا ہے وہ اس حد سے بالکل مختلف رہی ہے۔ جہاں دوسرے عنصر کی رسائی ہوئی ہے۔

ایشیا میں اسلام کی اشاعت ہم ان اقلیموں کا تفصیل سے ذکر کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اسلامی اثر قبول کیا، آسانی کی غرض سے ہر ایک کا تذکرہ علٰحدہ علیحدہ کیا جاتا ہے۔

ان میں سب سے مقدم ایشیا کی اقلیم ہے۔ اس اقلیم میں جزیرہ عرب کے مغربی حصہ سے جو دوسرے حصوں سے کوئی خاص امتیازی وصف نہیں رکھتا، اسلام پھیلنا شروع ہوا اور تمام جزیرہ میں پھیل گیا، جزیرہ عرب

کے خطہ پر ناہمواری اور خشک سالی کا گو غلبہ ہے لیکن آباد سر سبز اور قابل زراعت علاقے بھی ہیں۔ یمن اور حضر موت کی سطحہائے مرتفع، خلیج فارس کے بعض ساحل اور چند اور نخلستان جو اپنے ارد گرد کی اراضی کے مقابلہ میں عمدہ پیداوار رکھتے ہیں۔ اس شمار میں ہیں۔

عرب جب اپنے جزیرے سے دوسرے علاقوں میں پھیلے تو ان میں ناشائستہ اور حدی خواں بدو ہی نہ تھے بلکہ بدوی، شہری، گلہ بان، کاشتکار اور تاجر سب ہی قسم کے لوگ تھے۔

جزیرۂ عرب سے مسلمان سب سے پہلے شمال کی طرف پھیلے، کیونکہ جنوب کی طرف جانے میں سمندر اُن کے راستے میں حائل تھا، دوسری بات یہ بھی تھی کہ وہ شمالی ممالک (شام، عراق وغیرہ) سے ناآشنا نہیں تھے، کیونکہ ان میں اکثر ان کی آمد و رفت تجارت ہجرت یا جنگوں اور نو آبادیاں قائم کرنے کے سلسلہ میں رہتی تھی۔ اس کے علاوہ جزیرۂ عرب کے باشندوں کا شمالی ممالک میں پھیلنا کوئی نئی اور انوکھی بات بھی نہ تھی، جزیرۂ عرب کو یہ خصوصیت پہلے سے حاصل ہے کہ اُس نے بابل اور آشور کی تہذیبوں پر اپنا اثر ڈالا تھا اور اسی سے مختلف سامی زبانیں نکلی ہیں۔

ملک شام پر تو ان کا اثر عرصۂ دراز سے تھا بلکہ عہد قدیم میں تو ان کا اثر مصر تک پھیل چکا تھا چنانچہ مصری زبان میں سامی اثرات آغاز تاریخ سے اب تک نمایاں ہیں، غرض اگر تاریخ کا مطالعہ کریں تو عربوں کا شمال کی طرف رُخ کرنا کوئی نیا واقعہ نہ تھا، نئی بات یہ ضرور تھی کہ اس دفعہ یہ حرکت ایک جدید روح، جدید مذہب، جدید زبان اور ایک بالکل جدید اسپرٹ کی حرکت تھی، عرب ان جدید مقامات میں آباد تو ہو گئے لیکن اپنے وطن مالوف سے وابستہ رہے اور جدید سکونت گاہوں کی حیثیت محض عارضی قیام گاہوں کی سی رہی۔

چونکہ اسلام کا اصل وطن مغربی ایشیا میں تھا اس لیے ناگزیر تھا کہ وسعت مشرق کی طرف ہو اسی لیے جب اسلامی اثر کو دجلہ و فرات کی وادیوں میں استحکام حاصل ہو گیا تو ایران کی طرف بڑھنے لگا

اور چپہ چپہ پر چھاگیا۔ اس کے بعد اسلامی فتوحات دو راستوں سے ہوئیں۔ ایک جنوبی راستہ جس کا مطمحِ نظر ہندوستان تھا، دوسرا شمال مشرقی راستہ اس کے پیشِ نظر ملک چین تھا۔ یہ دونوں راستے صبر آزما اور دشوار گذار تھے، ان کے سامنے اونچے اونچے پہاڑ حائل تھے، جن سے گذرنا صرف دروں اور تنگ گھاٹیوں کے ذریعہ ہی ممکن تھا، مگر اسلامی اثر ان گھاٹیوں سے گذرنے اور سندھ کی وادیوں پر مسلط ہو جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد مغلوں اور دوسرے مسلمان بادشاہوں کو وہاں فتوحات ہوئیں جن سے اسے اور سہارا ملا اس کے قدم جمتے گئے، چنانچہ اس وقت ہندوستان میں قریباً ¼ حصہ مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اور وہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں حتیٰ کہ جنوبی حصہ میں بھی۔

ہندوستان میں مسلمان والیان ریاست اپنی مسلم وغیر مسلم رعایا پر حکمراں رہے ہیں اس کی سب سے بہتر مثال نظام حیدر آباد کی ہے، ان کی رعایا کی بڑی آبادی برہمنوں کی ہے اور ان کی ریاست اس شمالی ملک سے بہت دور ہے جہاں اسلامی اثر کا غلبہ تھا۔

چین میں اسلامی اثر کے پہنچنے کے مختلف راستے تھے، ان میں سب سے اہم سطح مرتفع تبت کے شمال میں دریائے تارِم کی وادی کا راستہ اور زنجاریا کی گذرگاہیں ہیں۔ اسلام بعض اوقات ہندوستان اور برما کے راستہ سے بھی دریائے یانگٹسی کے کناروں تک پہنچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی زبردست اقلیت سِتشُون اور یِنان کے صوبوں میں پائی جاتی ہے۔

مشرقِ قریب میں اسلامی اثر ایک مدت تک طرسوس کے پہاڑوں تک رہا، پھر جب ترکوں نے مغرب کی طرف توجہ کی اور کرد، ارمن اور کرج کے شہروں پر قبضہ کیا اور طرسوس کے پہاڑوں کو طے کر کے اناطولیہ پر بھی قابض ہوگئے تو وہاں تھوڑی ہی مدت میں زبردست اسلامی اثر پھیل گیا۔

روس میں مغلوں کی جماعتیں کبھی جنگجویانہ اور کبھی ترک وطن کے سلسلہ میں گئیں اور وہ کوہ الثائی سے رفتہ رفتہ نقل و حرکت کرتے رہے اور والگا کے بلند میدانوں اور جنوب مشرقی روس پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ اس طرح قوقاز کے شہروں میں شمالی اور جنوبی دونوں راستوں سے وہاں اسلامی اثر پہنچ گیا۔

ایک دوسرا راستہ ایشیا میں اسلام اور اس کے اثر پھیلنے کا اور بھی ہے اور وہ بحر ہند کا راستہ ہے۔ اس کے جنوب مغربی ساحل کے عرب باشندے نقل و حرکت کے بہت زیادہ خوگر ہیں اور انہی کی جدوجہد سے اسلامی اثر کا قوام ہندوستان میں طیار ہوا اور وہ عام طور سے جاوا، بلاد ملایا، اور جزائر شرق الہند میں پھیل گیا، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سلسلہ میں ان ملکوں کی ہندوستان سے وابستگی اور ہندوستانیوں کی کوششوں نے مدد کی ہے۔

افریقہ میں اسلامی اثر اب ہم افریقہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں اسلامی اثر و نفوذ کی وسعت چند دوروں میں منقسم ہے۔ پہلے دور میں وہ عربی عنصر داخل ہے جسے اسلامی فتوحات اور اس کے وسعت دینے میں صف اوّل کی حیثیت حاصل ہے اور اس کے بعد والے دوروں میں اس فرض کو خود افریقہ والوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔

افریقہ کے اندر اسلامی اثر چند راستوں سے پہنچا سب سے پہلا اور اہم راستہ خاکنائے سوئز کا ہے اس راستہ سے اسلامی اثر کی رفتار مسلسل اور دیرپا رہی، چنانچہ بہت تھوڑے عرصہ میں مصر، طرابلس، تونس، الجزائر اور مراکش میں پھیل گیا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ سمت مشرقی مغربی تھی۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد اس طویل خط پر بہت سے مرکز بھی قائم ہوگئے اور جنوب کی طرف اسلامی اثر پہنچ گیا۔ اس جدید کارنامے میں تمام افریقی قوموں نے اشتراک عمل کیا خواہ وہ مصری ہوں یا صحرا اور مغربی بلاد کے باشندے! ان کی وجہ سے اسلامی اثر صحراء کو عبور کرکے بحر احمر کے ساحلوں

سے جنوب کی طرف پھیلا اور وسط افریقہ تک پہنچ گیا اور کہیں بحر حبش کی ناقابل گذر بلندیوں اور استوائی گھنے جنگلات کے نہیں رُکا اور برابر جنوب میں وادیِ نیل سے ہو کر عام طور سے حبش اور سوڈان میں پھیلا اور اوگنڈا تک پھیلتا چلا گیا۔ صحرا کے مغرب میں اسلامی اثر بحر اٹلانٹک کے کنارے کنارے وادی نیاگرہ اور مغربی افریقہ کے ملکوں تک پہنچ گیا، اور یہ عجیب بات ہے کہ ان اجنبی خطوں میں اسلامی اثر یوروپی استعمار اور ان کی نظروں کے سامنے پھیلا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سینیگال میں لوگوں کو نماز پڑھتے، تلاوت کرتے اور دلائل الخیرات کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہ لوگ عربی کے معدودے چند الفاظ سے واقف تھے۔

اس سرزمین میں اسلامی اثر پھیلانے میں اُن بکثرت سفر کرنے والے قبیلوں نے بہت مدد پہنچائی چنانچہ فولا (غلبہ) وغیرہ خاندانوں سے بہت مدد ملی۔ ان کا اثر و رسوخ قدیم زمانہ سے مغربی افریقہ اور وادی نیاگرہ اور جھیل چاڈ کے اطراف میں تھا۔ اس لیے جب وہ مسلمان ہوئے تو ان وسیع علاقوں میں انہی کی وجہ سے اسلامی اثر وہاں پھیلا۔

ایک اور راستہ جہاں سے اسلامی اثر افریقہ پہنچا ہے وہ بحر ہند، خلیج عدن اور بحر احمر کا ہے، اسی راستہ سے جنوبی عرب کے باشندوں نے مشرقی افریقہ، اریٹریا، سومالی لینڈ، اور خط استوا سے چند درجہ جنوب تک ملک زنگ میں اسلامی اثر پہنچایا ہے۔ اس جنوبی ملک میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد بھی پڑی جو ایک عرصہ تک شان و شوکت سے حکومت کرتی رہی۔ بالآخر پرتگالیوں نے نئے ممالک کی تلاش کے زمانہ میں اس سلطنت کو ختم کر دیا۔ یہاں کی زبان "سائدہ" ہے جسے ساحلی باشندے بولتے ہیں ایک بڑی تعداد عربی الفاظ کی شامل ہے۔ اب وہاں اسلامی اثر کا رہا سہا اقتدار سلطان زنجبار جیسے مسلمان والیان ملک کے دم سے باقی ہے۔

یورپ میں اسلامی اثر یورپ میں اسلامی اثر خاص طور سے تین راستوں سے پہنچا، سب سے پہلے جبل طارق

کے راستہ سے جزیرہ نمائے آئبیریا اور جنوبی فرانس میں پہنچا اور وہاں آہستہ آہستہ قدم جماتا رہا، حتیٰ کہ زمانۂ وسطیٰ میں اسلامی تہذیب و معاشرت کا یورپ میں طوطی بولنے لگا، اسپینی اور پرتگالی زبانیں بھی عربی زبان سے بہت زیادہ متاثر ہوئیں اور ان میں ایک بڑی تعداد عربی الفاظ اور اصطلاحات کی داخل ہوگئی

یورپ میں اسلامی اثر کے پہنچنے کا دوسرا راستہ آبنائے باسفورس، بحر مرمرہ اور دردانیال کا ہے۔ اسی راستہ سے عثمانیوں اور ان کے ہم آہنگ اناطولیہ کے باشندوں نے جزیرہ نمائے بلقان، وادیٔ دریائے ڈینوب اور یورپی ساحلوں پر اسلامی اثر پھیلایا، اور وہاں اس وقت بھی ایک بھاری تعداد مسلم آبادی کی ہے اگرچہ ان کا بڑا حصہ عثمانی اقتدار سے نکل چکا ہے۔

یورپ میں اسلامی اثر کے پہنچنے کا تیسرا راستہ مغربی سائبیریا کا ہے۔ اس ملک میں نہ کوئی اونچا پہاڑ تھا جو یورپ اور ایشیا کو جدا کرتا ہو اور نہ کوئی اتنی طاقتور سلطنت تھی جو ترکوں اور مغلوں کو روک سکے، اس لیے ترکوں اور مغلوں نے بڑی آسانی سے دریائے والگا کی وادی، بحر قزوین کے ساحلوں اور بحر اسود کے شمالی ساحل پر اپنے ڈیرے ڈال دیے۔ اس طرح سے تھوڑی ہی مدت میں اسلامی اثر بحرِ روم کے جزائر قبرص، روڈس اور کریٹ وغیرہ جیسے بڑے جزیروں اور جزیرہ سسلی و مالٹا میں پھیل گیا اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وہ ترکوں، مغاربیا اور کسی قوم کی وجہ سے پھیلا ہے۔

اس بحث و نظر کے آئینہ میں ہم آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ اسلامی اثر جن خطوں میں پہنچا ہے اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور وہ قدیم دنیا کے بڑے حصہ کو شامل ہیں، اور جن قوموں تک پہنچا ہے اُن میں دنیا کی تمام قومیں داخل ہیں۔

عالم عربی اور عربی زبان کی ترویج

عالم عربی کے بارے میں ابھی گفتگو باقی ہے۔ عالم اسلامی اور عالم عربی میں اتنی شدید وحدت پیدا ہوگئی ہے کہ پہلے سے ان دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہوگیا ہے، وہاں ایک بڑی

تعداد اُن غیر مسلموں کی ہے جن کی زبان عربی ہے اور دوسری ایک بھاری تعداد ان لوگوں کی بھی ہے جو مسلمان ہیں مگر انکی زبان عربی نہیں ہے۔

اس میں شبہ نہیں ہے کہ اسلامی اثر ورسوخ نے عربی زبان کی اشاعت میں امداد ضرور پہنچائی مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام اور اُس کا اثر تو پھیلا ہو مگر عربی زبان بالکل نہ پھیلی ہو۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم علٰحدہ عربی زبان کی اشاعت پر تبصرہ کریں۔

دنیا کی تاریخ میں یہ بات بہت کم نظر آتی ہے کہ کسی خاص دین نے کسی خاص زبان یا رسم الخط کے پھیلانے میں مدد کی ہو مگر یہ غیر معمولی چیز اسلام کی اشاعت کے ساتھ پیش آئی اور اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور عربی رسم الخط کا بھی پرچار ہوا۔ ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ اسلامی اثر کے ساتھ ہی عربی زبان کی اشاعت" پر سیر حاصل بحث کریں۔ یہاں صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس بدیہی واقعہ کو مختصر طور سے ذیل کے عناصر میں پیش کردیں۔

(۱) اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے اور وہ عربی زبان میں ہے اور اپنے اندر ایک زبردست طاقت رکھتا ہے، اس لیے اسلام اور قرآن کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی اشاعت لازمی تھی۔

(۲) عربی زبان کی ترویج اس لیے بھی ہوئی کہ اسلامی فتوحات کا دائرہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ وسیع ہو گیا اور ان مفتوحہ علاقوں میں عربی عنصر کا غلبہ ہو گیا، اس لیے فتوحاتِ عرب کے ساتھ عربی اشاعت فطری تھی۔ اور عربوں کی افریقہ، شام اور عراق کی طرف ہجرتوں نے اس کے لیے ممیز کا کام کیا اور یہ اسلامی فتوحات کے بعد بھی ایک طویل مدت تک برابر جاری رہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان اسلامی فتوحات نے جو ترکوں مغلوں، دیلمیوں اور بربر وغیرہ قوموں کے ذریعہ ہوئیں انہوں نے عربی زبان کی اشاعت میں کوئی خاص امداد نہیں کی اور وہ علماء اور فقہاء کی تعلیمی زبان سے آگے نہ بڑھی، لیکن پھر بھی عربی الفاظ اور اصطلاحیں تمام اقوام کی زبانوں میں داخل ہو گئیں۔ یہ خیال رہے کہ اسلام نے تمام زبانوں کو آزادی دے رکھی تھی۔

(۳) یہ ماننا پڑیگا کہ عربی زبان خود اپنی طاقت سے پھیلنے کی صلاحیت رکھتی تھی، خاص کر ایسی حالت میں کہ جب اس کا تصادم عہد تمدن کی کمزور زبانوں یعنی فارسی (عراق کی زبان) رومی (شامی) (قبطی مصری) سے ہوا۔ یہ زبانیں ظہور اسلام کے آغاز میں دم توڑ رہی تھیں۔ ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ عربی جیسی طاقتور زبان سے مقابلہ کرسکیں۔ یہ زبانیں دفعۃً فنا نہیں ہوئیں بلکہ عرصہ تک عالم نزع میں سسکتی رہیں۔

اس نقطۂ نظر سے جن ملکوں میں اسلامی اثر پھیلا اُن کی چار تقسیمیں ہوتی ہیں

(۱) وہ خطے جہاں کی ملکی زبان عربی تھی اور پھر لب ولہجہ بھی ایک ہوگیا۔ جیسے جزیرۂ عرب، عراق، شام، مصر اور شمالی افریقہ کے ایک بڑے حصہ کی زبان (۲) وہ علاقے جہاں عربی زبان کا کچھ مدت تک غلبہ رہا اس کے بعد وہاں کی پُرانی زبان پھر جاری ہوگئی اگرچہ اس پر عربی زبان کے اثرات غالب آگئے، اس کی سب سے بہتر مثال ایران کی ہے کہ وہاں پہلے تو علمی ادبی تالیفات وتصنیفات کثرت سے عربی زبان میں ہوئیں پھر فارسی زبان کا رواج ہوگیا، اور یہ سب جانتے ہیں کہ فتوحات اسلامی نے کبھی فارسی زبان کے مٹانے کا قصد تک نہیں کیا۔ اسی لیے وہ ازسرنو زندہ گئی۔ اگرچہ ایک جدید قالب میں جس پر عربیت کا گہرا روغن چڑھا تھا۔

(۳) وہ ملک جہاں کے باشندے عربی اور اپنی اصلی زبان دونوں برابر بولتے اور سمجھتے ہیں اور انہیں عربی زبان سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ جیسے افریقہ کے بربر، طوارق، نوبین اور بجاۃ وغیرہ اقوام ہیں، یہ صحیح ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی ہیں جو عربی زبان بالکل نہیں جانتے لیکن اُن کی اکثریت اس کے برعکس ہے۔

(۴) وہ خطہ جہاں کے لوگ اگرچہ عربی زبان نہیں بولتے ہیں لیکن ان کی زبانوں کا سرمایہ عربی الفاظ واصطلاحات کا مرہون احسان ہے۔ جیسے ترکوں، ہندوستانیوں، جاویوں اور ملایا کے باشندوں کی زبانیں ہیں۔

ایک نمایاں پہلو عربی زبان کا یہ بھی ہے کہ اس کا رسم الخط ہمہ گیر ہے اور دور دور تک اس کا رواج ہے چنانچہ اس رسم الخط کو ترکی، فارسی، اردو، پنجابی، سندھی، پشتو، افریقہ اور مشرقی ہند کے جزیروں کی زبانوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ (العرب والاسلام، الہلال مصر کا خاص نمبر)

ادبیات

درسِ عمل

پروفیسر ظفر تاباں صاحب دہلوی

سوزِ حیات در جگرِ کارواں بزن
برخیز و دشنہ بر رگِ خوابِ گراں بزن

از آتشے کہ خاکِ عرب لالہ زار شد
ہم شعلہ بخرمنِ ہندوستاں بزن

بگذر ز عافیت کہ تعطل فنائے تست
چوں موج خویش را بہ یمِ بیکراں بزن

اے شیخ دورِ خاک نشینی بسر رسید
ایں مشتِ خاک را بسرِ آسماں بزن

از ناخدا چہ می طلبی از خدا طلب
گر دست میزنی بمتاعِ گراں بزن

اے آنکہ حرفِ مطلب تو ناشنودہ ماند
ایں حرف را بنوکِ زبانِ سناں بزن

گر رخصتِ نشاط ز دنیا نیافتی
شبخوں با نبساط دلِ قدسیاں بزن

غزل

از جناب الم صاحب مظفر نگری

فصلِ گل دیکھا کیے فصلِ خزاں دیکھا کیے / دونوں رُخ حُسنِ ازل کے رازداں دیکھا کیے

کیا بچا کیا جل گیا برقِ تپاں سے پوچھیے / ہم تو بربادیِ شاخِ آشیاں دیکھا کیے

تھی نگاہِ شوق جن کی رنگ و بو سے آشنا / وہ قفس میں بھی بہارِ گلستاں دیکھا کیے

ہر ادائے جانفزا تیری حیات افروز تھی / ہم فنا میں بھی بقا ہی کا سماں دیکھا کیے

قافلہ ہے کونسی منزل میں یہ کس کو خبر / ڈھونڈھنے والے تو گردِ کارواں دیکھا کیے

در حقیقت تھے وہی دیر و حرم سے آشنا / جو تصور میں تمہارا آستاں دیکھا کیے

ذکرِ گل اور شکرِ گل سے تھی ہمیں فرصت کہاں / آشیاں میں ہم تو برقِ آشیاں دیکھا کیے

پھول ہوں کلیاں ہوں کانٹے ہوں چمن ہو دشت ہو / سب کو ہم آلودۂ رنگِ خزاں دیکھا کیے

سو گئے جو بے خبر سُن کر صدائے الرحیل / عمر بھر خمیازۂ خوابِ گراں دیکھا کیے

اُن کو بھی حیرت رہی وہ اپنی جلوہ گاہ میں / صرف مجھ کو ہی ہلاکِ امتحاں دیکھا کیے

کر گئے یونہی بسر اپنی تمہارے منتظر / عمر بھر خوابِ نویدِ ناگہاں دیکھا کیے

موت ہے ذکرِ قفس ان بزدلوں کو اے الم
رہ گئے گلشن میں جو لطفِ آشیاں دیکھا کیے

اسرار و رموز

از جناب نہال سیوہاروی

کب ہوا تاراج برقِ بے اماں کیونکر ہوا — یہ نہ پوچھو مجھ سے برباد آشیاں کیونکر ہوا

جزو میں کیونکر الٰہی آ گئے اندازِ کُل — قطرۂ طوفان بحرِ بے کراں کیونکر ہوا

اُن کا جلوہ تو ازل سے ہے حجاب اندر حجاب — باعثِ ہنگامۂ کون و مکاں کیونکر ہوا

جس کی ماہیت سے ہے ذہنِ ملائک بے خبر — آشنا اس راز سے پیرِ مغاں کیونکر ہوا

اے کہ تیرا حُسن میرے دل میں ہے خلوت نشیں — پردہائے لالہ و گل سے عیاں کیونکر ہوا

ایک مشتِ خاک سے افزوں نہیں میرا وجود — سوچتا ہوں حاملِ بارِ گراں کیونکر ہوا

میں کہ تھے ہفت آسماں چکر میں رفعت سے مری — پائمالِ گردشِ ہفت آسماں کیونکر ہوا

میں کہ تھی میرے لیے پہنائیِ افلاک تنگ — حیرتی ہوں قانعِ یک خاکداں کیونکر ہوا

میں کہ تھی تخلیق میری خواجگی کو دہر کی — پائے بندِ احترامِ این و آں کیونکر ہوا

تھا میں صحرائے عدم میں صورتِ گنجِ نہاں — عالمِ ہستی میں خاکِ رائگاں کیونکر ہوا

بھا گئی کیوں فطرتِ آزاد کو پابستگی — آدمی مانوسِ زنجیرِ گراں کیونکر ہوا

اصل ہی جب کچھ نہیں سود و زیانِ دہر کی — گرم یہ ہنگامۂ سود و زیاں کیونکر ہوا

سازِ گیتی میں نہیں گر غیر از آہنگِ حق — اہلِ دیں! یہ فرقِ ناقوس و اذاں کیونکر ہوا

تو کہاں اے غیرتِ مہرِ درخشاں ہم کہاں — خاکساروں پر محبت کا گماں کیونکر ہوا

تجھ کو ہم اربابِ تقویٰ سے سمجھتے تھے نہال
یہ بتا سر خیلِ رندانِ جہاں کیونکر ہوا

شئون علمیہ

انسانی ضمیر کے متعلق انسانی نظریہ

علمائے نفسیات انسانی ضمیر کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) ضمیر نفسی و روحی (۲) ضمیر علمی و اخلاقی۔ اول الذکر کی صحیح تعبیر احساس کے لفظ سے کی جاسکتی ہے یعنی وہ مدرکات، میلانات اور احساسات جو ہمارے نفس میں اپنی تاثیر پیدا کرتے ہیں اور ہماری روح سے اپنے حسی ربط کو ظاہر کرتے ہیں۔ ضمیر کی دوسری قسم کا تعلق بیشتر نفسی حالات سے ہے۔ وہ حالات جس کے توسط سے ہمارے کاموں اور کارناموں کی بھلائی بُرائی کا اندازہ ہوتا ہے اور ہمارے ارادوں پر کوئی حکم عائد کیا جاتا ہے۔

علم الاخلاق میں ضمیر انسانی کی پہلی قسم ثانوی اہمیت رکھتی ہے۔ اس قسم کا ضمیر انسانوں میں بھی ہوتا ہے اور حیوانات میں بھی البتہ اخلاقی ضمیر کا وظیفہ بہت اہم ہے۔ ہم اس کی قوت فیصلہ کو پریوی کونسل کے جج سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ ہم جو کچھ سُنتے ہیں، جو ارادے کرتے ہیں اُن کا فیصلہ کرنا اور اپیل سُننا اخلاقی ضمیر کا کام ہے۔ وہ ہمارے نفوس میں ربط پیدا کرتا ہے۔ نفس انسانی کو دوسرے نفوس سے ملاتا ہے۔ ہر کام اور ہر اقدام سے پہلے خیر کی شاہراہ دکھاتا ہے اور بدی کی پیچیدہ راہوں پر گامزن ہونے سے روکتا ہے۔ جب ہم قابل قدر کام کرتے ہیں تو ہمارے نفس میں فخر کے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ اور جب کوئی بُرائی، گناہ اور جرم کرتے ہیں تو ہمیں خطاکاری کا احساس دلاتا ہے اور ذلت کے احساس سے روشناس کراتا ہے۔ ہر مجرم جرم کے بعد اپنے باطنی دباؤ سے سزا پاتا ہے۔ تنبیہ اور سرزنش سے دوچار ہوتا ہے، درحقیقت اس سزا کا اجراء اخلاقی ضمیر ہی کرتا ہے۔

آسانی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ضمیر انسانی کے وظائف کی ادائگی کے دو رُخ ہیں۔

ایجابی، اور سلبی (مثبت اور منفی) انسان کے کسی فعل سے پہلے ضمیر جو رہنمائی کرتا ہے وہ مثبت ہے اور کام کرنے بعد جو آثار ظاہر ہوتے ہیں اور ان کے متعلق ضمیر کو جو فرض ادا کرنا پڑتا ہے اس کا تعلق منفی پہلو سے ہے قسم اول مثبت پھر وہ مہم کیفیات سے اپنے ربط کو ظاہر کرتی ہے (الف) خیر و شر کی تمیز (ب) نیکی پر مداومت کرنا اور بدی سے احتراز کرنا۔ دونوں کیفیات اثباتی ہیں۔ منفی رُخ کا تعلق زیادہ تر انفعالی عواطف سے ہے۔ کسی اچھے کام کے بعد آرام کرنا اور اچھے کام کو دیکھ کر رشک کا اظہار کرنا یا بُرے کام پر تنبیہی فکر اور تصوری طور پر سرزنش۔ یہ اور اسی قسم کے انفعالات انسانی ضمیر کی فرض شناسی کے منفی رُخ کا عکس پیش کرتے ہیں۔

اس قسم کے حِسّی عوامل منفی اور سلبی ہونے کے باوجود بڑے کارآمد ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک مجرم نے مادی اثر کے بغیر ہی ایک جرم کا اقبال کیا اور یہ جانتے ہوئے کیا کہ وہ زبردست سزا پائیگا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ درحقیقت اس کے ضمیر کی سرزنش اور تنبیہ تھی جس کا وہ مقابلہ کرنا چاہتا بھی تو کر نہ سکتا تھا۔ بس یہ ایک انفعالی کیفیت تھی جس نے قانون کی لاٹھی سے زیادہ کام کر دکھایا۔ ضمیر کی تنبیہ جب موثر ہوتی ہے تو اس کا اثر زہر سے زیادہ سخت اور تیز ہوتا ہے۔ مجرم سزا سے پہلے سزا پاتا ہے۔ ایک عذاب اس کی گردن پکڑ لیتا ہے جو انفعال کی بھٹی میں تیار ہو کر سینہ کی آگ کو بھڑکا دیتا ہے۔

ضمیر نفسی اور ضمیر اخلاقی میں، ابتدا ذکر کیے ہوئے فرق کے علاوہ ایک اور بھی فرق ہے، ضمیر نفسی ہمیشہ، ہر حالت میں بدون انقطاع مسلسل اپنے کام میں فعالیت کے ساتھ مشغول رہتا ہے۔ اخلاقی ضمیر کی حالت اس سے مختلف ہے وہ صرف اسی وقت اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے جب انسان اپنے ارادہ اور عمل کے دائرہ میں بُرائی یا بھلائی کرنے پر مامور ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ کبھی اپنے کاموں میں منہمک ہوتا ہے اور کبھی آرام میں مشغول۔

ضمیر کے متعلق علماء کے نظریات

(۱) کانٹ۔ مشہور جرمن فلسفی کانٹ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ضمیر ایک روشن نورانی شمع کے مانند ہے جو ایک بلند و بالا اور غیر محدود قوت کی طرف سے مقید اور محدود قوت کی صورت میں اپنی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ شعاع انسان کی قائد، ہادی و رہنما ہے جو انسانی عواطف کو مرکزِ اعتدال پر لاکر صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور حیات کے بحر ظلمات کو عبور کرنے میں امداد دیتی ہے۔

کانٹ کے نزدیک انسانی عقل دو قسموں میں منقسم ہے قسم اول عقل نظری۔ اس کا تعلق خاص طور پر ظاہری احساسات کے ادراک سے ہوتا ہے اور صرف عالم ظواہر پر اپنا حکم صادر کرتی رہتی ہے کانٹ کے عقیدہ میں اس عقل کا مکر و فریب اور دھوکہ میں آجانا دائرۂ امکان سے خارج نہیں ہے وجہ ظاہر ہے۔ اس عقل کا قاصد وہ حاسہ ہے جو اکثر غلط ادراک سے اپنا تعلق پیدا کرلیتا ہے اور اس طرح گمراہ ہوکر دھوکہ کھا جاتا ہے۔ جو میلانات غلط بنیاد پر قائم ہونگے واضح طور پر اُن کا نتیجہ غلط ہوگا

کانٹ کے نظریے کے متعلق ایک تنقیدی رائے یہ ہے کہ اس نے اس فلسفیانہ مسئلہ میں مبالغہ سے کام لے کر ٹھوکر کھائی ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں اس موضوع پر ایسی پیچیدہ آرا کا اظہار کیا ہے کہ اس کے شاگرد بھی ان سے پیدا شدہ مغلقات اور غوامض کو حل نہیں کرسکے۔ شوپنہار اعتراف کرتا ہے کہ وہ ان اُلجھے ہوئے نظریات میں سے بیشتر کا حل پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ فرانس کے زیادہ تر علماء بھی کانٹ کے مُسلمات پر حملہ آور نظر آتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں سخت ہیں اور چیلنج کی صورت میں نظر آتی ہیں۔

کانٹ اسی سلسلہ میں کہتا ہے "اگر ہمارے حواس موجودہ حالت کی جگہ دوسری حالت اختیار کرلیں تو یہ زمان و مکان جو زندگی کے تمام عوامل کا مرجع ہے یکسر اور لازماً بدل جائیگا اور اس

تبدیلی سے موجودات عالم کے متعلق جو احکام عائد ہوتے ہیں وہ بھی دگرگوں ہو جائینگے کیونکہ اس وقت یہ احکام دوسری قسم سے رونما ہونگے۔

اس قسم کے نظریات کو معمولی اعتماد کے ساتھ قبول کرنا انسانی ضمیر کے لیے ایک مشکل کام ہے۔

کانٹ عقل کی دوسری قسم عقل عملی کو قرار دیتا ہے۔ اس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ عقل بیگانہ محرک ہے جو انسان کو ادائے وظائف، اقدامِ عمل اور اجرائے احکام پر تیار کرتی ہے۔ یہ عقل سہو و خطا سے محفوظ ہے اور دھوکہ میں بھی نہیں آتی۔ یہ اس لیے کہ یہ عقل کمزور حواس کی مطیع و محکوم نہیں ہے بلکہ روشنی کے ایک بلند و بالا سرچشمہ سے امداد حاصل کرتی ہے

ابن مسکویہ (۴۲۱ھ) شہرۂ آفاق مسلم فلسفی ابن مسکویہ اور اسلامی دور کے دوسرے علما اخلاق کے نظریات کا عمیق جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کانٹ نے جو کچھ ظاہر کیا ہے وہ نظریہ کے لحاظ سے ندرت کا نمونہ نہیں ہے اگر کانٹ کے نظریات کے جوہر اور اصل روح کو دیکھا جائے تو وہ حکمائے اسلام ہی کے نظریات کا عکس ہوگا۔

ابن مسکویہ کے نزدیک انسان کئی قوتوں کا مجموعہ ہے (۱) قوتِ ناطقہ یا عاقلہ (۲) قوت درندگی (۳) قوتِ شہوانی۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ قوت عاقلہ ایک شعاعِ نورانی ہے جو خالق برتر کی طرف سے نفس بشری کو الہام ہوتی ہے۔ یہی قوت ذمہ داریوں کا مرجع اور واجباتِ حیات کا محور ہے۔ ہمارا فکر اور تمیز۔ ہماری خوشی اور غم اندوزی۔ آرام طلبی اور دقت پسندی سب اِسی کے تابع ہیں۔ نیکی کی طرف رجحان اور بُرائی سے احتراز کا میلان بھی اس کا قوی اثر ہے۔ وہ صاف طور پر کہتا ہے کہ اس قوت کی اصل یہ ہے کہ انسان حسن اور نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور بُرائی اور قباحت سے نفرت کرتا ہے۔

یہ وہ عقیدہ ہے جو آٹھ سو سال سے دنیا کے فلسفیوں کو متاثر کر رہا ہے اور کانٹ بھی اسی کے اثرات میں سے بعض آثار پیش کر رہا ہے۔

دونوں میں اگر کچھ فرق پایا جاتا ہے تو وہ ضمیر انسانی کی تقسیم سے پیدا ہوتا ہے۔ اصل نظریہ میں ظاہر نہیں ہوتا۔

روسو کا نظریہ ژان ژاک روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۲۸) فرانس کا انقلابی فلسفی اور دانشمند مربی یہ ہے کہ ضمیر ایک نورانی قوت ہے جو خالقِ برتر کی طرف سے انسان کے غلیظ وکثیف جسم میں شامل کردی جاتی ہے۔ انسان کے باطن کی تاریکیوں میں ضمیر کا وجود روشنی کے وجود کی مانند ہے۔ یہ ضمیر ہی ہے جو فکر کی ظلماتِ فکر کو انوارِ افکار سے بدل دیتا ہے اور گمراہی کو ہدایت سے۔

روسو کے نزدیک ضمیر عقل سے مختلف شے ہے۔ ضمیر نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے عقل نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کرتی۔ ضمیر کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔ عقل گمراہ ہوتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔

روسو انسانی ضمیر کے متعلق اپنے نظریہ کے مخصوص پہلو کو ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

ضمیر ممتاز اور لازوال فطری قوت ہے۔ ضمیر آسمان کی آواز ہے۔ رہنما ہے۔ معتمد ہادی ہے قابلِ اعتماد کمانڈر ہے۔ اور اس محدود و مجہول کائنات میں ایک ایسا جج ہے جو کبھی خطا نہیں کرتا۔ ضمیر ایک فلاسفر ہے جو نیکی بدی میں تمیز کرتا ہے اور کبھی فریب اور گمراہی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ضمیر خدا اور انسان کے درمیان تعلق قائم کرنے والا اور یہ ہی اور ہستی کا ایک ایسا اعلیٰ جوہر ہے جو انسان کی فطرت میں راسخ ہو چکا ہے۔ اگر ضمیر موجود نہ ہوتا تو انسان اور حیوان کا فرق ختم ہو جاتا۔ یہ ضمیر ہی ہے جو بے چین فراست کو سکون اور بے ثبات عقل کو ثبات عطا کرتا ہے۔

روسو کا شاگرد جیکب المانی (جرمن) بھی اس رائے سے متاثر ہے اور یہی رائے رکھتا ہے۔ جیکب ضمیر کے متعلق کہتا ہے۔ ضمیر کیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں "ضمیر" سے بہتر دوسرا لفظ نہیں پیش کیا جا سکتا اس لیے کہ ضمیر ایک سچا الہام ہے جو انسانی افراد میں سے ہر فرد کے قلب میں داخل ہے۔

فلاسفہ اسکاٹ لینڈ:- اسکاٹ لینڈ اسکول کے فلاسفر ضمیر کے متعلق ایک خاص نظریہ

رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ضمیر اُس انسانی حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ خیر کو شر سے اور شر کو خیر کو تمیز دی جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مرئیات کو مسموعات سے۔ مسموعات کو ملموسات سے تمیز دی جاتی ہے۔ اس نظریہ پر علماءِ عصر نے زبردست تنقیدیں کی ہیں۔ ان کے نزدیک ضمیر کو حواس میں سے کوئی حاسہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حواس اکثر بجا نہیں رہتے۔ حواس خطا کھاتے ہیں۔ صراطِ مستقیم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور گمراہی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ضمیر کو قانونِ حواس کے تابع ہونا پڑیگا۔ ضمیر احکام کے تابع ہو گا، حواس کے حکم سے حرکت کریگا، اور حواس کے حکم سے سکون آشنا ہوگا۔ اس سے یہ لازم آئیگا کہ انسان ضمیر کے فیصلہ کے مطابق جو کام کریگا اُس میں یقین کی راہ پیدا کرنی مشکل ہو جائیگی۔ اور حواس کی غلطی کا اثر یہ ہوگا کہ انسانی کاموں میں بھی تردد پیدا ہو جائیگا۔ انسان اکثر حالات میں غلطی کرینگے اور بیشتر معاملات میں نامناسب راہ اختیار کرنے پر مجبور ہونگے۔

اس طرز فکر کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں۔ یہ مان کیا جائے کہ حیوانات بھی ضمیر رکھتے ہیں اُن کو بھی خیر سے فائدہ اور شر سے بُرائی حاصل کرنے کی ایسی توقع رکھنی چاہیے جس طرح انسان عملِ خیر اور فعلِ شر سے رکھتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ بھی ہو گا کہ جو شے حواس کے نزدیک جائز ہو وہ ضمیر کے نزدیک بھی جائز ہو۔ ضمیر و حواس دونوں ہم عناں قرار دیے جائیں اور دونوں ایک دوسرے سے بہرحال وابستہ رہیں۔

تجربہ کے میدان میں اس نظریہ کی صحت صرف مشکوک نہیں بلکہ غلط ہے۔ حواس اور ضمیر کا مقصد علیحدہ علیحدہ ہے۔ دونوں کی ذمہ داریاں جُدا جُدا ہیں۔ دونوں عامل کی حیثیت سے مختلف اثر پیدا کرتے ہیں۔ فلسفیانہ حکمت عملی کی رو سے یہ کہنا ناگزیر ہے کہ اسکاٹ لینڈ جس طرزِ فکر کا قائل ہے اُس کو انسانی ضمیر قبول کرنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتا۔

آج کل کی سیاست سمجھنے کے لیے

بحرالکاہل کی سیاست :- اس کتاب میں بحرالکاہل کی سیاسی معاشی اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے محاذ کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت عہر

ممالک اسلامیہ کی سیاست :- اس میں مختلف اسلامی ممالک کے سیاسی اور تاریخی ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ترکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کی کیا حالت تھی اور جنگ کے اختتام پر ان کی سیاسی اہمیت کیا باقی رہ گئی اور ان میں کس قسم کی نئی سیاسی تحریکیں اٹھیں اُن کا کیا حشر ہوا اور موجودہ وقت میں اُن کی سیاسی اور جنگی پوزیشن کیا ہے۔ قیمت عہر

قومیت اور بین الاقوامیت :- اس میں قومیت اور اس کے عناصر سے بحث کی گئی ہے نیز بتایا گیا ہے کہ قومیت کا ارتقا کیونکر ہوا۔ مشرق اور مغرب کے قومیت کے تصور میں کیا فرق ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ قومیت کے ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامیت کے تخیل کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور آئندہ اس کی نوعیت کیا ہو گی۔ آخر میں انجمن اقوام کی ہیئت اس کے ارتقا اس کی کارگذاریاں اور اس کی ناکامی کے اسباب پر تبصرہ ہے۔ قیمت عہ ر

نازیت :- اس میں بتایا گیا ہے کہ ہٹلر نازیت کی پیداوار ہے اور اس کو اس نے پروان چڑھایا۔ نازیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ قیمت عہ ر

مکتبہ جامعہ۔ قرولباغ۔ نئی دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں :- ۱۔ مکتبہ جامعہ۔ جامع مسجد دہلی۔ ۲۔ مکتبہ جامعہ بیرون لاہوری دروازہ لاہور
۳۔ مکتبہ جامعہ، امین آباد پارک لکھنؤ، ۴۔ مکتبہ جامعہ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳، ۵۔ کتابخانہ عابد شاپ حیدرآباد دکن۔ ۶۔ سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور۔

موصوف کا یہ علمی و اسلامی مقالہ اساتذہ و طلباء یونیورسٹی کے خیالات میں بہت کچھ اصلاح کا اور علماء کی نسبت بدگمانیوں کے دور ہونے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے تقطیع متوسط ضخامت ۳۹ صفحات کتابت و طباعت روشن اور صاف۔ قیمت ۲ر

سوم ہجری و عیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) تقطیع ۲۲×۱۸ ضخامت ۵۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

ارباب علم کو عموماً اور محققانہ تصنیف و تالیف کا کام کرنے والوں کو خصوصاً ایک ایسی تقویم (جنتری) کی ضرورت رہتی ہے جس سے ہجری اور عیسوی سنین کی مطابقت کی جاسکے انگریزی میں اس قسم کی کئی ایسی جنتریاں موجود ہیں۔ عربی میں بھی دو ایک ایسی جنتریاں پائی جاتی ہیں لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی جنتری نہیں جس سے اس مشکل کا حل ہوسکے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) لائق مبارکباد ہے کہ اس نے ایسی عمدہ جنتری شائع کرکے اہلِ علم کی ایک بڑی دشواری کو آسان کردیا۔

اِس تقویم میں پہلے خانہ میں سنہ ہجری لکھا ہوا ہے، دوسرے خانہ میں عیسوی سنہ مع تاریخ اور دن کے درج ہے۔ اس دوسرے خانہ کے سب سے اوپر کے خانہ میں قمری ماہ تحریر ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ فلاں عیسوی سنہ کی فلاں تاریخ اور فلاں دن کو ہجری سنہ کے فلاں مہینہ کی پہلی تاریخ ہوئی تھی۔ اب اس کے بعد پورے مہینہ کا حساب آپ کرسکتے ہیں۔ اس کتاب میں پہلی سنہ ہجری سے لے کر ۱۵۰۰ سنہ ہجری تک کے سنین لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب بہت قابلِ قدر ہے اور اس قابل ہے کہ ہر صاحبِ علم کے پاس اس کا ایک ایک نسخہ موجود رہے۔

سائنس اور اسلام از مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند تقطیع متوسط ضخامت ۸۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۵ر پتہ:۔ معتمد نشر و اشاعت انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

آج کل کی سیاست سمجھنے کے لیے

بحرالکاہل کی سیاست: ۔ اس کتاب میں بحرالکاہل کی سیاسی معاشی اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے محاذ کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی

[illegible]

دے کر مختلف اسلامی عنوانات پر مقالات پڑھوائے جاتے ہیں۔ چنانچہ زیر تبصرہ مقالہ اسی سلسلہ کی ایک سنہری کڑی ہے۔ یہ مقالہ اصل میں مولانا محمد طیب صاحب کی وہ تقریر ہے جو مولانا ممدوح نے انجمن کے عظیم الشان جلسہ میں ۷، اگست سنہ ۳۸ء کو طلباء و اساتذہ یونیورسٹی کے سامنے کی تھی۔ اور اب مولانا کے قلمبند کر دینے کے بعد انجمن کی طرف سے بصورت کتاب شائع ہوئی ہے۔ موضوع تقریر کی اہمیت اُس کے عنوان سے ظاہر ہے

اس مقالہ میں مولانا نے پہلے یہ بتا کر کہ سائنس کا موضوع بحث مادہ اور اُس کے عوارض ذاتیہ ہیں۔ عناصر اربعہ پر بحث کی ہے کہ اُن میں کثافت و لطافت کے اعتبار سے کیا فرق ہے۔ پھر بتایا ہے کہ انسان ان سب کو کس طرح اپنے کام میں لاتا اور اُن میں طرح طرح کے تصرفات کرتا ہے۔ انسان میں یہ طاقت و قوت کہاں سے آئی؟ مولانا اس کا جواب دیتے ہیں کہ روح کی وجہ سے۔ پھر روح اور روحانیات سے ذاتِ حق اور صفاتِ ایزدی پر لطیف استدلال کیا ہے اور آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ محض روح کی قوت اور ذات احدیت کے ساتھ اس کی یک گونہ مناسبت کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔ اس بنا پر روح اصل ہے اور مادہ تابع۔ اور اسلام نے روح کو ہی سربلند و سرافراز کرنے کی کوشش کی ہے۔ بحث دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے البتہ ایسی سنجیدہ بحث میں اگرا ونٹ، ہاتھی اور شیر کے بچہ کی کہانی نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ اُمید ہے کہ مولانا

موصوف کا یہ علمی و اسلامی مقالہ اساتذہ وطلبار یونیورسٹی کے خیالات میں بہت کچھ اصلاح کا
اور علمار کی نسبت بدگمانیوں کے دور ہونے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے تقطیع متوسط ضخامت ۳۹ صفحات کتابت و
طباعت روشن اور صاف۔ قیمت ۲ر

یہ وہ مقالہ ہے جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
کی انجمن اسلامی تمدن و تاریخ کے زیر اہتمام "اسلامی ہفتہ" کے سلسلہ میں پڑھا تھا۔ اس مقالہ میں
"نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء" اور اصولی حکومت کے خصائص پر بحث کرنے کے بعد اُن خام
خیالیوں کی تردید کی گئی ہے جن میں آج کل عام طور سے مسلمان مبتلا ہیں۔ اس کے بعد اسلامی تحریک
کے مخصوص طریقِ کار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تاریخ اسلام کے منتخب اور ایمان پرور واقعات سے
اس طریق کار کی صحت پر استدلال کیا گیا ہے۔ پورا مقالہ اوّل سے آخر تک فاضل مقالہ نگار
کے غور و فکر اور اسلامی و دینی عقیدت و محبت کا آئینہ دار ہے۔ مسلمان نوجوانوں کے لیے اس کا
مطالعہ مفید اور تنویر دماغی کا سبب ہوگا۔

فردوسِ گم گشتہ تقطیع کلاں صفحات ۲۲ طباعت و کتابت صاف ستھری قیمت ۲ر

یہ وہ تقریر ہے جو چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے ۲۳۔ فروری ۱۹۴۱ء کو انجمن اسلامی
تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے زیر اہتمام حامد ہال میں پڑھی تھی۔ اس تقریر میں اولاً آیاتِ
قرآنی اور ثانیاً کلام اقبال کی روشنی میں اجتماعیات اسلامی کے فطری قوانین اور خلافت الٰہیہ اور
اسلام کے ترکیبی عناصر پر دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ اس تقریر کو سن کر اگر ہماری یونیورسٹی کے اساتذہ
وطلبار خالص اسلامی مسائل پر غور و فکر کرنے لگیں تو ہمارے خیال میں اس تقریر کا یہ فائدہ بھی کچھ کم
نہیں ہے۔

دوسری جنگ عظیم | از جناب محمد مرزا صاحب دہلوی تقطیع خورد ضخامت ۲۱۲ صفحات کتابت وطباعت متوسط قیمت مجلد عہ/ پتہ:- کتب خانہ علم وادب اُردو بازار جامع مسجد دہلی۔

موجودہ جنگ اگرچہ پہلی جنگ کا ہی نتیجہ ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے ایک ہمہ گیر انقلاب کی علمبردار ہے اور اس کے نتائج ایک عالمگیر سیاسی وتمدنی ومعاشرتی واقتصادی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تو موجودہ جنگ کے حالات وواقعات پر کبھی کی کئی ضخیم جلدوں میں کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اُردو میں زیر تبصرہ کتاب سب سے پہلی کتاب ہے جس میں ستمبر ۱۹۳۹ء سے ۱۵ مئی ۱۹۴۰ء تک کے تمام حالات وواقعات جنگ بڑی تفصیل سے یکجا قلمبند کر دیے گئے ہیں۔ پھر صرف واقعات کے لکھنے پر ہی قناعت نہیں کی گئی بلکہ ساتھ ساتھ تمام حالات پر مبصرانہ سیاسی تبصرہ اور واقعات کے علل واسباب کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب وقت کی ایک ضرورت کی برمحل تکمیل ہے۔ اور یہ اس لائق ہے کہ ہر تعلیم یافتہ اس کا ایک ایک نسخہ اپنے پاس رکھے تاکہ واقعات جنگ، اُن کی ترتیب اور اُن کے ظہور ووقوع کے اسباب یکجا طور پر اُسے معلوم ہو سکیں۔

نہر سوئز | از جناب عبداللہ صاحب بٹ تقطیع خورد ضخامت ۱۵۶ صفحات کتابت وطباعت متوسط کاغذ اُجلا قیمت مجلد عہ/ پتہ:- کتب خانہ رشیدیہ جامع مسجد دہلی۔

موجودہ جنگ میں نہر سوئز کو جو سیاسی اہمیت حاصل ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ نہر مشرق ومغرب کا مقام اتصال ہے، اس کو بحر روم کی کنجی کہا جاتا ہے جس پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے آج متحارب قومیں جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور ایک دنیا کو عظیم ترین ہلاکت وبربادی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ عبداللہ صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اسی نہر کی تاریخ اور اُس کے پس منظر کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر جو واقعات اس نہر کی تکمیل کے بعد معرض ظہور میں آئے اُن کو بھی مؤرخانہ بصیرت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بہ قول باری صاحب کے اس میں شبہ نہیں کہ "یہ کتاب اردو میں ایک اہم بین الاقوامی

موضوع پر ایک کامیاب کوشش ہے۔ اُمید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کر کے لائق مصنف کی حوصلہ افزائی کرینگے۔

مسلمان بچیوں کی پہلی کتاب | از مقبول احمد صاحب سیوہاروی تقطیع خورد ضخامت ۱۵ صفحات کتابت طباعت بہتر قیمت ۳ر پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی یا لکھنؤ۔ یا "مکتبہ بُرہان نئی دہلی"

مقبول احمد صاحب کو سہل اور آسان زبان میں بچّوں کے لیے کتابیں لکھنے کا خاص سلیقہ ہے، اس سے پہلے وہ بچّوں کے لیے کئی کتابیں لکھ چکے ہیں جو بعض مدارس کے کورس میں داخل ہیں۔ اب اُنہوں نے یہ کتاب بچیوں کے لیے لکھی ہے۔ زبان بہت آسان ہے اور اسباق ایسے ہیں کہ اُن سے مذہبی اور دینی معلومات کے ساتھ ساتھ عام خانہ داری اور رہنے سہنے کی چیزوں کے متعلق بھی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ مسلمان بچیوں کے نصاب تعلیم میں اس کتاب کا داخل ہونا مفید ہوگا۔

محمد رسول اللہ | از مقبول احمد صاحب سیوہاروی تقطیع خورد ضخامت ۱۶۰ صفحات طباعت و کتابت بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی یا اسلامی کتاب گھر سیوہارہ ضلع بجنور

لائق مصنف نے یہ کتاب بھی نہایت سہل اور سلیس زبان میں بچوں کے لیے لکھی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح طیبہ چھوٹے چھوٹے جملوں کی شکل میں ایک نئے انداز سے لکھے ہیں۔ بہ قول مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) یہ واقعی "بڑے کام کی کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ اسلامی مکاتب کے کورس میں داخل کی جائے۔

حالی | از کوثر صاحب چاندپوری تقطیع خورد ضخامت ۳۰ صفحات قیمت ۳ر پتہ جعفری برادرس پروپرائٹر انوار احمدی پریس الہ آباد۔

کوثر صاحب اُردو کے مشہور افسانہ نویس ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں بچوں کے لیے مولانا حالی

مرحوم کے حالات زندگی بہت آسان زبان میں لکھے ہیں اس کتاب کا مطالعہ بچوں کے علاوہ متوسط استعداد کے اُردو خواں لوگوں کے لیے بھی ازبس مفید ہوگا۔

رشوت یہ ایک اصلاحی اور اخلاقی افسانہ ہے جو کوثر صاحب چاندپوری نے بچوں کے لیے سہل اور آسان زبان میں لکھا ہے۔ افسانہ کا پلاٹ دلچسپ اور عبرت انگیز ہے۔ قیمت ۲ر ضخامت ۱۶ صفحات

بہادر لڑکا یہ بھی کوثر صاحب کا ایک مختصر سا افسانہ ہے جس میں اُنھوں نے بچوں کی سہل اور آسان زبان میں ایک لڑکے کی کہانی لکھی ہے جو اپنی محنت اور طلب صادق کی بدولت کسانی اور دُکانداری کے معمولی درجے سے ترقی کرکے بادشاہ بن گیا۔ قیمت ۲ر

اِستقلال اس کتابچہ میں کوثر صاحب نے بچوں کو مخاطب کرکے استقلال اور ہمت و پامردی کے فائدے بہ صورت مکالمہ لکھے ہیں۔ زبان عام فہم اور آسان اور اندازِ بیان دلچسپ اور دلنشین ہے۔ کوثر صاحب کے عام افسانوں کی طرح جن میں اصلاحی اور اخلاقی رنگ غالب ہوتا ہے۔ یہ سب مختصر مختصر رسالے بھی اخلاقی اور بلند کیریکٹر کا سبق دینے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ بچوں کے لیے ہیں لیکن ان کا مطالعہ ہر ایک کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ قیمت ۲ر

علم اور تجارت اس کتابچہ میں کوثر صاحب چاندپوری نے بہ صورت مکالمہ علم اور تجارت دونوں کے فوائد لکھے ہیں۔ پھر آخر میں یہ دکھایا ہے کہ علم تجارت سے بہتر ہے۔ زبان کی شستگی کے لیے کوثر صاحب کا نام کافی ضمانت ہے۔ قیمت ۲ر۔ اِن سب کے ملنے کا وہی مندرجۂ بالا پتہ ہے۔

Registered No. L 4305

قواعد

۱۔ برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اُتریں بُرہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

۳۔ باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں، ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

۴۔ جواب طلب امور کے لیے ۱/ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵۔ "بُرہان" کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۶۔ قیمت سالانہ پانچ روپیے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸/

۷۔ منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرولباغ نئی دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

برہان

مرتّبہ

سعید احمد اکبرآبادی

ایم اے۔ فاضل دیوبند

برہان

جلد ہفتم		شمارہ (۳)

شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۱ عیسوی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

قاعدہ ہے کہ کوئی نظام خواہ کتنا ہی عمدہ اور بہتر ہو۔ لیکن وہ بحیثیتِ مجموعی کسی سوسائٹی کو اس وقت تک پورے طور پر متاثر نہیں کرتا جب تک کہ سوسائٹی اس نظام کے مخالف و متضاد دوسرے نظاموں کا ایک مدتِ دراز تک عملی تجربہ کر کے شدید مضرات و نقصانات کے باعث خود اُن نظاموں سے تنگ نہ آچکی ہو۔ دنیا میں کتنی مختلف تہذیبیں پھیلیں۔ کیسے کیسے شاندار تمدنوں کی عمارتیں کھڑی کی گئیں۔ معیشت و معاشرت کے کیسے کیسے خوشنما قوانین وضع کئے گئے۔ دساتیرِ حکومت و سیاست کے کیسے کیسے عجیب و غریب اور مختلف قسم کے خاکے تیار ہوئے۔ انسانیت قرناً بعد قرنٍ انقلابوں اور اجتماعی تبدیلیوں سے گذرتی رہی۔ تمدنِ انسانی کے آسمان پر نئے نئے افکار و خیالات کے بادل آئے اور برس کر یا فقط گرج کر گذر گئے۔ ان ادوار میں انسانی سوسائٹی کا معمول برابر یہ رہا ہے کہ اس نے ایک نظام قبول کیا۔ کچھ زمانہ تک اس کا تجربہ کیا اور جب اس کے نقصانات ہلاکت آفریں ثابت ہوئے تو اُسے چھوڑ جھٹ کوئی اور دوسرا نظام قبول کر لیا۔ پھر اس میں بھی قباحتیں اور مضرتیں نظر آئیں تو عقل و فکر سے بھیک مانگ کر ایک اور دستور و آئین بنا لیا اور ایک عرصہ تک تجربہ کرنے کے بعد انجام کار اس کو بھی خیر باد کہدیا۔

اب ذرا تھوڑی دیر کیلئے چشمِ تصور کو وا کر کے اس زمانہ کے عام انسانی اور تاریخی حالات کا جائزہ لو، جبکہ فاران کی چوٹی سے پہلی مرتبہ اسلام کا نعرۂ حق بلند ہوا۔ اور دنیا کے سامنے ایک جامع و مکمل اور

فطری اور الہامی نظامِ اجتماع وتمدن پیش کیا گیا۔ اس نظام نے بہت جلد پرانے نظاموں کا خاتمہ کرکے رکھدیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ قیصر وکسریٰ کی قبائے شوکت وحشمت بھی تار تار ہوکر رہ گئی۔ اسلام کے اس حیرت انگیز عروج وارتقائے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو آپ کو ان میں ایک بڑا سبب یہ بھی ملیگا کہ درحقیقت اسلام کی دعوت کے وقت ایران اور روم میں جو اجتماعی نظام قائم تھا لوگ اس سے تنگ آچکے تھے غریب اور مزدور سرمایہ داروں کے زرخرید غلام خیال کئے جاتے تھے۔ اربابِ تموّل عیش پرستی میں مصروف تھے۔ طبقاتی تقسیم نے اخوت ومساوات کو یکقلم فنا کردیا تھا۔ گندے اخلاق اور ناپاک عادات وخصائل نے سوسائٹی کے تمام جسم کو حد درجہ متعفن اور سقیم کررکھا تھا، ان حالات سے تنگ آکر چند عیش پرست امیروں اور رئیسوں کو چھوڑکر عام لوگوں کو جستجو تھی ایک ایسے نظامِ جدید کی جو اُن کی تمام مشکلات کو کامیابی کے ساتھ حل کردے۔ غرض یہ ہے کہ ان قوموں اور ملکوں میں تشنگی کامل درجہ کی پیدا ہوچکی تھی اور ان کی بے چین روحیں کسی ایسے سرچشمۂ زندگی کی تلاش میں سرگرداں تھیں جو اُن کو امن واطمینان اور عافیت وسکون سے بہرہ اندوز کرسکے۔ جب اسی عالمِ اضطراب وتشویش میں اُن کو اسلام کے آبِ حیات کا جامِ زرنگار پیش کیا گیا تو انھوں نے صدقِ دل سے اس کا خیر مقدم کیا، اور اُس کے ایک ایک قطرہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔

پھر دنیا نے جتنا جتنا اس نظام کا تجربہ کیا اُس پر اس نظام کی خوبیاں زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی گئیں اور جبتک یہ نظام اپنی اصلی شکل وصورت میں قائم رہا انسانی سوسائٹی ہر اعتبار سے بلند مرتبت اور ترقی یاب رہی علم وعمل، قانون واخلاق اور حکومت وسیاست میں جو رخنے پڑگئے تھے وہ سب ایک ایک کرکے بند ہوگئے اور حق یہ ہے کہ یہی وہ نظام اسلامی تھا جس نے انسان کو انسانیت کے حقیقی شرف ومجد سے روشناس کیا۔" اس نظام کی خوبی کی دلیل اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے کہ جن وحشی قوموں نے اسکو قبول کیا وہ عظیم الشان اور

صالح تہذیب وتمدن کی مالک ہوگئیں۔ اور جن متمدن قوموں نے اس سے روگردانی کی وہ وحشت وبربریت کے قعرِ عظیم میں گر پڑیں

موجودہ جنگ اس بات کا کھلا اعلان ہے کہ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا میں امن وامان قائم رکھنے اور ایک انٹرنیشنل تمدن کی بنیاد استوار کرنے کیلئے جو قوانین بنائے گئے اور جو تجاویز مرتب کی گئیں وہ سب بیکار ہیں، اور ان سے انسانیتِ عامہ کو تسلی وتشفی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب مغربی تہذیب وتمدن کی برکات، صنعتی وحرفتی ترقیات اور جدید نظامہائے حکومت کی فسوں کاریوں کا پردہ چاک ہوجانے کے بعد یہ حقیقت از خود روشن ہوگئی کہ گوناگوں مادی ترقیوں کے باوجود روحانی اور اخلاقی اعتبار سے انسانیت آج پھر ایسی ہی تشنہ کام ہے جیسی کہ وہ اسلام کی دعوتِ اولین کے وقت تھی۔ اور آج پھر وہ اپنی تشنگی سے مجبور ہوکر ایک ایسے ہی سرچشمہ کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اُسے ان مصیبتوں سے نجات دیدے جن میں وہ اضطراری طور پر مبتلا کردی گئی ہے۔

پس اگر اسلام کا قانونِ عدل وانصاف، اسکا نظامِ اخلاق ومعاشرت اور دستورِ حکومت وسیاست دنیا کی تمام اجتماعی اور انفرادی بیماریوں کا مکمل علاج ہے اور کسی مخصوص زمانہ اور کسی خاص قوم کیلئے ہی نہیں بلکہ ہر زمانہ اور دنیا کی ہر قوم کیلئے ایک کامیاب ترین نسخۂ شفاء ہے تو آج پھر اسکو بروئے کار آنا چاہیے۔ مغرب کی قومیں شدتِ عطش سے تڑپ رہی ہیں۔ ضرورت ہے ایک ایسے ہاتھ کی جو اُن کے لبوں تک اسلام کے آبِ حیات کا جام پہنچادے۔ اگر گاندھی جی میں یہ جرأت ہے کہ وہ یورپ کی متحارب قوموں کے سامنے پورے زور شور کے ساتھ اپنے عقیدۂ عدم تشدد کو بطور ایک نسخۂ کیمیا کے پیش کریں تو کیا مسلمان یہ نہیں کرسکتے کہ وہ اپنا نظام ایک موثر طریقہ پر دنیا کے سامنے پیش کرکے اسکو قبول کرلینے کی دعوتِ عام دیں۔ موجودہ جنگ کے ختم ہونے پر نئے نئے نظریے پیدا ہوں گے اور انسانی تمدن کے لئے طرح طرح کے خاکے بنائے جائیں گے ایسے وقت میں اگر مسلمان اپنے نظام کو ایک دلکش اور جدید قالب میں پیش کرسکے تو بے شبہ نئی دنیا کا نظامِ تمدن بڑی حد تک اسلام کے زیرِ اثر آسکتا ہے۔

کیا ذوالقرنین سکندرِ مقدونی ہی؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

جولائی ۱۹۴۱ء کے برہان میں میرا ایک مضمون "ذوالقرنین اور سدِ سکندری" کے عنوان سے شائع ہوا تھا یہ مسلسل مضمون کی پہلی قسط تھی اور اگست کے برہان میں بھی ابھی تک وہ سلسلہ ناتمام ہی تھا کہ محترم مدیر صاحب صدق نے پہلی قسط پر ایک "استدراک" لکھکر برہان کی عزت افزائی فرمائی اور مجھکو اس سلسلہ میں مزید لکھنے کا موقعہ مرحمت فرمایا، جس کیلئے میں صاحبِ موصوف کا ممنون ہوں۔

"یہ" استدراک برہان کی اشاعت سے قبل ہی ۴ راگست کے صدق میں قدرے اضافہ کے ساتھ طبع ہوگیا اور اب ۱۸ راگست کے صدق میں بھی "سدِ سکندری" کے عنوان سے اسی کا ایک تکملہ یا ذیل شائع ہوا ہے۔

بہرحال اگست کے برہان میں جو "استدراک" شائع ہوا ہے چونکہ وہی اصل ہی اور صاحب استدراک کے دلائل کا حامل، اسلئے "تنقید بر استدراک" کی بنیاد بھی اسی پر قائم کی گئی ہے اور صدق کے ہر دو مضامین کے "اضافات" کو ضمنی طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہی۔

(محمد حفظ الرحمٰن)

"ذوالقرنین" کی تحقیق سے متعلق میرا مضمون تحلیل و تجزیہ کے بعد دو حصوں پر تقسیم ہوسکتا ہی ایک مسئلہ کا "اثباتی پہلو" اور دوسرا "منفی پہلو"۔ اثباتی پہلو میں مضبوط دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا گیا ہی

کہ سائرس (کیخسرو یا خورس) ہی وہ شخصیت ہے جسکو قرآنِ عزیز نے "ذوالقرنین" کہکر یاد کیا ہے۔ اور "منفی پہلو" میں ان اقوال کو مرجوح قرار دے کر جو "سائرس" کے علاوہ "ذوالقرنین" کا مصداق متعین کرتے ہیں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ قرآنِ عزیز میں منصوص اور مصرح مذکور نہیں ہو اسلئے دوسری ہستیوں کے متعلق بھی مجالِ گفتن باقی رہتی ہے لیکن ذوالقرنین سے متعلق قرآنی صفات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر قطعی ہے کہ "سکندرِ مقدونی" کسی حالت میں بھی "قرآن کا ذوالقرنین" نہیں کہلایا جاسکتا اور بعض علماءِ حق نے اگر اس کو ذوالقرنین بتایا ہے تو سلفِ صالحین اور خلفِ صادقین کی اکثریت نے ان کے اس قول کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے اور ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

علماءِ اسلام نے جن دلائل کی روشنی میں اس انکار پر اصرار کیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ زیرِ بحث مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ لیکن محترم "صاحبِ استدراک" نے ان میں سے صرف تین باتوں کو منتخب فرما کر ان پر "استدراک" سپردِ قلم فرمایا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ترتیب وار "تنقیدی نظر" ڈالی جائے تاکہ مسئلہ زیرِ بحث بخوبی منقح ہو سکے۔ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

مقالہ مذکور مندرجہ برہان بابت جولائی ۱۹۶۱ء میں ذوالقرنین کے سکندرِ مقدونی ہونے سے انکار دلائلِ ذیل کی بنا پر کیا گیا ہے۔

(۱) "سکندر مقدونوی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا"

(۲) "سکندر باتفاق اصحابِ تاریخ جابر و قاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس"

(۳) "یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا" (ص۱۵ و ۱۶ رسالہ مذکورہ)

عرض کرنے دیجئے کہ یہ تینوں دعوے مسلمات نہیں، بجائے خود مخدوش و مجروح ہیں۔

اس کے بعد "صاحبِ موصوف" نے ان تینوں دلائل یا دعاوی کو "مخدوش" اور "مجروح" ثابت کرنے کے لئے بالترتیب دلائل پیش فرمائے ہیں۔ چنانچہ مضمون نگار کی پہلی دلیل کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد ہے۔

(۱) "نزولِ قرآن سے قبل والا ذوالقرنین ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی میں تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا اس کے مومن ہونے سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہو کہ موحد (مسلم) اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا۔ (برہان ماہ اگست)

مسلم؟ | مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ "صاحبِ استدراک" کا سکندر کے مسلمان ہونے کی بحث میں یہ فرمانا "کہ اصطلاحی معنی میں تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ اصطلاحی معنی میں صرف وہی شخص "مسلمان" کہلایا جا سکتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہو اور دوسرے کسی نبی کی امت کو "مسلم" نہیں کہہ سکتے تو ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح "قرآن کی اصطلاح" نہیں ہے کیونکہ وہ صاف یہ اعلان کرتا ہی کہ آدمؑ سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک خدا کے ہر نبی و رسول کا دین "اسلام" ہے اور اس کی اُمتِ اجابت "امتِ مسلمہ" ہے اور اس کا سچا مطیع "مسلمان"۔

ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب	کیا تم اس وقت موجود تھے جب
الموت اذ قال لبنیہ ما تعبدون	یعقوبؑ کی وفات کا وقت آپہنچا، اس
من بعدی قالوا نعبد الٰھك	نے اپنی اولاد سے کہا میرے بعد تم کس
والٰہ آبائك ابراھیم واسمٰعیل	کی پرستش کروگے؟ انھوں نے جواب دیا

واسحٰق الٰهًا واحدًا ونحن له	ہم تیرے اور تیرے باپ ابراہیم اسمٰعیل
مسلمون ۔	اور اسحٰق کے ایک خدا کی پرستش کرینگے
(بقرہ)	اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں ۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ۔

والاسلام هو ملة الانبياء قاطبة وان	اور "اسلام" یہی تمام انبیا علیہم السلام
تنوعت شرائعهم واختلفت مناً	کی ملت ہے بلا تخصیص، اگرچہ ان کی
هجهم ۔ (تفسیر جلد ا ص۳۲۴)	شریعتیں اور ان کے طریقے مختلف ہیں ۔

اور اگر "صاحبِ استدراک" کی مراد اصطلاحی معنی سے یہ ہے کہ سکندر اگرچہ موحد اور مسلم تو تھا مگر چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اسلئے عرفِ عام میں "مسلمان" نہیں ہو سکتا تو گستاخی معاف پھر اس کیلئے "اصطلاحی معنی" کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس ارشاد کی یہاں کوئی ضرورت تھی جبکہ متکلم اور مخاطب دونوں پر یہ عیاں ہے کہ یہ اس سکندر کا ذکر ہے جو تقریباً تین سو سال قبل مسیح تھا ۔

آگے چل کر "صاحبِ استدراک" ارشاد فرماتے ہیں ۔

سو روایاتِ یہود میں سکندر کو اسی حیثیت سے (یعنی موحد اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا) پیش کیا گیا ہے چنانچہ جوزیفس (یہ حواریانِ مسیح کا ہمعصر ہے) کی قدیم تاریخ یہود میں بصراحت موجود ہے کہ سکندر نے ہیکل یروشلم میں آ کر وہاں عبادت کی ۔ وہاں کے پیشواؤں کی تعظیم و تکریم کی اور جب دانیال کی یہ پیشینگوئی اُسے دکھائی گئی کہ ایک رومی فاتح ایران کی شہنشاہیت کو برباد کردیگا تو وہ اس پیشگوئی کا مصداق اپنے ہی کو سمجھا ۔ "جیوش انسائیکلوپیڈیا میں تصریح لکھی چلی آتی ہے کہ اس وقت کے یہود اُسے مسیح موعود ماننے کو تیار تھے ۔ (جلد ۸ ص۵۰)

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی مشرک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا تھا اور نہ کوئی مشرک فرمانروا

خود یہ معاملہ مرکز توحید کے ساتھ روا رکھتا۔ (برہان ماہ اگست)

"موحد" اور "مسلم" کی غلط تشریح کے علاوہ صاحب استدراک نے سکندر کو اس کا مصداق ثابت کرنے میں جو سند اور دلیل پیش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے اسلئے کہ "صاحب استدراک" کے اس ارشاد میں ایک دعویٰ ہے اور دوسری اس کی دلیل، دعویٰ یہ ہے کہ "روایاتِ یہود میں" سکندر کو موحد اور اسرائیلی نبی کے مطیع کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ قدیم "تاریخِ یہود" کے مصنف جوزیفس (جو کہ حواریانِ مسیح کا ہمعصر ہے) نے سکندر کے متعلق وہ سب کچھ لکھا ہے جو صاحب استدراک کی عبارت سے ابھی نقل ہو چکا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے مسلمان (موحد) ہونے کا زبردست شاہد جوزیفس ہے۔ اور جوزیفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود یہود کے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں۔

جوزیفس؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جوزیفس "یہود کے نزدیک" غیر معتبر، غیر مستند اور ناقابلِ احتجاج واعتماد ہے اور اس کی کتاب "قدیم تاریخ یہود" ان میں غیر مقبول ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوزیفس میں دو خرابیاں ہیں جو کسی طرح یہود کی روایات کی صحت باقی نہیں رہنے دیتیں ایک یہ کہ وہ "مورخ" نہیں ہے بلکہ داستان سرا اور قصہ گو ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اس درجہ جھوٹا ہے کہ واقعات کو طبعزاد گھڑ کر بیان کر دینے اور اصل واقعہ میں اپنی جانب سے من گھڑت اضافے کرنیکا عادی ہے۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے درمیان جو نفرت قائم تھی اس کو کسی طرح مٹائے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا کرے اس لئے وہ یونانی و رومی روایات میں خصوصیت کے ساتھ ایسی داستانیں اختراع اور ایجاد کرتا رہتا اور ان کو تاریخی حیثیت میں پیش کیا کرتا تھا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرے۔ اس لئے یونانیوں سے متعلق جسقدر روایات وہ بیان کرتا ہے خصوصیت کے ساتھ وہ قطعاً ناقابلِ اعتماد ہیں اور کسی طرح لایقِ احتجاج نہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ جوزیفس نہ تو اعلیٰ درجہ کا مورخ ہے اور نہ ایک ایماندار اور بے تعصب محقق جسے صرف حقیقت کی تلاش ہو بلکہ وہ ایسا مصنف ہے جس کی غرض و غایت صرف ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہے۔ (جلد ۷، ص ۵۷۶)

جوزیفس کا مقصد اور منتہائے نظر کیا ہے؟ آگے چل کر اسی کتاب میں اس کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

اس کی منتہائے تمنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جو تعصب پھیلا ہوا ہے اسے دور کرے اور ان پر جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان سے ان کو بری ثابت کرے اور یہودیوں اور یونانیوں کے درمیان پیدا شدہ دشمنی کو مٹا دے۔ (جلد ۷، ص ۵۷۶)۔

جوزیفس کا یہ مقصد برا نہیں تھا اگر تاریخی حقائق پر مبنی ہوتا اور صحیح واقعات کی روشنی میں اُسکو کامیاب بناتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس یہ کیا۔

اس کا یہ حمایتی مقصد اس امر سے بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ماخذوں کا انتخاب کرتا ہے اور ایسے ٹکڑوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں یہودیوں کے ساتھ قدیم بادشاہوں اور رومیوں کے الطاف و اکرام کا تذکرہ ہے وہ صداقت کو اپنے میلان اور رجحان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا ہے اگرچہ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حقیقت اور مکمل حقیقت کے سوا کچھ نہیں لکھیگا لیکن وہ ایفاءِ وعدہ نہیں کر سکا۔ اسلئے کہ (وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرنے کے لئے) کہیں تو بعض چیزوں کو قصداً قلم انداز کر جاتا ہے اور کہیں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے اور جگہ جگہ نہایت بے پرواہی اور بے ضابطگی کے ساتھ ماخذوں کے حوالے دیتا ہے۔۔

(جلد ۷، ص ۵۷۶)۔

جوزیفس کی تاریخی بددیانتی کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مقصد

کی تکمیل کیلئے اپنی مقدس کتاب بائبل کے واقعات کو بھی توڑ مروڑ کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ بائبل کے واقعات بھی کبھی کبھی اس کے قلم سے بالکل نئے معنی اور نئے پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ (انسائیکلوپیڈیا ریلیجین ص ۵۷۴ ج ۷)۔

جوزیفس کی اس غیر مورخانہ روش اور بددیانتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخی تصانیف کو خود اپنی قوم "یہود" میں بھی مقبول نہ کر سکا اور اُن میں بھی اپنا اعتماد کھو بیٹھا۔

اس کی تاریخی تصانیف اُس کی قوم میں سب سے کم مقبول ہوئیں، اس کی قوم اس کو بیوفا اور غدار سمجھتی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا ریلیجین جلد ۷، ص ۵۷۷)

یروشلم اور سکندر

اور یہ واضح رہے کہ "جیوش انسائیکلوپیڈیا" کا مضمون بھی اسی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ جوزیفس کے متعلق یہ حوالجات تو اس کی عام مورخانہ حیثیت اور اس کی تاریخی کتابوں کی قدر و قیمت سے متعلق تھے۔ اب ریلیجین انسائیکلوپیڈیا کی زبانی اُن واقعاتِ خصوصی کی حقیقت کو بھی سن لیجئے جن کو "صاحبِ استدراک" نے سکندر کے موحد اور مسلمان ہونے کی دلیل میں ذکر فرمایا ہے (یعنی اس کا یروشلم میں جانا، جا کر عبادت کرنا، اور یہودی پیشواؤں کی تعظیم کرنا وغیرہ)۔

ایستر (Esther) کی کتاب اور عہد ارتاسرزز (ARTAXERXES) کے تذکرہ کے بعد جوزیفس جب قصصِ تورات کے آخری حصہ پر پہنچتا ہے تو اسی جگہ سے اس کی کتاب انٹی کوٹیٹیس جوڈیکیو (Antiquitates Judaeae) کے دوسرے باب کا آغاز ہوتا ہے اس باب کے شروع ہی میں تاریخی روایات کا تسلسل جاتا رہتا اور ان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو "مکابین بغاوت" (Maccabaean Revolt) کے دور تک برابر قائم رہتا ہے اور تین صدی تک چلا جاتا ہے اور اسی کے اندر سکندر مقدونی، ٹولمی اور سلیوسیا نڈز (Seleucidae) وغیرہ کے عہدِ حکومت بھی آجاتے ہیں۔ ان دور ہائے

حکومت کے متعلق جوزیفس صرف بے ربط قصے بیان کرتا ہے جو سکندر کے آخری دور کے
ماخذ سے لئے گئے ہیں، اس غیر مسلسل اور بے ربط سلسلہ کی سب سے پہلی چیز اسکندر کا یروشلم
جانا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام واقعات بھی ہیں جو اس کے وہاں جانے سے پہلے اور جانے
کے بعد سے وابستہ ہیں کیونکہ یہ واقعہ جوزیفس نے ایک ایسے ماخذ سے لیا ہے جو غیر معتبر اور غیر موثق
ہے اور "دانیال نبی کی کتاب" کے بعد کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ
ایتھکس جلد ۷ صفحہ ۵۷۲)

یہ حقیقت ہے اس حوالہ کی جو جیوش انسائیکلوپیڈیا سے نقل کر کے "صاحبِ استدراک" نے ایسے
اہم تاریخی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہاں یہ من گھڑت اور بے دلیل قصہ جس کا ماخذ تک غیر معتبر اور
غیر مستند ہے اور کہاں سائرس کے یروشلم بنانے اور خدا کے مسیح ہونے کے وہ ناقابل تردید تاریخی واقعات
جو کتابِ مقدس اور صحیح تاریخی حوالوں سے ثابت ہیں۔

بہر حال جوزیفس، اس کی کتبِ تاریخ اور اس کے تاریخی ماخذوں کے متعلق مسطورہ بالا
محققانہ حوالجات کے بعد اب خود کتابِ مقدس کی طرف رجوع کیجئے اور معلوم کیجئے کہ داستان سرا اور
قصہ گو جوزیفس کی یروشلم والی داستان اور یہود کا سکندر کو مسیحِ موعود مان لینے کا قصہ یہ دونوں کیا
حقیقت رکھتے ہیں؟

خدا کا مسیح؟ ابھی بابل کے بادشاہ بخت نصر (نبوکدرزار) نے بیت المقدس پر چڑھائی نہیں کی تھی کہ حضرت
یسعیاہ نبی (علیہ السلام) نے وحی الٰہی سے خبر پاکر یہود کو مطلع کیا کہ وقت آنے والا ہے کہ بابل کی حکومت
کے ہاتھوں یروشلم کا ہیکل برباد ہوگا اور اس کی توہین کی جائے گی اور اس کے بعد یہ بشارت سنائی کہ
وہ پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں بنایا جائے گا اور اس کی عزت و حرمت برقرار کی جائیگی اور یہود
بابل کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے چنانچہ پیش گوئی کے الفاظ یہ ہیں۔

خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے . . . . .

. . . . یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائیگی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کرونگا، جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائیگی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۳ - ۲۸۔

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں . . . . . .

. . . . اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دونگا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جسنے تیرا نام لیکے بلایا ہے (باب ۴۵ آیت ۳۱)

حضرت یسعیاہ نبی کی یہ پیشگوئی خورس (سائرس) کے فتح بابل سے ایکسو ساٹھ برس پہلے یہود کو سنائی گئی اور فتح بابل کے صرف ساٹھ برس پہلے اسی کی تائید میں حضرت یرمیاہ نبی نے یہود کو یہ پیشگوئی سُنائی تھی۔

وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا۔ تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو، منادی کرو، مت چھپاؤ، لکھو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا، مردوک سراسیمہ کیا گیا ہے اس کے بُت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیونکہ اُتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اُجاڑ کریگی الخ یرمیاہ باب ۵۰ آیت ۱ - ۳۔

اور عزرا نبی کی کتاب میں بصراحت موجود ہے کہ خورس (سائرس) نے یروشلم کے ہیکل کو تعمیر

کیا اور اس نے اس کی تعمیر اور عزت وحرمت کا اپنی قوم میں اعلان کرایا اور اس طرح یرمیاہ نبی کی بشارت پوری ہوئی۔

اور شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہِ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کیلئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے ۔ عزرا باب آیت ۱-۳۔

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کی پیشگوئیوں سے اور عزرا نبی کی کتاب میں اس بیان کردہ منادی کی "جو خورس (سائرس) کی جانب سے کی گئی" تین باتیں صاف اور صریح طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) توراۃ کی پیشگوئیاں خورس کو خدا کا چرواہا اور خدا کا مسیح بتا رہی ہیں نہ کہ سکندر کو۔

(۲) یروشلم (بیت المقدس) کے ہیکل کی تعمیر اُس کی عزت وحرمت کا اعلان، اس کے خدا کے گھر ہونے کا اقرار اور یہود کی آزادی، خورس (سائرس) کے ہاتھوں ہوئی نہ کہ سکندر کے۔

(۳) یرمیاہ نبی کی پیشگوئی میں اگرچہ نام نہیں ہے لیکن یہ تصریح ہے کہ بابل کا تباہ کرنیوالا اور یروشلم کو آباد کرنے والا اُتر (شمال) سے اٹھیگا سو یہ فارس ومیڈیا کا بادشاہ خورس ہی ہو سکتا ہے نہ کہ سکندر جو یونان سے (بابل کی جانب مغرب سے) اٹھا۔ اور عزرا نبی کی تصدیق بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

(۴) ان تمام پیشگوئیوں کا اتفاق ہے کہ خورس کی فتوحات جابرانہ وقاہرانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ایک صالح اور باخدا انسان کی حیثیت سے تھیں اور کتابِ مقدس کے ان صاف اور صریح بیانات کے

علاوہ تاریخی حقائق بھی ان نتائج کی زبردست تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سائرس کے متعلق یہ تصریحات موجود ہیں۔

"بابل پر جب سائرس حملہ آور ہوا تو وہاں کے یہودیوں نے ایرانیوں کو نجات دہندگان اور موحدین کہکر پکارا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ان کی مدد کے صلہ میں سائرس نے یہودیوں کو یروشلم اور انکا معبد (ہیکل) واپس کردیا اور انھیں فلسطین لوٹنے کی اجازت دیدی۔ (جلد ۶ ص ۷۵۲ ایڈیشن ۹)۔

اب کتاب مقدس اور اس کے ان روشن تاریخی حوالوں پر نظر کیجئے اور پھر جوزیفس کی اس بددیانتی کی داد دیجئے کہ اس نے یروشلم کی تعمیر، علماء یہود کی تعظیم و تکریم، اور خدا کے مسیح کے ہاتھوں یہود کی بابل سے نجات کے تمام ان معاملات کو جو کتاب مقدس نے خورس (سائرس) کیلئے مخصوص کئے تھے کس جرأت کے ساتھ سکندر مقدونی پر اس غرض سے چپاں کردیئے کہ کسی طرح اس کا یہ مقصد "کہ یہودیوں اور یونانیوں اور رومیوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو پاٹ دیا جائے" پورا ہوجائے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور یہودیوں نے ان تحریفات کی بنا پر (جیسا کہ ابھی حوالہ گذر چکا ہے) اس کو خائن اور غدار کہکر اس کی تاریخی کتابوں کو بھی غیر مقبول قرار دیدیا۔ اور اگر ہم بالفرض سکندر کے معاملہ زیر بحث میں جوزیفس کی روایت کو صحیح بھی مان لیں تو اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتی ہے (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) کہ سکندر کی یہ عادت تھی کہ جس ملک کو فتح کرتا وہاں کی پبلک کو اپنا بنانے کے لئے ملکی رسم و رواج کے مطابق عبادت کرکے یہ ثابت کرتا کہ مجھ کو بھی ان عقائد و عبادات سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ اس ملک کے رہنے والوں کو، پھر کیا عجب ہے کہ یہودیوں کو متاثر کرنے کی خاطر اس نے یروشلم میں بھی یہ ڈھونگ رچایا ہو، یا سائرس کی نقل اتار کر یہودیوں میں "ذوالقرنین" بننے کی کوشش کی ہو اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔

چنانچہ بستانی کی انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ سکندر جب مصر پہنچا تو لیبیا کے کاہنوں اور باشندوں کو خوش کرنے کیلئے ان کے معبود (مشتری) کی پرستش کی (ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۵۴۶)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

"بابل میں سکندر نے وہاں کے مقامی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جیسا کہ اس نے دوسری مقامات پر بھی اسی طرح کیا تھا۔ (یعنی مقامی دیوتاؤں کی پرستش کی تھی) اور یہ تمام ملکوں کے مذاہب کی آمیزش آگے چل کر یونانی الحاد و بیدینی پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ (جلد ۱۵ ص ۱۴۱ ایڈیشن ع ۹)۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ کتابِ مقدس کی مسطورہ بالا پیشگوئیوں کی صحت پر بعض عیسائی مورخوں نے شبہ ظاہر کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ پیشگوئیاں جن میں خورس کا نام تک مذکور ہے واقعات کے وجود پذیر ہونے کے بعد بنا لی گئی ہوں۔ لیکن اول تو اپنے اس دعوی یا شبہ پر انھوں نے قیاس و تخمین کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی۔ دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بابل کی غلامی کے دور، اور بخت نصر کے توراۃ جلا ڈالنے کے واقعۂ ہائلہ کے بعد کے اس قسم کے تمام ذخیرے کے متعلق علماء یہود و نصاریٰ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ یہ اضافات و تحریفات سے محفوظ ہیں اور ان میں ردو بدل کیلئے کوئی سبب وجود پذیر نہیں ہوا۔ یعنی توراۃ کے قدیم حصہ کی طرح اس پر کوئی حادثہ نہیں گذرا۔ مگر علماء یہود و نصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ان پیشگوئیوں میں خورس کے نام کی تصریح بعد کو داخل کر دی گئی یا ان پیشگوئیوں کو واقعات کے مطابق بنا لیا گیا تب بھی ہمارا مطلب حاصل ہے اسلئے کہ ان پیشگوئیوں سے یہ بات تو بغیر کسی خدشہ کے ثابت ہو گئی کہ یہودیوں میں "خورس کے یروشلم تعمیر کرنے، یہود کو آزاد کرانے، اور مذہبِ یہود کی عظمت کرنے اور یہود کا اس کو خدا کا مسیح سمجھنے کی روایات کو اس درجہ تواتر حاصل تھا کہ "شبہ کرنے والوں کے بقول" یہودیوں نے سائرس کے ساتھ خوش اعتقادی کی وجہ سے ان ثابت شدہ حقائق کو کتابِ مقدس میں وحی الٰہی کی بشارات بنا ڈالا۔ لیکن اس کے برعکس سکندر مقدونی کو کسی طرح یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

بہر حال کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یروشلم سے متعلق جن واقعات کو صدیوں تک کتابِ مقدس

اور یہودیوں کی متواتر روایات میں خورس (سائرس) سے وابستہ ظاہر کیا گیا وہ چار سو برس کے بعد یک بیک جوزیفس کی زبانی سکندر کے حق میں ہو جاتی ہیں۔ "اِنَّ ھٰذَا الشیئُ عُجَاب"۔

سکندر مشرک تھا

سکندر کے مذہب کا ذکر اگرچہ پہلے گذر چکا ہے مگر آپ کو یہ سنکر حیرت ہو گی کہ وہ صرف دیوتاؤں کی پوجا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اس درجہ مغرور و متکبر تھا کہ یونان اور ایاسیابان کے لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا اور اپنے تئیں معبود کہلاتا تھا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی ج۳ ص۵۴۷)

اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

جب سکندر باختر (Bactra) لوٹ آیا اور اوکزیارٹس کی بیٹی روکزانا (Roxana) سے شادی کی، تو شادی کی دعوت کے موقعہ کو غنیمت جان کر اس نے اپنے یونانی اور مقدونی پیرووں سے اپنی خدائی کا اعتراف کرانا چاہا۔ (۱ج جلد ص۴۸۲)

اور مشہور محدث حافظ عماد الدین بن کثیرؒ نے بھی اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں بروایت قتادہؒ سکندر (ذوالقرنین) اور سکندر بن فیلپ میں فرق کرتے ہوئے سکندر مقدونی کو مشرک کہا ہے (ج۲ ص۱۰۶)

اسی طرح حافظ ابن حجرؒ نے بھی امام رازیؒ کے قول کو بطور سند پیش کرتے ہوئے سکندر مقدونی اور اس کے وزیر ارسطاطالیس دونوں کو کافر کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جدید اڈیشن ج۶ ص۲۹۶)

اور اسلام کے ان جلیل القدر ائمہ دین کی مزید تائید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مقالہ نگار لکھتا ہے

"جب سکندر دریائے ستلج کے کنارہ پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو دریا کے عبور کرنے کا حکم دیا لیکن فوج نے عبور کرنے سے انکار کر دیا اس پر سکندر نے اپنے افسروں کے سامنے مزید فتوحات کی اسکیم پیش کی لیکن یہ بے سود ثابت ہوا تب سکندر نے حسب دستور دریا کے سامنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) دیوتاؤں کی اجازت نہ سمجھتے ہوئے پیشقدمی سے باز آیا اور واپس لوٹ گیا۔ (ج۱ ص۴۸۴)

اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن میں ہے کہ جوزیفس کی زبانی اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید سکندر

یروشلم گیا تھا اور اس نے یہود کے ساتھ خصوصی مراعات بھی کیں اور محکمہ خبر رسانی میں ممتاز درجے بھی دیئے اور اس طرح یونانیوں اور یہودیوں میں ایک علاقہ قائم ہو گیا۔" تاہم یہ محقق ہے کہ یہودیوں نے ان کے کلچر اور ان کے عقائد و رسوم کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا اور وہ ہمیشہ ان کو اس حیثیت سے نفرت و حقارت ہی سے دیکھتے رہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ "یہودی قوم سختی کے ساتھ توحید کی قائل تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ۔" اور یہی وجہ ہے کہ یونانیت اور یہودیت میں کبھی اتصال نہ ہو سکا (ص ۳۰۹ ج ۱)

اور بستانی لکھتا ہے کہ سکندر مقدونی نے وفات کے وقت جو وصیت کی وہ یہی تھی کہ اس کو بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔

ثم لما رأی ان لا رجاء له بالشفاء و ان ساعته دنت نزع خاتمه من اصبعه و سلمه الی الامیر بردیکاس و اوصاه ان ینقل جثته الی هیکل المشتری لوا حات سیوة لیدفن هناك بین الاصنام (ص ۲۱۵ ج ۳)	پھر جب سکندر نے دیکھا کہ اب زیست کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور اس کی موت کا وقت قریب آ لگا تو اس نے اپنی انگلی سے شاہی مہر نکال کر اپنے امیر بردیکاس کو دی اور اسکو وصیت کی کہ مجھکو سیوہ کے اطراف میں مشتری دیوتا کے ہیکل میں بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔"

اب ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ "مضمون نگار" کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔"

یا "محترم صاحب استدراک" کا یہ ارشاد کہ "یہ دعویٰ (کہ سکندر مشرک تھا) بجائے خود مخدوش و مجروح ہے۔" اور یہ بھی انصاف طلب بات ہے کہ "صاحب استدراک" کے اس حوالہ کی "جو کہ جوزیفس کی "قدیم تاریخ یہود" سے دیا گیا ہے" محققین مورخین بلکہ کتاب مقدس کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے؟ کہاں مدلل واقعات و حقائق اور کہاں محض ظن و تخمین۔ ؎ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

سکندر کا ظلم و جبر

"محترم صاحب استدراک" مضمون نگار کے دوسرے دعوی کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"سکندر کا جابر و قاہر ہونا مسلم نہیں بہت کچھ مختلف فیہ ہے۔ تاریخ میں دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں کم از کم شک کا فائدہ تو اُسے ملنا ہی ہے" (برہان ماہ اگست)

اس سلسلہ میں عرض کرنے دیجئے کہ قدیم و جدید مسلم اور عیسائی مورخین نے سکندر کی جو سیرت پیش کی ہے بحیثیت مجموعی ان سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ جابر و قاہر تھا اور اس کو نیک سیرت اور صالح بادشاہ نہیں کہا جاسکتا۔ لہذا کم از کم ایک قول تو ایسا تحریر کیا جاتا جس میں اسکو نیک، عادل اور صالح تسلیم کیا گیا ہو۔ رہی یہ بات کہ اس کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی عدل یا رحم کا موجود نہیں ہے تو اس کا انکار تو کوئی بھی نہیں کرسکتا مگر ان چند گنتی کے واقعات سے کسی کی سیرت، عادل، رحیم اور صالح نہیں کہی جاسکتی۔ ورنہ تو پھر چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور حجاج بن یوسف کو بھی یہی مقام دیا جانا چاہیے۔

سکندر کی جابرانہ حیثیت کا اندازہ ان چند حوالوں سے کیا جاسکتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے۔

"درحقیقت اس کے دماغ کا توازن شروع ہی سے بگڑ گیا تھا۔ یہ ظالم اور جابر انسان جو اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا جو اپنے دوست کے سینہ میں برچھی گھونپ کر مسرور ہوتا تھا، جو ایک دوسرے دوست کو سخت ترین جسمانی ایذا پہنچا کر اس کی چیخ پر حقارت آمیز انداز میں متبسم ہوتا تھا وہ ایک عادل دماغ فرمانروا اور مدبر ہونے سے بہت دور تھا (ص ۴۸۵ ج ۱)

"ہر شخص اس سے حد درجہ خوشامدانہ انداز میں بات کرنے پر مجبور تھا۔ پلوٹارک Plutarch لکھتا ہے کہ اسکو اپنی پرانی عادت یعنی انسانوں کا شکار کرنے میں بڑی تسلی و تشفی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔" (ص ۴۸۵ ج ۱)

"آخر کار وہ پسر گیڈا (Pasargadae) پہنچا اور سائرس کی قبر کا پتہ لگا کر اُسے کھدوایا اور لوٹا اور اس کی توہین کی" (جلد ا صفحہ ۴۸۴)

"(قابض ہوجانے کے بعد) پسر گیڈا میں اسکو بیشمار دولت مال و اسباب ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک کرور بتیس لاکھ پونڈ کے قریب کیا جاتا ہے اس دولت کو لوٹنے کے بعد اس نے شہر کے تمام مردوں اور اولاد

ذکور کو تہ تیغ کر دیا اور عورتوں اور اولادِ اُناث کو باندیاں بنالیا (ص ۲۸۶ ج ۱)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے علاوہ بُستانی اور وہ تمام مسلمان مورخین جو اس کو زبردستی "ذوالقرنین" بنانے پر آمادہ نہیں ہیں سکندر سے متعلق اسی قسم کی روایاتِ جبر و قہر بیان کر رہے ہیں پس ضرورت تھی کہ ان روایات کے مقابلہ میں کسی محقق مورخ کی ایک روایت ایسی بھی سامنے آجاتی جو تخمین و قیاس سے جدا تاریخی روشنی میں اس کو نیک، صالح اور عادل بادشاہ ثابت کر سکتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور تمام ذخیرۂ تاریخ اس سے یکسر خالی ہے۔

رہا "شبہ کا فائدہ" تو اول تاریخی حقائق کے بعد شبہ کے فائدہ کا سوال ہی کیا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو زیادہ سے زیادہ یہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے کہ سکندر کو جابر و قاہر کہنے میں سکوت اختیار کیا جائے نہ کہ یہ فائدہ کہ ایسی ہستی کو "جس کا نیک، صالح اور عادل ہونا تک مشتبہ" ہو، قرآنِ عزیز کا ذوالقرنین بنا دیا جائے "کہ جس کی منقبت میں قرآنِ عزیز رطب اللسان ہے" اس کو تو بلا شبہ تاریخی صحائف میں روزِ روشن کی طرح صالح و عادل ثابت ہونا چاہیے۔

سکندر کا مغرب کی طرف اقدام

تیسری بات "مضمون نگار" نے یہ کہی تھی کہ سکندر کی تاریخی مہمات کے متعلق یہ مسلّمات میں سے ہے کہ وہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا" چنانچہ "صاحبِ استدراک" اس کو بھی مخدوش و مجروح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"سکندر کی ابتدائی فتوحات تاریخ کو مسلّم ہے کہ شمال و مغرب ہی کی جانب حاصل ہوئی تھیں" (برہان، ماہ اگست)

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سکندر کی شمالی جانب میں فتوحات کا انکار تو "مضمون نگار" نے بھی نہیں کیا البتہ "مغربی جانب میں سلسلۂ فتوحات و سیاحت کے بڑھنے" کا ضرور انکار کیا ہے۔ "صاحبِ استدراک" اس کی تردید میں ارشاد فرماتے ہیں "اور مقدونیہ کے کنارے مغرب میں ہی وہ جھیل ہے جس کا پانی اتنا گندہ ہے کہ سیاہی مائل ہو گیا ہے اور وہیں سورج ڈوبتا نظر آتا ہے" وجدها تغرب فی عین حمئۃ "کا پورا مصداق" (برہان اگست)

مگر یہ دلیل "کوہ کندن وکاہ برآوردن" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اسلئے کہ "مضمون نگار" کا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا کہ سکندر، کہ جس نے شمال اور مشرق میں ہزارہا میل تک زبردست فتوحات حاصل کیں اور ملکوں اور شہروں کو مسخر کیا وہ مغرب کی جانب اپنے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ تک بھی نہیں گیا۔

پس اس جھیل تک سکندر کا پہنچنا جو مقدونیہ کے کنارے ہی پر ہے ایسی کونسی عظیم الشان مہم تھی جسکا ذکر قرآنِ عزیز نے اس اہمیت کے ساتھ کیا ہے اور جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مغربی مہم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ذوالقرنین کے مرکزی دارالسلطنت سے سینکڑوں یا ہزاروں میل دور اس حد پر پہنچ گئی تھی جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مقدونیہ کے کنارہ کی جھیل اوکریڈا جس جگہ واقع ہے وہاں تو صبح وشام خدا کی ہزاروں مخلوق کا شب و روز ہی گذر ہوتا رہتا تھا اور وہ مغرب کے کسی آخری حصہ میں بھی واقع نہیں ہے بلکہ اطراف وجوانب کے شہروں اور ملکوں کے درمیان واقع ہے۔ تو یہ کون سی ایسی جگہ تھی جسکا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے "حتی اذا بلغ مغرب الشمس وجدھا تغرب فی عین حمئۃ" پس محض جھیل کے پانی کے گندہ اور سیاہی مائل ہونے کی وجہ سے یہ جھیل کسی طرح بھی قرآنِ عزیز کی اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتی۔

چنانچہ مفسرین قرآن باتفاق اس آیت کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے یعنی ذوالقرنین مغرب کی جانب دور تک بڑھتا ہوا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے، البتہ سمندر کا وہ حصہ ایسا تھا جہاں پانی گدلا اور سیاہ ہو گیا تھا اور سورج غروب ہوتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا سیاہ گدلے چشمہ پانی میں ڈوب رہا ہے۔

چنانچہ سید محمود آلوسی "بلغ مغرب الشمس" کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ای منتھی الارض من جھۃ المغرب (جلد ۱۶) "یعنی مغرب کی جانب میں زمین کے آخری حصہ تک جب پہنچا" اور محدث ابن کثیر، ابن جریر، امام رازی اور قدیم وجدید تمام مفسرین یہی تفسیر بیان فرما رہے ہیں

پس "صاحبِ استدراک" کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ مقصد کے منافی ہے۔

درحقیقت اس آیت کا مصداق یہ ہے کہ ذو القرنین مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا جب تمام ایشیارِ کوچک کو بحر شام سے بحرِ اسود تک قبضہ میں کر چکا تو وہ آگے بڑھتا ہوا مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ نقشہ میں دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل میں چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہوگئے ہیں اور بحرِ ایجین کے ساحلی مقام پر جاکر یہ گہرے سیاہ رنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ساحل پر کھڑے ہونیوالے کو سورج اس کے اندر ڈوبتا نظر آتا ہے اور مغربی ساحل کی یہ مہم "سائرس" ہی کو نصیب ہوئی ہے سکندر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب "صاحبِ استدراک" چاہتے ہیں کہ اُسے گھر بیٹھے ہی مقدونیہ کے کنارہ اس خوش قسمتی کا مصداق بنا دیں مگر یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔

نیز "صاحبِ استدراک" آرکیڈا جھیل کا جائے وقوع مناستر سے پچاس میل مغرب میں (یوگوسلاویہ) ہیں تاکہ اگرچہ اسکا بُعدِ مسافت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں مگر بہرحال یہ وہ سکندر کے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ ہی۔

یہ ہیں وہ خدشات اور اسبابِ جرح جو "صاحب استدراک" نے تکلیف گوارا فرماکر "مضمون نگار" کے تین مسلمات پر عائد فرمائے ہیں اب قارئینِ کرام بنظرِ انصاف خود غور فرمائیں کہ تاریخ کی روشنی میں "مضمون نگار" کے "مسلماتِ ثلثہ" صحیح ہیں یا صاحبِ استدراک کے "خدشات و جرح" درست ہیں؟ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ

اسکے بعد "صاحبِ استدراک" یہ تحریر فرماتے ہیں۔ "جزم کے ساتھ کسی کی بھی تعیین کرنا دشوار ہے اسلئے کہ قرآنِ مجید کی بتائی ہوئی علامات کا مصداق تمام تر اب تک کوئی نہیں ملا ہے" (برہان ماہ اگست)

مضمون نگار نے بھی ذو القرنین کی تعیین پر بحث کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اس سب کچھ لکھنے کے بعد بھی بحث و تمحیص کا دروازہ بند نہیں ہے مگر پھر تعجب یہ ہے کہ ایسی صورت میں "صاحبِ استدراک" کو مضمون نگار کے مضمون کی فوری تردید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ تو صاحبِ استدراک" کے نزدیک وہ اہم ضرورت یہ بھی فرماتے ہیں:۔ "لیکن جہانتک ارجحیت کا تعلق ہے سکندر مقدونی کا نمبر، جس کی طرف ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں کسی سے پیچھے نہیں۔"

گویا "صاحبِ استدراک" اس غلط فہمی میں ہیں کہ "علماءِ متقدمین کی اکثریت" اس جانب ہی کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کہ جس کو جلد رفع ہو جانا چاہیے۔

اہلِ نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق مختلف اقوال میں سے علماءِ سلف (متقدمین) کی اکثریت کا دعویٰ کسی جانب بھی نہیں کیا جا سکتا، اور اگر ان کے تمام اقوال کو جمع کر کے خلاصہ نکالا ہی جائے تو دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان کے نزدیک شاید راجح یہ ہے کہ وہ یمن کا حمیری بادشاہ تھا اور اس کا نسب سامیینِ اولیٰ سے ملتا ہی اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا۔ دوسری یہ کہ جن بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ ذوالقرنین سکندر ہے اُن کی مراد سکندر مقدونی سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرت مسیح سے دو ہزار برس پہلے سکندر رومی کو اسکا مصداق تسلیم کرتے اور رومی اور مقدونی کو دو جدا جدا ہستیاں مانتے ہیں اور ان دونوں باتوں کی تصدیق کیلئے تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۱۶۷ فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۴ و ۲۹۵ بخاری کتاب احادیث الانبیاء۔ البدایہ والنہایہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۲-۱۰۸ اور کتاب التیجان قابلِ مراجعت ہیں۔ اور حافظ عماد الدین بن کثیر نے تو البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۰۵-۱۰۶ میں متقدمین کی اس دوسری بات کو واضح کرتے ہوئے صاف صاف تحریر فرمایا ہے۔

"حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سکندر ہی ہے اور اس کا باپ پہلا قیصر گذرا ہی اور وہ سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھا۔ اور لیکن دوسرا ذوالقرنین پس وہ سکندر بن فلپس مقدونی یونانی مصری ہی جس نے اسکندریہ آباد کیا اور جو روم کی تاریخ بناتا ہی اور یہ دوسرا اسکندر پہلے سکندر سے بہت طویل زمانہ کے بعد ہوا ہی اور ہم نے اس پر اسلئے تنبیہ کی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہ دونوں سکندر ایک ہی ہیں اور یہ گمان کر بیٹھے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہی وہ وہ سکندر ہی جس کا وزیر ارسطو ہی اور اس غلط سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی خطا اور عریض و طویل فساد برپا ہو جاتا ہی پس بلاشبہ پہلا سکندر مومن صالح اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا اسکندر مشرک تھا اور اسکا وزیر ارسطو فلسفی تھا اور ان دونوں کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا زمانہ ہے اور ان دونوں کا فرق صرف ایسے غبی پر ہی مشتبہ رہ سکتا ہے جو حقائقِ امور سے ناواقف ہو۔

اب "صاحبِ استدراک" غور فرمائیں کہ انکا یہ کہنا "سکندر یونانی کی جانب ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں" کہاں تک درست ہے؟ ہاں، ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس سخت مغالطہ میں کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے صرف "صاحبِ استدراک" ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ مورخین اسلام میں سے بعض اچھے اچھے مورخوں کو یہ دھوکا ہو گیا اور انھوں نے اس سکندر قدیم کو "جو در اصل سکندر نہیں بلکہ حمیری سامی بادشاہ تھا" سکندر مقدونی سمجھ لیا اور ذوالقرنین والا تمام قصہ اس کے ساتھ چسپاں کر دیا اور جب اس کے جسم حکومت اور شخصیت پر قبائے ذوالقرنین راست نہ آسکی تو دور از کار تاویلات کے ذریعہ اس پر موزوں کرنے کی سعیِ ناکام کی۔ اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ امام رازی جیسا بزرگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور غالباً اس کی ابتدا مشہور مفسر و مورخ ابن جریر سے ہوئی۔

علماء سلف او متقدمین کی اکثریت کے مسلک کی اس توضیح کے بعد لائق "صاحبِ استدراک" خود غور فرمائیں کہ کیا اس کے بعد بھی انکا از راہِ طعن یہ فرمانا کہ "جب سے تحقیق اور روشن خیالی کا معیار ہی یہ قرار پاگیا ہے کہ اگلے ماہرین فن کے ساتھ رشتہ اتحاد و توافق کا نہیں بلکہ انکار و تردید کا قائم رکھا جائے ذوالقرنین کے اسکندر ہونے سے مسلسل انکار ہونے لگا ہے" (صدق ۱۴ اگست ۱۹۴۱ء) کسی حد تک بھی درست ہو سکتا ہے؟ ہم اس کے جواب میں انھیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ایاک والظن فانّ بعض الظن اثم" یاد دلانا چاہتے ہیں۔

صاحبِ استدراک فرماتے ہیں کہ ہم نے ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار کر کے اکابرِ سلف کے ساتھ "انکار و تردید کا رشتہ" قائم کیا ہے حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ سکندرِ مقدونی کے انکار میں اکابرِ تفسیر و حدیث حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حیان، حافظ ابن حجر، شیخ بدر الدین عینی، امام نووی، قرطبی وغیرہ سب ہی غریب مضمون نگار کے ہمنوا اور صاحب استدراک کی رائے کے مخالف ہیں۔ البتہ صرف ابن جریر طبری اور امام رازیؒ ضرور مقدونی کو ذوالقرنین بتا رہے ہیں مگر ساتھ ہی امام صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول پر بہت قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں لیکن صاحبِ استدراک کی نگاہ میں وہ خود تو اکابر سلف کے مؤید ہیں اور غریب مضمون نگار اکابر کا مخالف ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

محترم صاحبِ استدراک نے ۱۴ اگست کے صدق میں لکھا ہے کہ ایک مستقل جواب میں "سکندر ذوالقرنین" پر ایک مستقل مضمون تحریر فرمائیں گے اس کے متعلق [illegible] اصل مضمون میں تفصیل سے [illegible] کرتے ہوئے تنقید کرینگے۔

درجۂ اردو

از حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم

برہان کو آج پہلی مرتبہ حضرت مولانا کی ایک تحریر کو شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے اس تحریر کو قلمبند کرنے کی تقریب کا ذکر جناب محترم وصل صاحب بلگرامی کے مندرجہ ذیل نوٹ میں آگیا ہے۔ اس سے قارئینِ کرام کو یہ اندازہ ہوگا کہ حضرت مولانا کی یہ تحریر اور اس پر علماءِ کرام کے تصدیقی و تقریظی بیانات اردو زبان کی تاریخ میں پہلی چیز ہیں جن کے ذریعہ اردو کی ضرورتِ بقا اور اہمیت شرعی فتوی کی حیثیت سے ہندوستان کے جلیل القدر علماء کی ایک ممتاز جماعت کی طرف سے ظاہر کی گئی ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر ہی ہم حضرت مولانا کی تحریر اور اس پر علماءِ کرام کی تقریظات شائع کرتے ہیں۔ مولانا محمد طیب صاحب کی تقریظ ایک مستقل پُر مغز مقالہ ہے جو آئندہ اشاعت میں درج ہوگا۔

اس سلسلہ میں ہمارے لئے تفصیلاً کچھ کہنے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن مختصراً اتنا عرض کرنا بے محل نہیں ہوگا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ اور اب بھی اپنی وسعت اور عام فہم ہونے کے اعتبار سے یہی زبان اس بات کی مستحق ہے کہ اُسے ہندوستان کی ملکی زبان تسلیم کیا جائے مگر افسوس ہے کہ ہندوؤں کے ایک خاص طبقہ کے زبردست پروپیگنڈہ کے باعث اب حالات اس درجہ نازک ہوگئے ہیں کہ اگر واقعی مسلمان اردو کی حفاظت اور اس کی بقا و ترقی چاہتے ہیں تو اس کی صورت بجز اس کے

کوئی اور نہیں ہے کہ مسلمان از خود اس زبان کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کریں اور یہ سمجھیں کہ ہندوستان میں ان کے قومی وقار و شخصیت کے تحفظ کا اس زبان کی بقا سے کتنا گہرا تعلق ہے۔

جیسا کہ علمار کرام کی ان تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کیلئے شرعی حیثیت سے بھی اردو زبان کو اہمیت حاصل ہے تو اس میں ہندوؤں کو برا ماننے کا کیا موقع ہے؟ آخر مصر و شام اور بیروت و فلسطین کی سب قومیں عربی بولتی ہی ہیں لیکن ان ملکوں کے عیسائیوں یا یہودیوں کو کبھی یہ کہتے نہیں سُنا گیا کہ چونکہ عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اس لئے ہمیں یہ زبان نہیں بولنی چاہیے۔

ہمارا نقطۂ خیال تو یہ ہے کہ اگر آج ہندو بھی اردو زبان میں کثرت سے مذہبی تصنیفات شائع کر کے مسلمانوں کی طرح مذہبی اعتبار سے اس کی اہمیت کی قائل ہو جائیں تو بڑا اچھا ہو۔ پھر دونوں قومیں اپنے اپنے مذہب کے تعلق سے اس زبان کی حفاظت میں سرگرم عمل ہو جائیں گی۔ (برہان)

اردو کے متعلق نہ معلوم کتنے مضامین لکھے گئے، لکھے جا رہے ہیں اور لکھے جائیں گے لیکن اس وقت تک ایک مضمون بھی ایسا سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اردو کا درجہ شرعی حیثیت سے کیا ہے؟

اسی بنا پر حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ محی سنتِ سنیہ نبوی حضرت حاجی حافظ قاری مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی ادامہ اللہ القوی نے ایک اردو کانفرنس کے صدر و سکرٹیری کی فرمائش پر ایک ایسا مدلل مضمون درجۂ اردو کے عنوان سے تحریر فرمایا جس میں سوال مذکور کے جواب کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو شرعی حیثیت سے باقی رہ گیا ہو۔ اس مفید اور انتہائی مفید مضمون کو دیکھ کر میں نے اور علمار سے بھی اس میں رائے لی اور میں اپنی کوشش میں اس طرح کامیاب ہوا کہ

جناب مولانا سعید احمد صاحب مفتی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ جناب مولانا حافظ محمد عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ جناب مولانا محمد ذکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور جناب مولانا اسعد اللہ صاحب مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ جناب مولانا عبد الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور۔ جناب مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دار العلوم دیوبند۔ جناب مولانا اصغر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند نے اپنی گرامی آرار لکھکر عنایت فرمائیں۔ ان کے علاوہ مخدومی جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے بھی حضرت حکیم الامۃ مدظلہ کے مضمون عالی کے مطالعہ کے بعد ایک بسیط مضمون تحریر فرماکر حضرت اقدس دامت برکاتہم کی خدمتِ بابرکت میں ملاحظہ کیلئے بھیجا حضرت اقدس نے اپنی فرصت کے موافق ملاحظہ اور پسند فرماکر اسکو ایک مستقل رسالہ قرار دیا اور اسکا نام الطیب البیان فی خواص اللسان تجویز فرمایا اور اس پر بقدر ضرورت ایک مختصری تصدیق بصورتِ تقریظ تحریر فرماکر اس کو اور بھی مزین فرمادیا۔ اس کے بعد جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی نے بھی اپنی موقر رائے تحریر فرمائی۔ بعدہ جناب مولانا مفتی عبد القادر صاحب فرنگی محل لکھنوی نے بھی اظہار رائے فرماکر ممنونِ منت فرمایا۔ اور اس طرح درجۂ اردو کی طرح تکمیل ہوگئی۔

جب اسقدر آرار اور مضامین فراہم ہوگئے (اور جس اردو کانفرنس کیلئے حضرت اقدس مدظلہم نے مضمون " درجۂ اردو " تحریر فرمایا تھا کسی وجہ سے منعقد نہیں ہوئی) تو میرا ارادہ ہوا کہ ایسے مفید مضامین کو یکجا و مرتب کرکے شائع کردیا جائے تاکہ عام مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اس کیلئے جناب مولوی محمد حسن صاحب علوی کاکوری مالک انوار المطابع و انوار بک ڈپو لکھنؤ تیار ہوگئے اور طباعت وغیرہ کا کل صرفہ برداشت کرنے کا اظہار فرمایا۔ لیکن مخدومی جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے جناب سعید احمد صاحب ایم۔ اے مدیر رسالہ برہان دہلی سے وعدہ فرمالیا تھا کہ میں درجۂ اردو

کے متعلق اپنا مضمون رسالہ برہان میں شائع کرنے کیلئے بھیجدوں گا بلکہ بھیج بھی دیا تھا، جب یہ حال مجھے معلوم ہوا تو میں نے اپنی تجویز پیش کی اس طرح وہ مضمون دہلی سے منگوا لیا گیا، لیکن جب اس مجموعہ کے چھپنے میں کچھ دیر ہوئی اور جناب مولانا ممدوح کا تقاضا ہوا تو میں نے ممدوح کی رائے لیکر جناب مدیر برہان دہلی سے دریافت کیا کہ اگر وہ درجہ اردو کے کل مضامین یعنی پورا مجموعہ شائع کرنے کو تیار ہوں تو میں وہ مجموعہ اُن کے پاس بھیجدوں۔ چنانچہ انھوں نے ازراہِ کرم تحریر فرمایا کہ حضرت مولانا (مدظلہم العالی) سے اجازت لیکر بھیجدیجئے۔

اس تحریر کے آنے کے بعد میں نے حضرت اقدس مدظلہم العالی سے اسکی منظوری اور جناب مولوی محمد حسن صاحب سے اسکی اجازت لی کہ یہ سب مضمون جناب مدیر رسالہ برہان کے پاس بھیجدیئے جائیں۔

چنانچہ وہ مضامین اور رائیں جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں خدا کرے یہ مفید خاص وعام ہوں اور اس سے عامۃ المسلمین مستفیض ہوں۔

وصل بلگرامی۔ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۱ء

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کل ہمارے ملک ہندوستان میں اردو زبان کے مسئلہ نے ایک خاص اہمیت اختیار کرلی ہے۔ چونکہ بفضلہ تعالیٰ کام کرنے والے اپنی فکر کی رسائی تک اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس کو کافی سمجھکر اپنے لئے اس کی کسی خاص خدمت کی ضرورت ذہن میں نہیں آئی۔ اتفاق سے آج ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ کو ایک مقام سے چھپا ہوا ایک خط مع ایک اشتہار کے آیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہاں اس کے لئے ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر کسی وجہ سے کانفرنس میں شرکت نہ ہوسکے تو کچھ مشورہ ہی دیا جائے اھ بمعناہ

اس خط اور اشتہار کو پڑھ کر قلب میں ایک حرکت پیدا ہوئی کہ اس خدمت میں کسی قسم کا حصہ لیا

جاوے۔ چونکہ متعارف خدمتوں کی نہ صلاحیت، نہ قوت اور غالباً ایک خاص خدمت کی طرف کسی نے توجہ ہی نہیں کی۔ اور وہ خدمت اس کی تحقیق ہے کہ اس تحریک کا شرعی حیثیت سے کیا درجہ ہے اور اس کی ضرورت بھی اس لئے محسوس ہوئی کہ اس وقت اس مسئلے نے تمدن وقومیت سے آگے بڑھکر مذہب کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اس لئے خیال ہوا کہ اس کے متعلق ایک مختصر تحریر منضبط کرکے دفتر میں بھیجدی جاوے تاکہ اگر وہ حضرات چاہیں شائع کرسکیں۔ واللہ الھادی الی الصواب فی کل باب۔

اشرف علی

(الآیات) الاولیٰ۔ قال اللہ تعالیٰ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ الآیہ۔ الثانیۃ۔ قال اللہ تعالےٰ ومن اٰیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم۔ الآیہ۔ الثالثۃ۔ الرحمن علم القراٰن خلق الانسان علمہ البیان۔ الآیہ۔ (الروایات الحدیثیۃ والفقہیۃ) الاولیٰ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احبوا العربیۃ لثلاث لانی عربی والقراٰن عربی وکلام اھل الجنۃ عربی اخرجہ الطبرانی فی الکبیر والحاکم فی المستدرک والبیہقی فی الشعب کذا فی کنز العمال ج ۶ ص ۲۳

الثانیۃ۔ عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تغلبنکم الاعراب علی اسم صلاتکم فانہا فی کتاب اللہ العشاء فانہا تعتم بحلاب الابل الحدیث رواہ مسلم

الثالثۃ۔ عن ابی ھریرۃ قال کنا جلوساً عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ نزلت سورۃ الجمعۃ فلما نزلت و اٰخرین منہم لما یلحقوا بھم۔ قالوا من ھؤلاء یا رسول اللہ قال وفینا سلمان الفارسی قال فوضع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدہ علیٰ سلمان ثم قال لو کان الایمان عند الثریا لنالہ رجال من ھؤلاء متفق علیہ قال فی اللمعات والمقصود ان المراد بالذین لم یلحقوا بھم اھل العجم من التابعین لحقوا بالصحابۃ من اھل العجم والصحابۃ من العرب ولقد ظہر بسطۃ العلم والاجتھاد فی التابعین مالم یظہر فی غیرھم اھ

الرابعۃ۔ فی الدر المختار فصل تالیف الصلوٰۃ کما صح لو شرع بغیر عربیۃ ای لسان کان وخصہ البردعی

بالفارسیۃ لمزیتھا فی رد المحتار قولہ البردعی الی قولہ وفارس اسم قلعۃ تنسب الیھا قوم والمراد بھا لغتھم وھی اشرف اللغات واشھرھا بعد العربیۃ واقربھا الیھا ابو السعود ۱ھ

الخامسۃ۔ فی التوضیح حتی لو قرأ اٰیۃ من القراٰن بالفارسیۃ یجوز الی قولہ لکن الاصح انہ رجع عن ھذا القول فی التلویح قولہ بغیر العربیۃ اشارۃ الی ان الفارسیۃ وغیرھا سواء فی ذلک الحکم وقیل الخلاف فی الفارسیۃ لاغیر فی الحاشیۃ لعبد الحکیم لمزیتھا علی غیرھا لقربھا من العربیۃ فی الفصاحۃ الخ

آیات وروایاتِ بالا سے امورذیل مستفاد ہوئے (۱) تمام السنہ اپنی ذات میں قطع نظر عوارض سے نعم الٰہیہ ودلائل قدرت ہونے میں اور اس بنا پر اباحت استعمال میں متساوی الاقدام ہیں کما دلت علیہ الآیات (۲) بعض خصوصیات کی وجہ سے کہ وہ خصوصیات اسبابِ عادیہ سے بمنزلہ لوازم کے ہوگئی ہیں باہم السنہ میں تفاضل ثابت ہے۔ چنانچہ عربی زبان کی فضیلت بیان کی گئی کما فی الروایۃ الاولیٰ۔ اور محاوراتِ اعراب کے استعمال سے نہی فرمائی گئی خواہ وہ نہی کسی درجے کی ہو مگر ناپسندیدگی کے مدلول ہونے میں شبہ نہیں۔ کما فی الروایۃ الثانیۃ۔ اور ان دونوں روایتوں میں غور کرنے سے صاف مفہوم ہے کہ فضل ومدح یا ذم وقبح کا مبنیٰ اس لسان کا تلبس کسی فضیلت کی چیز سے یا اس کا تلبس کسی مذموم چیز سے ہے۔ خواہ وہ چیز کوئی عین ہو یا معنی ہو۔ (۳) بعد عربی کے فارسی زبان میں اسی تلبس مذکور کے سبب چند وجوہ سے فضیلت ثابت ہے۔ ایک اس کا تعلق جماعت مقبولین سے کما فی الروایۃ الثالثۃ مع الحاشیۃ اللتین علی کونھم مرضیین عند اللہ تعالیٰ وکونھم اھل علم واجتہاد۔ اور دوسری وجوہ آگے آتی ہیں (۴) اسی فضیلت کی بنا پر جیسا بعض محققین نے فارسی کی تخصیص کی تصریح کی ہے۔ امام صاحبؒ نے ایک وقت میں فارسی میں قرأت کو جائز فرمایا تھا گو بعد میں اس سے رجوع فرما لیا لیکن رجوع فرمانے سے بنا کا انعدام لازم نہیں آتا۔ کیونکہ یہ رجوع کسی معارض اقوی کے سبب سے ہے نہ کہ ضعف بنا سے تو اس معارض کی قوت ایک خاص محل میں ظہور اثر بنا کی مانع

ہوگئی نہ کہ معطل۔ چنانچہ علاوہ وجہ فضیلتِ مذکور نمبر۳ کے دوسری وجہ فضیلت کی اس کا اشرف اللغات ہونا ہے۔ کما فی الروایۃ الرابعۃ اور اس شرف کا مبنیٰ قریب یہ ہوسکتا ہے کہ عباد مقبولین نے اس کے ساتھ تکلم کیا ہے جیسا روایاتِ ذیل میں وارد ہے۔ الف روی البخاری فی حدیث طویل من کتاب الجہاد فصاح النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا اھل الخندق ان جابراً قد صنع سوراً الخ۔ قال الحافظ فی الفتح عن الاسمٰعیلی السور کلمۃ بالفارسیۃ اھ وقال الکرمانی لغۃ فارسیۃ۔ ب وروی البخاری ایضاً فی ھذا الباب فقال النبی صلے اللہ علیہ وسلم بالفارسیۃ کخ کخ الحدیث۔ ج وروی البخاری ایضاً فی باب اذا قالوا اصبانا من کتاب الجہاد قال عمرؓ اذا قال مترس فقد امنہ د۔ روی ابوداؤد ان ابا میمونۃ قال بینما انا جالس مع ابی ھریرۃ جاءتہ امرأۃ فارسیۃ الی قولہ فقالت یا ابا ھریرۃ ورطنت لہ بالفارسیۃ وفیہ فقال یا ابا ھریرۃ استھما علیہ ورطن لھا بذلک الحدیث باب من احق بالولد۔ ہ۔ وذکر ابن تیمیۃ فی کتابہ اقتضاء الصراط المستقیم عن ابی العالیۃ ومحمد بن الحنفیۃ تکلمھا بالفارسیۃ۔ اور بعض روایات میں جو اس کی کراہت آئی ہے حافظ نے فتح میں اس کا یہ جواب دیا ہے۔ واشار المصنف (ای البخاری) الی ضعف ما ورد من الاحادیث الواردۃ فی کراھۃ الکلام بالفارسیۃ الی قولہ وسندہ واہٍ ایضاً۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ کراہت اس کے لئے ہے جو اس کو عربی پر ترجیح دے۔ اور تیسری وجہ فضیلت کی اس کا فصاحت میں عربی سے قریب ہونا ہے بخلاف بعض السنہ کے کہ ان کے کلمات میں ثقل و تنافر بکثرت ہے۔ کما فی الروایۃ الخامسۃ مع الحاشیۃ۔ اب ان مقدمات پر تفریع کر کے عرض کرتا ہوں کہ جس طرح فارسی زبان کے لئے عربی زبان کے ساتھ مناسبت ہونے سے فضیلت حاصل ہے اور چونکہ اس فضیلت کا اثر احکامِ دینیہ میں بھی ظاہر ہوچکا ہے اس لئے وہ فضیلت دینیہ ہے اسی طرح بلاشبہ عربی اور فارسی کے ساتھ ایسی ہی قوی مناسبت ہونے سے اردو کو بھی فضیلتِ دینیہ حاصل ہے بلکہ فارسی کو تو عربی سے صرف مشابہت ہی کی مناسبت ہے اور اردو کو فارسی

اور عربی سے جزئیت کی مناسبت ہے جیسا کہ ظاہر ہے کہ اردو میں کثرت سے فارسی اور عربی کے الفاظِ مفردہ ہوتے ہیں کہ کسی زبان میں بھی نہیں۔ بلکہ اس کے بہت جملے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بجز روابط کا اور کی اور ہے اور نہیں کے پورا مادہ فارسی اور عربی ہی ہوتا ہے۔ یہ تو فضیلت کی زبانوں سے اس کا تلبس ہے۔ دوسری فضیلت اس میں یہ ہے کہ علوم دینیہ کا خصوص تصوفِ صحیح ومقبول کا اس میں غیر محدود وغیر محصور ذخیرہ ہے جس کو علماء ومشائخ نے صدیوں کی مشقت اور اہتمام سے جمع فرمایا ہے۔ چنانچہ روایتِ رابعہ میں اشہر کہنے سے اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ زبان ضائع ہوگئی تو یہ تمام ذخیرہ ضائع ہو جاوے گا۔ بالخصوص عوام مسلمین کے لئے تو علمِ دین کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے گا۔ کیونکہ ان کا استفادہ بوجہ عربی نہ جاننے کے اسی پر موقوف ہے۔ کیا کوئی مسلمان اسکو گوارا کر سکتا ہے اور کیا اس طرح ضائع ہوتے دیکھنا اور اس کا انسداد نہ کرنا شرعاً جائز ہے۔ تیسری خصوصیت کہ اس کو بھی فضیلت میں دخل عظیم ہے۔ اس کا سلیس اور آسان ہونا ہے اسی تیسیر کو آیاتِ قرآنیہ میں موضع امتنان میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ فانما یسرناہ بلسانک لتبشر بہ المتقین وقال تعالیٰ فانما یسرناہ بلسانک لعلھم یتذکرون۔ واشباھما من الآیات۔

تفریع علی التفریع

اس انتاج کے بعد معلوم ہو گیا کہ اِس وقت اردو کی حفاظت دین کی حفاظت ہے اس بنا پر یہ حفاظت حسب استطاعت طاعت اور واجب ہوگی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا معصیت اور موجبِ مواخذۂ آخرت ہوگا۔ واللہ اعلم وھذا ما حضرنی الان و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

قالہ بفمہ وامر برقمہ العبد الحقیر
اشرف علی التھانوی الحنفی غفرلہ

تقریظات

تقریظ نمبر ا | الحمد للہ الذی خلق الانسان وعلمہ البیان والصلوٰۃ والسلام علی سید الانس والجان

اردو زبان اگرچہ صرف زبان ہونے کی حیثیت سے مثل دیگر عجمی زبانوں کے ایک زبان ہے اور اس اعتبار سے اس کو کوئی خاص فضیلت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ لیکن اس زبان نے باوجود ایک نئی زبان ہونے کے ایسا قبول حاصل کر لیا کہ وہ نہ صرف ہندوستان میں بولی جانے لگی بلکہ دیگر ممالک تک پہنچ گئی، بہت سی قدیم زبانوں سے فوقیت لے گئی اور اس کو بین الاقوامی زبان ہونیکا شرف حاصل ہو گیا۔

مسلمانوں نے اس کی مقبولیت کو دیکھکر دینی علوم وفنون کو بھی اس میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اور آج بلا مبالغہ اردو زبان میں دینیات کا اسقدر ذخیرہ منتقل ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہ اتنا ذخیرہ منتقل ہوا اور نہ مستقبل قریب میں اس کی امید کی جا سکتی ہے، اور جتنا فائدہ اس سے پہنچ رہا ہے اور کسی زبان سے نہیں پہنچ رہا ہے۔

اردو زبان ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی چنانچہ سب کو اس سے دلچسپی تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی۔ لیکن اب بعض خاص وجوہ سے ملک کا ایک ناعاقبت اندیش طبقہ اس کے فنا کرنے پر تلا ہوا ہے، حالانکہ یہ زبان تمام ملک کے لئے مفید اور سہل الحصول ہے اس لئے اس کی حفاظت تمام ملک کے ذمہ ہے مگر مسلمانوں کے لئے اس کا تحفظ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ دنیوی اور ملکی نقصانات کے ساتھ ساتھ اس کے فنا ہونے سے عامہ مسلمین کا ایک دینی زبردست نقصان ہوگا، اور ان کی گذشتہ تاریخ اور عظمت رفتہ کے اوراقِ زرین ان کے ہاتھ سے نکل جائینگے اور زمانہ کے نشیب و فراز اور حال و استقبال پر نظر کرتے ہوئے اس کی تلافی محال نہیں تو مشکل ضرور ہو جائیگی۔

اس لئے اسوقت مسلمانوں کو اس کی حفاظت و بقاء کے ذرائع پر غور کرنا چاہئے اور اس کی نشر و اشاعت میں ہر امکانی سعی کو اپنا فریضہ تصور کرنا چاہیئے،

حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ العالی نے جو محققانہ تفریعات آیات و روایات نقل کرنے کے بعد فرمائی ہیں وہ اپنی جگہ پر کسی تائید کی محتاج نہیں۔ ہم مسلمانوں سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مضمون کو غور سے پڑھیں اور اسکو عملی جامہ پہنانے میں کوتاہی نہ کریں۔ فقط واللہ الموفق

حررہ سعید احمد اجراڑوی غفرلہ مفتی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور ۳۰ ذیقعدہ ۵۹ھ

لاشک فی صحۃ الجوابین عبد اللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور ۳۰ ذیقعدہ ۵۹ھ

اس میں ذرا شک نہیں کہ جتنے علوم دینیہ اسلامیہ آج کل اردو میں ہیں ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ہیں اور مسلمان جتنا ان سے انتفاع حاصل کر سکتے ہیں وہ ظاہر ہے اس لئے اس کی نہ صرف حفاظت بلکہ ترویج و اشاعت کی سعی ان علوم کی حفاظت ہے جو اس میں ہیں۔

زکریا عفی عنہ

تقریظ نمبر ۲ | زلافِ حمد و نعت اولی است بر خاکِ ادب خفتن   سجودے می تواں کردن در وصفے می تواں گفتن

یہ ایک ناقابلِ انکار واقعیت اور قطعی الثبوت حقیقت ہے کہ تمام حلقہ بگوشانِ اسلام کے لئے دولت ایمان و سرمایہ اسلام، دنیا و مافیہا سے بدرجہا بہتر و برتر ہے، ایک مخلص مسلمان کے لئے اسلام کی حیثیت دوسری تمام حیثیتوں پر بہر صورت مقدم ہے، ایک مسلمان پہلے مسلمان ہے اور پھر خادم قوم، وطن پرست، سوداگر، ملازم، وزیر، بادشاہ، والد، ولد، استاد، شاگرد وغیرہ ہے۔ یہی راز ہے کہ سچے مسلمان اپنے اسلام کے لئے ہر قسم کی صبر آزما قربانیاں کرنے کو فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں، اور کبھی حرص و طمع سے دنیاوی اغراض پر اسلام کو بھینٹ نہیں چڑھاتا

چاہتے ہیں۔ لہذا جن امور کا تعلق اسلام سے ہوگا وہ یقیناً دوسرے غیر متعلقہ امور پر واجب التقدیم ہوں گے۔ اس کے بعد میں بتانا چاہتا ہوں کہ اردو زبان کا بوجوہ ذیل اسلام اور مسلمانانِ ہند سے گہرا تعلق ہے۔

(۱) تاریخ داں حضرات پر روشن ہے کہ زبانِ اردو نے میدانِ ترقی میں اس وقت قدم رکھا تھا جب تمام اطرافِ ہند پر پرچم اسلامی لہرا رہا تھا۔ دنیا کے دلوں پر اسلامی شوکت و سطوت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہان زمانہ سلاطین اسلام کی آستاں بوسی کو موجب افتخار سمجھتے تھے زبانِ اردو، عساکر اسلامیہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ زبان اردو جیوش المجاہدین کا مجسمہ ہے۔ زبان اردو کا درخت ہمارے اسلاف کے گراں بہا خون سے سینچا ہوا ہے، جب تک ہندوستان کے مسلمانوں میں زبان اردو رائج رہیگی ان کے دماغوں میں کھوئی ہوئی عظمت کا خیال، غلامانہ ذہنیت کی اصلاح کرتا رہیگا، الوالعزمی و بلند حوصلگی کے سبق پڑھاتا رہیگا۔ وہ جذباتِ حریت سے مانوس ہوتے رہیں گے۔ اس وجہ سے برادران وطن اس کے لئے طیار نہیں کہ زبانِ اردو کی ترویج ہو وہ چوٹی سے ایڑی تک کا زور ہندی کے رائج کرنے پر لگا رہے ہیں۔

(۲) ایک مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے قرآن مجید کا جتنا شیفتہ و فریفتہ ہو سکتا ہی محتاج اظہار نہیں، مسلمانوں کے سامنے قرآن مجید کی عظمت کا بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، قرآن شریف کے لئے افضل تو یہ ہے کہ تجوید و ترتیل کے ساتھ اس کے حقائق معنویہ میں بھی تدبر کیا جائے، اس کے روح پرور مطالب سے نفس کا تزکیہ کیا جائے اور کم سے کم یہ ہے کہ اس کے الفاظ ہی کو صحیح ادا کیا جائے، مخارج وصفات ہی کا لحاظ رکھا جائے تو اب غور فرمائیے کہ اس قرآن مجید میں جس کے متعلق بارگاہِ خداوندی کا اٹل اور حتمی وعدہ ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ اور عالم اسباب میں اس وعدہ کی تکمیل کا بار مسلمانوں کے

کندھوں پر ہے، ہندی سے زیادہ مدد مل سکتی ہے یا اردو سے، میں بلا خوف، انکار کرتا ہوں کہ صرف ہندی پڑھنے والے قرآن مجید کے مبارک الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے۔

(۳) سر سید احمد خانصاحب نے آج سے ۴۵ سال پیشتر ۱۸۹۶ء کی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا تھا:-

سب سے اول ہمارا یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی قومی ترقی کی ہے قائم رہے، اس کے لئے ہم کو کیا کرنا ہے، سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت اُن کے دل میں قائم رہے اور اسلئے ضرور ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں اور عقائد مذہبی ان کو سکھائیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کو فرائضِ مذہبی کا پابند رکھیں، تاریخ اسلام اور مذہب اسلام کے شرع سے . . . . . آگاہ کریں . . . . بھر ہم کو اپنی قومیت قائم رکھنے کیلئے عربی زبان کو بھی جو ہمارے بزرگوں اور ہمارے پاک مذہب کی زبان ہے جسقدر ہو سکے تعلیم دینا ہی کم سے کم یہ کہ فارسی زبان ہی سکھائیں تاکہ قومیت کا اثر ان میں پایا جائے۔ انگریزی تعلیم کے سبب ان میں سے قومیت معدوم نہ ہونے پائے۔"

سید صاحب کی تقریر میں جن اعلیٰ مقاصد کو ظاہر کیا گیا ہے وہ ایک خاص حد تک موجودہ دور میں زبان اردو کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ہم اس مختصر تحریر میں اس موضوع پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتے اسلئے گذارش ہے کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر ہم یہ سعادت حاصل کرتے ہیں کہ حضرت اقدس حکیم الامۃ تھانوی مدظلہ کی محققانہ تحریر کے دل وجان سے ماننے والوں میں اپنا نام بھی ثبت کریں۔ اور مسلمانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مضمون کو صرف کاغذی کارروائی۔ اور زبانی تجاویز کے پاس کرنے تک ہی محدود نہ رکھیں

دھواں دھار تقریروں پر اکتفا نہ فرمائیں بلکہ میدانِ عمل میں اتریں اور عملی تدابیر سے اردو کو باقی رکھیں، اس وقت جو تدابیر ہمارے ذہن میں ہیں ان کو ہم لکھے دیتے ہیں جو صاحب ان کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ مفید سمجھیں وہ اس پر عمل پیرا ہوں۔

(۱) تحریر و تقریر میں غیر مانوس انگریزی وغیرہ الفاظ چھوڑ دیئے جائیں۔ انگریزی محاوروں کی جگہ قرآن مجید کی آیات، احادیث اور امثال عربیہ استعمال کئے جائیں۔

(۲) جگہ جگہ اردو کے چھوٹے چھوٹے مکتب قائم کئے جائیں۔ شفیق و پابند مذہب استاد مقرر کئے جائیں۔ بچوں سے اجرت نہ لی جائے۔ غریب بچوں کو کتابیں بھی مفت دی جائیں۔ امتحان پر انعام سے بھی ہمت افزائی کی جائے۔

(۳) سہل و سلیس اردو میں چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے جائیں، مضامین دلچسپ و سہل طباعت دیدہ زیب، کتابت خوشنما اور کاغذ عمدہ ہو۔

(۴) رسائل اور اخبارات میں اردو کی اہمیت پر مضامین لکھے جائیں۔

(۵) اردو اخبارات و رسائل کی زیادہ تعداد میں خریداری سے ہمت افزائی کی جائے۔

(۶) مہذب مشاعرے منعقد کئے جائیں جن میں کم از کم مانگ چوٹی کے مضامین نہ ہوں، اچھی بندشوں میں اچھے الفاظ سے پاکیزہ مضامین بیان کئے جائیں۔ کامیاب نظم کے لئے انعام بھی مقرر کیا جائے۔ خواہ وہ "انعامی پیالہ" ہی کی شکل میں ہو۔

(۷) مضامین نثر کے لئے بھی مجالس قائم کی جائیں۔ خواہ کسی ایک عنوان پر مضامین لکھوائے جائیں۔ خواہ آزادی دی جائے۔ بہترین مضمون لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کی جائے، اگر کوئی طالب علم کسی دوسرے سے بھی مضمون لکھوا لائے تب بھی اسکو مستحق انعام سمجھا جائے۔

(۸) وقتاً فوقتاً موثر انداز سے اردو کی اہمیت پر تقریریں کی جائیں۔

(۹) کبھی کبھی ملک کے بہترین اردوداں بُلاکر بڑے بڑے جلسے منعقد کئے جائیں۔

(۱۰) اردو میں امتیازی حیثیت رکھنے والے طلبہ کے وظائف مقرر کئے جائیں۔

(۱۱) اردو کے تحفظ کے لئے بکثرت انجمنیں قائم کی جائیں۔ فقط

بندہ اسعد اللہ عفاعنہ، محرم ۱۳۵۹ھ

بندہ عبدالرحمن کاملپوری غفرلہ (مدرس) مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

تقریظ نمبر ۳ | ہندوستان میں اردو زبان کی حفاظت شرعی حیثیت سے طاعت اور بقدرِ استطاعت واجب ہونا سیدی حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم نے دلائل صریحہ وصحیحہ سے واضح فرمادیا ہے وہ محتاج کسی تائید وتشئید کا نہیں ہے اس کے ساتھ ایک اور وجہ اس کے طاعت وثواب ہونے کی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے شہری ودنیوی حقوق کا تحفظ بھی دین ہے۔ اور ان کو اپنی مشترک ملکی زبان کے سوا کسی دوسری زبان کے استعمال پر مجبور کرنا ان کی حق تلفی اور بلاشبہ ان پر ظلم ہے کہ ایک خاص قوم کی قومی زبان کا ان کو پابند کیا جاوے۔ اکبر شاہ کے عہد میں اردو زبان کی ترویج اسی مساوات پسندی کے مد میں کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان میں بسنے والی تمام قوموں کی ایک مشترک ملکی زبان ہو اور کسی قوم کو یہ شکایت باقی نہ رہے کہ اس کو دوسری قوم کی زبان پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی ذی اقتدار قوموں کی قومی زبانیں چار تھیں۔ ہندوؤں میں ہندی۔ عربی النسل مسلمانوں میں عربی۔ تیموری خاندان میں ترکی اور بلاط وحکومت کی زبان فارسی۔ شاہ جلال الدین اکبر نے اپنی قومی زبان (عربی) کو چھوڑ کر انھیں چاروں زبانوں سے مرکب اردو زبان کی ترویج اس لئے کی کہ سب قوموں کی مشترک زبان ہے کسی قوم کو شکوہ نہ رہے۔

اکبر شاہ کے اس عمل کی شہادت ایک غیر مسلم امریکی (لوتروب ستودارد) کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" (مترجم بعربی) میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے۔

وكانت اللغة المعروفة في الهند عدا لغات الهنود الاصليين ثلاثة العربية لغة الدين الاسلامي والتركية لغة الاسرة التيمورية و الفارسية لغة البلاط والدولة فوضع اكبر لغة الاردو اللتي تشتمل على كثير من العربي والفارسي والتركي مع الهندي فسهل التفاهيم بين الامم الهندية تدريجاً حتى انه ليكلم بها اليوم مائة مليون نسمة

ہندوستان میں ہندوؤں کی زبان (ہندی) کے علاوہ تین زبانیں زیادہ معروف اور رائج تھیں یعنی ملت اسلامی کی زبان عربی۔ اور تیموری خاندان کی زبان ترکی اور حکومت کی زبان فارسی تھی۔ شاہ اکبر نے لغت اردو وضع کیا جو بیشتر عربی، فارسی، ترکی، ہندی الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کی وجہ سے باہمی تفاہم اور گفتگو سہل ہوگئی اور یہ زبان اردو اسقدر رائج ہوئی کہ آج دس کروڑ آدمی خالص اردو بولتے ہیں۔

(حاضر العالم الاسلامی ص ۳۰۵ ج ۴)

اس امریکی فاضل کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندی زبان صرف ہندوؤں کی قومی زبان ہے نیز یہ کہ اردو زبان ہندوستانی اقوام کی مشترک زبان ہے جس کو اس کے زمانہ میں ہندوستان کے دس کروڑ انسان استعمال کرتے ہیں۔

یا للعجب حکمران قوم نے اپنے عہد حکومت میں اپنی قومی زبان جن لوگوں کی خاطر چھوڑی تھی وہی آج ان کے احسان کا یہ صلہ دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اس مشترک زبان پر بھی قائم نہ رہنے دیں بلکہ خالص اپنی قومی زبان کا پابند کریں۔ حالانکہ ابھی تک وہ حاکم نہیں بلکہ حکومت کی تمنا کر رہے ہیں۔ اسلئے بلاشبہ یہ مسلمان قوم پر ظلم ہے اور اس کا ازالہ بقدر استطاعت واجب ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح ہندو قوم مسلمانوں کی قومی زبان عربی اختیار کرنے کو اپنی قوم پر ظلم اور اپنے مذہب و شعائر مذہب کے خلاف سمجھتے ہیں مسلمانوں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں کہ وہ

بھی ہندی زبان کے متعلق یہی رائے رکھیں بالخصوص جبکہ ان کے مذہب کی تعلیمات میں یہ بھی داخل ہے کہ

"اللسان مؤثر فی الخلق والدین"۔ "زبان اخلاق اور دین میں موثر ہے"۔

(اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ

الی المشتکی وھو المرتجی)

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ خادم دار العلوم دیوبند ۹ رمضان ۵۹ھ

حضرت اقدس دامت برکاتہم کی اصل تحریر اور اس تقریظ سے یہ احقر بھی متفق اور ہر طرح مؤید ہے۔ بندہ اصغر حسین عفا اللہ عنہ

مخطوطات عجائب خانۂ بیجاپور کی مختصر فہرست

(ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ڈی لٹ (پیرس) پروفیسر دکن کالج پونہ)

ستارہ کی فتح کے بعد جب راجہ ستارہ کی وفات ہوئی تو بیجاپور کا شاہی کتب خانہ برطانیہ کے قبضہ میں آگیا۔ جس کے اندر بے شمار عربی فارسی کتب تھیں اور گورنمنٹ اس کتب خانہ کو محفوظ کرنے کی طرف متوجہ ہوئی تاکہ فضلاء اس سے کماحقہ استفادہ کرسکیں۔ مسٹر فریر[۱] اس وقت ستارہ میں کمشنر تھے۔ انھوں نے بمبئی گورنمنٹ کو ان کتابوں کے متعلق ۱۷۔ دسمبر ۱۸۴۹ء کو رپورٹ بھیجی کہ شاہی کتب خانہ بیجاپور کے مخطوطات کا پتہ چلا ہے۔ جن کے ساتھ اس وقت آثار محل بیجاپور کے دیگر آثار شریف بھی تھے۔ غرضکہ بہت سے مراحل کے بعد یہ تمام مخطوطات ۱۸۵۳ء میں ایسٹ انڈیا ہاؤس میں رکھے گئے۔

پھر لائبریرین کورٹ نے ان کو دیکھ کر ایک نوٹ لکھا جس کا ماحصل یہ تھا۔

"مخطوطات کا مجموعہ شاہانِ بیجاپور کا ہے۔ ان میں سے اکثر کتابوں پر بادشاہوں کی مہریں ملتی ہیں، بعد میں یہ مخطوطات اورنگ زیب کے قبضہ میں آئے جس کی مہر اکثر کتابوں پر ثبت ہے۔ یہ مجموعہ زیادہ تر مذہبیات یعنی تفسیر، حدیث، کلام، وعظ، سلوک، فقہ، فلسفہ، ریاضیات، تاریخیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان میں شعر و شاعری پر کوئی کتاب نہیں ہے، جو یوروپین حضرات کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ صرف ایک دو کتابیں شعر و شاعری پر عربی زبان میں ہیں۔

[۱] Mr. H.B.E. Frere جو کمشنر ستارا تھا اور بعد میں گورنر بمبئی بھی ہوگیا تھا۔

غرضکہ اس مختصر سی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مجموعہ مخطوطات جو شاہان بیجاپور کا تھا وہ ایسٹ انڈیا ہاؤس میں پہنچ گیا مگر یہیں موجودہ مجموعہ مخطوطات بیجاپور موزیم جن کا ایک مختصر سا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ وہاں دو روزہ قیام میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا مخطوطہ نہیں ہے جو اس عادل شاہی کتب خانہ سے تعلق رکھتا ہو، اور ہمیں ان کی صحیح حقیقت کا بھی علم نہیں کہ یہ کہاں سے لا کر یہاں رکھے گئے ہیں۔ یہ اس وقت بیجاپور میں گول گنبد کے احاطہ میں داخل ہوتے ہوئے اس کے دروازہ کے اوپر کے کمرہ میں شوکیسوں میں رکھے ہیں۔ افسوس اس امر کا ہے کہ تمام مخطوطات جو تعداد میں قریباً اسّی ہیں مزید احتیاط اور توجہ کے محتاج ہیں جس کے لیے لازمی ہے کہ ان کی کیا بلکہ اس تمام موزیم کی دیکھ بھال کے لیے ایک ایسا شخص مقرر ہو جو ان نوادر کو کسی قدر ضروری جانتا ہو اور ان مخطوطات کے علاوہ اور بھی بیشمار نوادرات موزیم میں ہیں جو اسلامی دور سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یہاں کا محافظ کم سے کم کتاب کو صحیح طور پر تو کیا اس کا اُلٹ پلٹ تو سمجھتا ہو ورنہ ان کے مزید خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ میں نے اپنی تفصیل میں اصل نمبر رجسٹر اندراج کو قائم رکھا ہے مگر ان کو ان کے اصل موضوع کے اعتبار سے ایک جا کر دیا ہے تاکہ آئندہ اربابِ ذوق ان سے کما حقہ استفادہ کر سکیں اور اُن کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس موزیم میں کیا کیا ہے۔ میں آخر میں معذرت کرونگا کہ مجھ سے بعض بعض جگہ تفصیلات فنِ فہرست نویسی کے اعتبار سے تشنہ رہ گئی ہیں جس کا باعث وقت کی کمی ہے اور میں اس ارادہ سے بیجاپور گیا بھی نہیں تھا مگر میں نے ان کی مختصر سی تفصیل کو بہت محسوس کیا جو یہاں درج ہے۔ انشاء اللہ پھر کبھی آئندہ اس تشنگی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

آخر میں مجھے اپنے فاضل دوست قریشی محمد منیر محکمہ آثار قدیمہ ہند کا ممنون ہونا چاہیے۔ جنکی وساطت سے میں ان مخطوطات کو خاطر خواہ طور پر تھوڑے وقت میں دیکھ سکا۔

مخطوطات کو یہاں اُن کے مضمون کے اعتبار سے ترتیب دے کر درج کیا جاتا ہے اور ان کا اصل نمبر یعنی نشانِ اندراجِ رجسٹر میوزیم بیجاپور کو ہر مخطوطہ کی تفصیل کے اختتام پر درج کیا جاتا ہے، تاکہ صحیح حوالہ بھی قائم رہے اور اصحابِ علم باقاعدہ اس حوالہ سے اصل مخطوطہ کو بھی ملاحظہ کرسکیں۔

نسخِ قرآن کریم

۱۔ قرآن۔ یہ قرآن کریم کا مخطوطہ کافی بڑے حجم کا لمبائی چوڑائی میں ہے، جو اٹھارہ انچ اور بارہ انچ ہے۔ اور ہر صفحہ پر سترہ سطور ہیں، جلد بھی پرانی ہے، بلکہ معاصرانہ ہے۔ کیونکہ اُسی قدیم رسم الخط میں اس پر "لا یمسہ الا المطھرون" لکھا ہے جو عجیب وغریب ترتیب جدول کا کام دیتا ہے اس مخطوطہ کا رسم الخط بالکل ایک خاص نوعیت کا ہے، جو ضرور بہمنی سلطنت کی یادگار معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ دیگر نسخہ جات قرآن کے رسم الخط سے مختلف ہے جو عام طور پر اس وقت دیگر ممالک اسلامی میں پائے جاتے ہیں، بلکہ کسی قدر بہ خط بیدر اور دیگر دکنی کتبات کے مشابہ ہے۔ جہاں قرآن کریم ختم ہوتا ہے وہاں عجیب وغریب شکستہ خط نسخ میں یہ مذکور ہے۔

تم کتابت المصحف بعون الوہاب بتوفیقہ بخط بندہ ضعیف امیدوار رحمت پروردگار سراج فخر فی الحادی والعشرین من ذی الحجہ سنہ ثمان وثمانمائۃ ملتمس از دعای امت ..... ؟

آخر میں بعض سورتوں کی تفسیر فارسی اشعار میں چند صفحات پر ہے (م ۳)

۲۔ قرآن:۔ یہ قرآن کا مخطوطہ عجیب وغریب ہے اور عمدہ پرانی جلد میں ہے۔ اس کے اندر ابتدائی صفحہ پر ذیل کی عبارت موجود ہے۔

قرآن چو وقف کردہ درگاہ گیسو دراز از ولی بی بی زوجہ حضرت خان عالی شان رفیع المکان .... یاقوت خان۔ عہد ابراہیم عادل شاہ سلمہ اللہ تعالیٰ .... ہر کہ دریں روضہ تلاوت کند .... تاریخ پانزدہم ماہ ذی القعدہ روز سہ شنبہ سنہ ہزار و ہشردہ نوشتہ شد"
(مہر ابراہیم عادلشاہ)

اس کے آخر میں یوں مذکور ہے۔

العبد الفقیر الی اللہ الغنی اسماعیل بن حاجی معبری غفر اللہ ذنوبہما وستر عیوبہما الساکن فی شہر بندیاپور عز الدکن حرسہا اللہ عن المکائد و الفتن ۔ آمین

حررہ فی التاریخ من یوم الجمعہ تسعۃ شہر شعبان المعظم ہے سنہ ثلاثہ عشرہ والف ۔

اس قرآن کا طرز تحریر اور رسم الخط بالکل ان قرآنوں کی طرح ہے جو یاقوت حموی کی طرف منسوب ہیں ۔یعنی ہر صفحہ پر درمیانی ابتدائی اور آخر کی سطور ذرا زیادہ جلی حروف ہیں ۔اور باہر کے حاشیہ تک بلکہ یہ کسی قدر مطلا و مذہب بھی ہیں ۔

نہایت عمدہ پاکیزہ نسخی کا نمونہ ہے

یاقوت خاں ولد فرہاد خاں عہد عادل شاہی کا ایک مشہور سربرآوردہ امیر تھا اور اُس نے اکثر رفاہ عام اور کار خیر میں حصّہ لیا جس کی زوجہ نے یہ نسخۂ قرآن کریم گلبرگہ میں درگاہ گیسو دراز میں لوگوں کی تلاوت کے لیے پیش کیا دیا قوت خاں کا بیان بُرہان مآثر ص ۵۶۹۔۵۷۰ میں ملتا ہے ۔

۳۔ چھوٹی تقطیع کی حمائل شریف ۔ عمدہ ہے ۔ پُرانی جلد پر " لا یمسہ الا المطہرون " لکھا ہے ۔ (م ۳۰) (م ۲)

۴۔ قرآن کریم ۔ چھوٹی حمائل کی صورت میں ۔ (م ۲۵)

(۵) قرآنِ کریم ۔ حمائل درمیانی سائز ۔ اس کے آخر میں یوں لکھا ہے ۔

"کتبہ العبد الفقیر حقیر بہار الدین قادری ابن شیخ ابراہیم ملتانی عرف منجو شاہ قادری بتاریخ یازدہم صفر ۔ ختم اللہ بالخیر والظفر ۔ تمت تمام شد ۔ ۱۰۸۷ھ مالک محمود حسن بھکری ۔ (م ۱۸۰)

۶۔ قرآن ۔ حمائل شریف مجلد ہے اور کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی مگر اس کی جلد ضرور قابلِ توجہ ہے جو پُرانی ہے اور اس پر طغرا میں " اللہ کافی لکھا ہوا ہے اور تاریخ ۱۱۵۹ھ اور اس کی بینی پر چار بار " لا یمسہ الا المطہرون " لکھا ہے ۔ (م ۱۷)

۷۔ قرآن کریم۔ مورخہ سنہ ۱۲۶۱ھ (م ۲۳)

۸۔ قرآن کریم۔ معہ فارسی ترجمہ بین السطور۔ آخر میں یوں لکھا ہے:۔

"راقم الحروف عبد الضعیف سید ہاشم بن احمد بن محمد صفاکی۔ مقام بیجاپور سنہ ۴۵ھ

لکھا ہے۔ (م ۳۳)

۹۔ قرآن کریم۔ قرآن کریم کا اول نصف حصہ جو اچھی حالت میں نہیں ہے۔ جس کی ابتدا میں بہت عمدہ گلکاری ہے جو خاص کر بیجاپوری کام ہے اور دسویں صدی ہجری کا کام ہے

۱۰۔ قرآن۔ اول ۲۱ پارے ہیں۔ (م۔۲۶)

قرآن کریم بہت عمدہ مطلا و مذہب، اس پر محض ایک مہر ملتی ہے جس میں یہ لکھا ہے

سید وجیہ الدین ابن شاہ عبداللہ گجراتی سنہ ۱۲۱۸ھ (م ۶۳)

۱۱۔ اس قرآنِ کریم کے نسخے میں اور کوئی خاص ندرت نہیں۔ (م۔۱۶)

۱۲۔ قرآن کریم کا نسخہ ہے مگر اس کے آخر میں لکھا ہے۔ کتاب تفسیر مواہب من تصنیفات الحسین واعظ کاشفی۔ (م۔۳۲)

۱۳۔ تفسیر قرآن کا ایک نامکمل حصہ ہے۔ (م۔۴۵)

۱۴۔ تفسیر حسینی۔ بہت بڑی تقطیع پر ہے اور عمدہ نسخہ ہے۔ (م ۲۰)

۱۵۔ پنجسورہ۔ مگر نامکمل ہے۔ (م۔۳۷)

کتب اوراد

۱۶۔ حزب الاعظم۔ یہ دراصل حزب الشریف والورد المنیف معلوم ہوتی ہے۔ جو شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ متوفی سنہ ۵۶۱ھ کی ہے مگر یہ بالکل معمولی نسخہ ہے۔ (م۔۶۲)

۱۷۔ مجموعہ اوراد۔ کیونکہ بغور یہ بھی کچھ اوراد کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ (م۔۶۱)

۱۸- دلائل الخیرات - یہ عام مشہور مجموعۂ اوراد و وظائف ہے۔ مگر یہ نسخہ ۱۱۳۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور آخر میں یوں ہے :-

"علیٰ ید الفقیر الحقیر السید حسین بن عبداللہ علوی بن احمد العیدروسی نفع اللہ لہم" (م-۶۶)

۱۹- دلائل الخیرات - اس مخطوطہ میں اصل متن دلائل الخیرات کے علاوہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نقشے بھی علم المرایا کے تحت دیے گئے ہیں۔ جن سے اندرون کعبہ اور مدینہ واضح ہیں۔ ان کے بنانے میں صاحبِ فن نے اپنی پوری قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ اس مخطوطہ پر کسی تاریخ وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر عادلشاہی دور کا آخر زمانہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ (م ۴۴)

۲۰- دلائل الخیرات - بہت معمولی سی ہے۔ (م-۶۵)

کتب فقہ

۲۱- کتاب فقہ - اس کے ابتدا سے کچھ معلوم نہیں ہوتا، مگر اس کے آخر میں یوں ملتا ہے :-

اتمام تالیف ایں کتاب "فقاہت فردیہ فی احکام الشرعیۃ" بعد از نماز جمعہ نہم شہر ذی القعدہ سنہ یکہزار و یکصد و پنج من ہجرۃ النبویۃ در زمان دولت اعلیٰ حضرت سلطانی زیور صاحب قرانی سراج الدین من خلفاء الراشدین .... السلطان بن السلطان محمد عالمگیر بادشاہ غازی

اس کے دوسری طرف یوں ملتا ہے۔

شاہ محمد عادل کاتب فقیر حقیر پیر دستگیر عظامی الشیخ محمد ابن الشیخ برخوردار صوبہ دار السلطنۃ لاہور عرف پنجاب سکنہ پرگنہ سیالکوٹ۔ بست و پنجم جمادی الآخر ختم اللہ بالخیر والظفر ۴۲ھ سنہ جلوس والا زمان اورنگ زیب عالمگیر روز جمعہ بعد نماز جمعہ در گلبرگہ قلمی نمود

سرانجام دادہ

بنا بریں تراب اقدام اہل اللہ محیی الدین ابو محمد عادل قادری الحسینی ولد میر محیی الدین محمد قادری بن حضرت سید محیی الدین قادری بن سید محمد ..... من حضرت قطب الاقطاب .... شاہ محیی الدین ابو محمد عبدالقادر .... (م ۷)

۲۲۔ مجموعہ ھند۔ یعنی قدیم دکنی زبان میں ہے۔ چکی نامہ وغیرہ۔

ابتداء۔ الحمد للہ رب العٰلمین .... ایں فقیر میر سید حسن محمد اہل کلام ہندی خواند و تکلیف کردند۔

چکی نامہ۔ ابتداء: صفت میں کرونگی داتا و سبحانہ

چکی نامہ شیخ احمد ...... اس کا خاتمہ یوں ہے۔

تمت تمام شد رسالہ چکی نامہ الخط۔ معبری بسلطان نوشتہ

اس مخطوطہ کا اختتام۔ یہ کتاب مصنفہ چکی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر مقام پر یہ لفظ بطور تخلص آیا ہے۔ (م ۷۰)

۲۳۔ "پند نامہ" اس کی ابتداء یوں ہے۔

حمد بگویم بعید دم خالق جن و بشر	بولوں صفت میں بے گنت اس خالق جن و بشر
کردہ معلومات آسماں ہم اختراں شمس و قمر	نردھار کر آسماں رکھیا تارے او چندا قمر

غرضکہ اس پند نامہ میں ایک مصرع فارسی ہے اور دوسرا اس کا ترجمہ ہندی میں اسی بحر اور طرز پر ہے جس سے مل کر پورا شعر بنتا ہے۔ اور فارسی نظم پند نامہ ۷۹۵ھ میں تصنیف ہوا تھا جیسا کہ اخیر اشعار میں یہ تاریخ دی ہے۔

عام طور پر پند نامہ عطار مشہور ہے جو ۶۲۷ھ کی تصنیف ہے اور اس کا ابتدائی شعر

یہ ہے ؎ حمد بیحد مر خدائے پاک را ❊ آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را۔ اس لیے یہ اس کے علاوہ ہے۔ (م-۷۰)

۲۴۔ رسالۂ میت۔ یہ چھوٹی تقطیع پر ہے۔ اس کا مقدمہ یوں شروع ہوتا ہے۔

بدانکہ ایں ترتیبات میت است از کتب فقہ معتبرہ و از اسانید صحیحہ برآوردہ الخ (م ۴۲)

۲۵۔ صفت ایمان۔ یہ عام کتاب چھوٹی تقطیع پر سوال وجواب کی صورت میں ہے۔ اس کا مصنف محمد باقر ولد محمد اسحاق ساکن اکبرآباد ہے۔ جیسا کہ اس کے آخر میں لکھا ہے۔ خط معمولی اور تاریخ ندارد۔ (م-۴۹)

۲۶۔ مفتاح الجنان۔ یہ نسخہ مشہور مفتاح الجنان مصنفہ محمد مجیر بن وجیہ الدین کا دینیات میں معلوم ہوتا ہے اور یہ ۸۸۰ھ میں تصنیف ہوا۔ اس کے آخر میں یوں ملتا ہے "ہذا الکتاب من مملوکات الفقیر الحقیر العبد الراجی الی رحمۃ اللہ الغنی۔

"کاتبہ الفقیر الحقیر دوست محمد بن ملا محمد سمرقندی نوشتہ" تاریخ وغیرہ نہیں ہے مگر بغور دیکھنے سے یہ دسویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کاغذ بھی دبیز ہے۔ (م-۱۷)

۲۷۔ راحۃ الواعظین۔ اس کا مقدمہ یوں شروع ہوتا ہے:-

بسم اللہ۔ الحمد للہ رب العالمین و طوبیٰ للعابدین والصلوٰۃ علیٰ رسول۔ میگوید بندۂ ضعیف مبارک فیض اللہ شامی ...... دریں اوراق نبشتہ آمد راحت الواعظین نام نہادہ شدہ

۲۴ ابواب پر منقسم ہے۔ اس کا آخری حصہ عقوبت پر ہے۔ اور اس پر ایک مہر محمد ابن سید حسن کی ہے ایک مہر اور ہے جس پر ۱۱۴۴ھ ہے۔ اس کے ہمراہ چند اوراق نظم میں ملحق ہیں جو نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔

غرضکہ اس مجموعہ میں عام فقہ کے مسائل ہیں۔

رسالہ تمام کردم مبدا و معاد نام نہادم وچوں کشف الحقائق مطول بود۔

اس کے آخر میں یوں درج ہے۔

"تمام شد رسالہ زبدۃ الحقائق فی کشف الدقائق فی شہر ذی حجۃ الحرام بتاریخ ششم شہر مذکور سنہ ۱۱۴۶ھ"

ایک اور مختصر سی تحریر ہے۔ نوید ــــ نواب محمد یوسفی ــــ (م-۴۱)

کتب تصوف

۲۸۔ عشقیہ۔ یہ رسالہ قاضی حمید الدین ناگوری کی کتاب مسمیٰ عشقیہ ہے۔ مگر اس کے مطالعہ سے اس کا کہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس کے آخر میں یہ اشعار درج ہیں۔

پیر ما عبداللہ شاہ قادری	در دو گوئی ہست مارا شافعی
ہیچ قدرے من ندارم بندگی	جز امیدت رحمتے یا بندگی
ایں کتابے را نوشتم شوقِ جاں	لیک بر خاطرے جملہ جہاں
ایں غضنفر خاک پائے کوئے دوست	ہر چہ ہست... دائم کہ اوست"

۲۹۔ روشن دل۔ اس نسخہ عشقیہ کے ساتھ ایک اور مخطوطہ روشن دل بھی مجلد ہے جس کی ابتدا یوں ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والمتقین ــــ اما بعد چنیں گوید بندہ ضعیف حمید افغان ساکن مصطفیٰ آباد عرف جونرہ کہ چند سخناں در راہِ سلوک گفتہ شدہ ــــ میاں شیخ عبداللہ رسانیدہ۔ اخیر۔ تمت تمام شد کار من نظام شد ایں کتاب روشن دل در ماہ رمضان قریب شد بروز عید۔ ساکن امتیاز گڑھ عرف ادہ نی۔ (م-۵۷)

۳۰۔ مجمع البحرین۔ یہ نسخہ نامکمل سا ہے مگر مجمع بحرین معلوم ہوتا ہے اور کافی خوشخط و مطلا وغیرہ

ہے۔ ایک جگہ یوں ہے۔

در مدح حضرت خاقانی سلیمان مکاں مہر سپہر سروری سلطان شاہ اسمٰعیل حیدری ـــــ

معما باسم شریف ـــــ "

فارسی میدان طلب از فارسی است — دردم شاہ عرب ایں فارسی است

بندہ محمود دم و سر تا قدم — خلیفہ شد از خدمت ایں درحرم

لطف وے از دجلہ خوں برکنار — کشتیم آورد گہر در کنار

برلب بحر از ہمہ سو خار غم — رستہ از ناوک و سوفار غم

شرط شد از ہمت محمود باد — آخر کار ہمہ محمود باد

بخشید مرا از لطفِ بسیار — چو کانی دہ ہزار دینار

تا ہست فلک بقائے شہ باد — در دست ملک دعا شہ باد

تم الرسالہ الشریفہ بعون اللہ تعالیٰ ۹۷۳

ایک بات ضرور واضح کرنی چاہیے کہ یہ مخطوطہ بالکل ایرانی ہے۔ (م ۲۲)

۳۱۔ الخزینۃ الثالث یا خزینہ: بعوز مطالعہ سے تصوف میں معلوم ہوتی ہے اور مقدمہ میں اس کا نام خزینہ درج ہے۔ (م ۹)

۳۲۔ "مخزن جواھر الاسرار فی حل غوامض جوھر شطار" یہ نسخہ برہانپوری ۱۰۸۳ھ میں لکھا گیا تھا۔ دراصل یہ مخطوطہ محمد غوث گوالیاری کی تصوف کی کتاب جواہر خمسہ یا رسالہ غوث ہے۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ عہد ملباری اور عقائد صوفیہ یعنی رسالہ شیخ جواذ بھی ہیں جو بہت اہم صوفیائے کرام کے سلسلہ میں ہیں۔ (م ۵۲)

۳۳۔ شرح گیلانی: ابتداء۔ الحمد للہ ـــ بعد حمد و صلوٰۃ گوید بندہ حمد ابراہیم بن محمد گہ

کہ حضرت رسالت ۔۔۔۔ مگر اس کے آخر میں یوں ملتا ہے۔ "نسخہ المسمیٰ شرح گیلانی ۱۰۸۰ھ"
ایک مہر گول ہے جس میں صاف یوں کندہ ہے:۔ "احمد کرت ابن محمود احمد ۱۰۸۰ھ"
مالکہ وصاحبہ سید احمد بن سید محمد۔ (م ۴۳)

۴۳۔ "گنج العارفین" یہ نہایت عمدہ مجلد نسخہ ہے اور جلد بالخصوص قابل ذکر ہے جو ایک خاص انداز میں خاص عہد اسلامیہ کی جلد بندی کا طرز ہے اور اندر صفحات پر گلکاری اور زرفشانی بھی ہے اس کے آخر میں یوں لکھا ہے۔ "محمد امین ولد زین العابدین نواب مصطفیٰ خاں لاری بیجاپور"

میرے خیال میں یہ عطار کی گنجینۂ عرفان کا ایک جزو ہے۔ جیسا کہ اس کے اندر ایک جگہ کچھ اسی قسم کا لکھا بھی ملتا ہے اگرچہ واضح نہیں ہے۔ (م ۔ ۶)

۳۵۔ کتاب بحر المعانی ۔ یہ مخطوطہ بالکل معمولی ہے اس کے ساتھ ابتدا میں اور آخر میں اور بھی کچھ تحریریں ہیں جو قدرے ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ بحر المعانی دراصل سید محمد بن جعفر مکی کی تالیف ہے۔ (م ۔ ۸)

کتب منظومات

۳۶۔ ۳۷۔ کلیات یا دیوان شیخ سعدی ۔ یہ عام نسخہ کلیات سعدی کا ہے۔ مگر یہ اتفاق سے مکمل ہے اور عمدہ ہے۔ اس میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس کے آخیر میں یوں ہے "تمام شد ملک شمس الدین تاریکوی ۔ معہ رسالا تہا" (م ۲۴ و م ۴۲)

۳۸۔ کلیات خسرو ۔ یہ نسخہ مطلا مذہب ہے اور اس پر نام مطلع الانوار درج ہے۔ مگر ورقہ ورقہ ہو رہا ہے۔ اتفاق سے مصور بھی ہے۔ بغور دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ کلیات خسرو کا نسخہ ہے اور اب یہ ضائع ہو رہا ہے۔ اس کے اندر یہ بھی ملتا ہے:۔

"تم الکتاب الصواب الموسوم بشیریں خسرو فی الرابع وعشرین من شہر رجب المرجب سنہ ۹۹۹ھ

علی ید العبد درویش علی الانصاری غفراللہ لہ ولوالدیہ (م ۲۹)

۳۹۔ دیوان باقر۔ یہ دیوان عمدہ طریق پر کتابت شدہ ہے اور ہر حالت میں مکمل ہے اس کے آخر میں یوں لکھا ہے:۔

بتاریخ بست ویکم شہر شوال در بلدۂ فاخرہ لاہور باتمام برسر نیت فقیر حقیر محمد حسین سنہ ۱۰۲۳ھ

باقرخاں دراصل عہد جہانگیری میں ہندوستان آیا اور یہاں جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں رہا جبکہ اس نے اپنی غزلیات کا مجموعہ تیار کیا۔ اس کا پورا نام یہ ہے "مرزا محمد باقر نجم ثانی" اس کے کلام سے اس عہد کے ہند کی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ (م۔ ۵)

۴۰۔ نظم خاقانی۔ اس نسخہ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ (م ۴۴)

۴۱۔ دیوان اسیر۔ اس کو غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ تمام کا تمام دیوان اسیر یعنی جلال الدین اسیر بن مرزا مومن اصفہانی متوفی سنہ ۱۰۴۹ھ کا ہے۔ اس کی تقطیع چھوٹی ہے مگر باہر دیوان ہاتفی و دیوان اسیر لکھا ہے۔ (م ۱۱)

۴۲۔ بوستانِ سعدی۔ یہ نسخہ چھوٹی تقطیع کا ہے۔ شیخ سعدیؒ متوفی سنہ ۶۹۱ھ نے اسے سنہ ۶۵۵ھ میں لکھا۔ مگر اس نسخہ میں کوئی خاص ندرت نہیں ہے۔ اور نہ تاریخ وغیرہ ہے۔ (م ۴۰)

۴۳۔ یوسف زلیخا جامی۔ یہ نسخہ بہت ادنیٰ درجہ کا ہے اور کوئی خاص اہمیت اس کے اندر نہیں ہے۔ مشہور مولانا جامیؒ متوفی سنہ ۸۹۸ھ نے اسے سنہ ۸۸۸ھ میں لکھا تھا۔ (م ۴۶)

۴۴۔ خمسۂ نظامی۔ یہ عام مکمل نسخہ خمسہ ہے مگر اس کی ابتدائی لوح اور دو صفحے خوب مطلاو مذہب ہیں۔ اس کا خاتمہ یوں ہوتا ہے۔

تم الکتاب خمسہ نظامی فی لیلۃ العشرین شہر محرم الحرام سنہ عشرین وتسع مائۃ الہجریۃ علی ید العبد الضعیف النحیف المحتاج الی رحمۃ اللہ الملک الغنی محمود بن فقیہ احمد بن محمد الکاتب الافزری حامدًا

وصلیاً۔ (م-۱)

۴۵- سکندر نامہ بحری- مگر اس کے اندر شرفنامہ یعنی سکندر نامہ لکھا ہے جو ۱۱۸۸ھ میں لکھا گیا۔ (م-۶۶)

۴۶- دیوان نجر- جس کے ابتدائی صفحہ پر لوح میں "ازیں با خبر داشتہ" لکھا ہے۔ (م-۵)

۴۷- خیالات ملا سعید اشرف- اس کے اندر یوں مذکور ہے۔ "بملکات العبدالا (؟)
مرزا عبداللہ کلیات ملا سعید اشرف بخط الیشاں" یہ نسخہ نہایت عمدہ نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس پر
ایک مہر بھی ہے جس میں یہ لکھا ہے "افوض امری الی اللہ عبدہ محمد عبداللہ ۱۱۶۲ھ"

اتفاق سے یہ نسخہ کلام استاذ شہزادی زیب النساء ہر حیثیت سے مکمل ہے اور اس کی مختصر سی تفصیل
ذیل میں درج ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہے

کردہ ام نام خدا مطلع دیوان ثنا　　مطلعے نیست بعالم بہ ازیں نام خدا

اور اس کے چند ابواب یا عنوانات یہ ہیں:-

درمدح امام ثامن علی بن موسیٰ- درمدح صاحب الزماں- درمدح استاذی قوام الانامی
آقا حسین خوانساری- درمدح استاذی شیخ الاسلام مرزا قاضی- درمدح استاذی ملک الشعراء مرزا
صائب- درمدح اعتماد الدولہ العلیہ خلیفہ سلطان- درمدح نواب علیہ زیب النساء بیگم- درطلب
نواب اشرف اعلیٰ سلطان حسین مدظلہ- درتہنیت قدوم خالوے خود آخوند ملا عزیز اللہ از سفر روم و ہند
درمرثیہ تاریخ فوت جد امجد اخوند ملا محمد تقی مجلسی درسال ع غ د ۱۰۷۰ھ واقعہ شد گفتہ۔

مقطعات:- قطعہ یاقوت- در قدغن شراب گفتہ- تاریخ آئین پل نو حسب الامر
شاہ عباس ثانی- تاریخ جلوس شاہ سلطان حسین مدظلہ- درطلب عطر از سرکار نواب علیہ زیب
النساء بیگم- بزیب النساء بیگم نوشتہ- درمعذرت بیاض آب افتادن بزیب النساء بیگم- درشکایت
کہ از عملہ بخانہ بزیب النساء بیگم- درتاریخ وفات آقا رشید لٹے خویش و مرزا صائبا کہ در یکسال واقع شدہ

تاریخ کشتہ شدن میر شمس الدین محمد گستار۔ تاریخ کشتن بابا خاں افغان دربان خاں را بحکم نواب امیر خاں۔ معمات۔ ساقی نامہ۔ بجر خسرو شیریں۔ بجر ہفت پیکر۔ بجر مخزن الاسرار۔ بجر لیلی مجنوں۔ بجر مثنوی ملا۔ بجر تحفۃ الاحرار۔ در نصیحت فرزند خود از ہند فرستاد۔ قضا و قدر۔ تعریف چراغاں داماد اعظم۔ تعریف ناز بآتش نرگسی دوز اختراع زیب النساء بیگم۔

غزلیات۔ مطلع۔ وحسن مطلع۔ رباعیات —— آخر

اشرف توکیست نکتہ رانی رانی   اسرار رموز جا و دانی رانی

ہر چند کہ مانند نداری در خط   در شیوۂ تصویر بمانی مانی

۴۸ درمکنون۔ انتخاب مثنوی۔ اعنی عبدالفتاح الحسینی العسکری مجموعہ را موسوم بدرمکنون کرد—— سرافرازی ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ۔

اس کی اول نظم میں یوں ملتا ہے ؎

باد از فضل وجود عالمگیر   باد از فیض ولطف شاہ زماں

بخت سور و رعب آسودہ   ملک معمور و نور دل خنداں

نہادم نام ایں درمکنون   تا نذر من نسخہ ایں کون"؟

اتمام تالیف مثنوی معنوی مسمّی درمکنون روز دوشنبہ وقت ضحٰی بسیتم شہر ذی القعدہ سنہ یکہزار و ہفتاد و پنج ہجری النبوی در دار الملک شاہ جہاں آباد کہ مخصوص است۔

ایک اور مخطوطہ ملحق ہے جس کا اخیر یوں ہے "سوم ماہ شوال سنہ ۱۰۹۲ھ اندروں قلعہ شہر پناہ دولت آباد در عمل حلقہ داری خان والاشان سید مبارک خاں بجہت صاحبزادہ برگزیدہ اولاد نبی وولی سید شبیر علی۔ نوشتہ شد کاتبہ علی خان۔

۴۹ جواھر اسرار اللہ۔ اور اسی مخطوطہ کے ساتھ ایک اور مخطوطہ اسی ہاتھ کا لکھا ہوا

ملحق ہے جو دراصل شاہ علی گامدھنی کی کتاب جواہر اسرار اللہ کا نسخہ ہے اور میں نے اس کا مقدمہ احتیاطاً نقل کرلیا۔ جو یہاں پیش کیا جاتا ہے اور یہ خالی از دلچسپی نہیں:۔

"وبہ اتقی الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ علی سلطان المرسلین خاتم النبیین حبیب رب العالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی الہ واصحابہ اجمعین ۔ اما بعد حمد و درود میگوید بندۂ حقیر یکی از کمینہ مریدان و خاک روبان تاج العاشقین شاہ عمر منظر رحمۃ اللہ ابن حضرت غوث الثقلین شاہ علی نور اللہ المسمیٰ ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمٰن القرشی الاحمدی کہ مکاشفات حضرت بندگی سیدی و مرشدی و شیخی و شیخ العالم المخاطب من حضرت اللہ تعالیٰ الخمسۃ عشر قطاب و بعضے ازاں قطب اقطاب العالم غوث الاعظم سلطان العارفین شاہ علی محمد شفیق اللہ الحسینی الاحمدی ابا الحسنی القادری، اما ابن حضرت قطب العالم شاہ ابراہیم جمال اللہ ابن حضرت غوث الثقلین شاہ علی نور اللہ ابن حضرت غوث الاعظم شاہ عبدالرحیم محبوب اللہ ابن حضرت امام الافراد شاہ عمر جلیس اللہ ابن حضرت سلطان الواصلین شاہ ابراہیم کنز معرفۃ اللہ ابن امام الافراد سید محمد معدن حجۃ اللہ ابن حضرت غوث الاعظم سلطان العارفین سلطان سید احمد کبیر معشوق اللہ الحسینی الموسوی اباالحسینی الرفاعی رضی اللہ عنہم کہ آنحضرت بلسان دربار و جوہر نثار بطریق نظم بالفاظ گوجری بزبان مبارک خود فرمود۔ در بیان اثبات توحید و وجود واحد با دلائل و براہین عقلی و نقلی و تمثیلات آں و اسرار اللہ تعالیٰ کہ دریں مختصر آوردہ و جمع کردہ شد و آں ملفوظ را کتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتم وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد رسول اللہ حبیب الرحمٰن وعلی الہ واصحابہ اجمعین۔

اول نظم یوں شروع ہوتی ہے:۔

مکاشفات دربیان توحید باری تعالیٰ مکاشفۃ الالف نکتہ اول درعقیدہ ؎

آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں آپیں آپس لیگل لانوں

اس کے کل ۸۴ اوراق ہیں فی صفحہ دس سطور ہیں۔

شاہ علی جیوگام دھنی متوفی سنہ ۹۷۳ھ سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں ہیں اور قطب عالم شاہ ابراہیم بن شاہ عمر الحسینی الاحمدی کے فرزند ہیں اور جواہر اسرار اللہ کی دو اشاعتیں ہیں پہلی اشاعت شاہ علی جیوگام دھنی کی زندگی میں تیار ہوئی جسے اُن کے مرید شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن القریشی الاحمدی نے کی۔ دوسری اشاعت آپ کے نبیرہ سید ابراہیم ابن شاہ مصطفےٰ حبیب اللہ شاہ علی محمد نے کی جو آپ کے مرید بھی ہیں (اورنٹیل کالج میگزین فروری سنہ ۱۹۳۱ء)

گر مقدمہ مندرجہ بالا از مخطوطہ بیجاپور میں بجائے "شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن" کے "ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمٰن القریشی" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(م ۲۲)

۵۰۔ چند اوراق نظم جو بہت عمدہ خوشخط لکھے ہوئے ہیں۔ مگر ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے

۵۱۔ "مثنوی شریف" کا نسخہ ہے۔ اور یہ سنہ ۱۰۳۰ھ کا لکھا ہوا ہے جیسا کہ آخر میں درج ہے۔ سائز بڑا ہے۔ (م ۲۳)

۵۲۔ قصائد حکیم خاقانی ۔ متداول نسخہ ہے مگر ورقہ ورقہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ مطلا و مُذہب ضرور ہے۔ اس کے آخر میں یوں لکھا ہے۔

تمت القصائد ملک الفصحا و البلغا حکیم کمال الدین خاقانی رحمۃ اللہ علیہ

اور جگہ یوں ملتا ہے:۔

"خاقانی شروانی بعون الملک الوہاب تم الکتاب" (م ۔ ۳۱)

(باقی)

دِلّی کا مغل تاجدار

جدید تاریخی تحقیق کی روشنی میں

از جناب ہدایت محسنی صاحب ایم اے

(۲)

بہادر شاہ نے ۱۸۴۳ء میں مسٹر جارج تھامسن کو اپنے سفیر کی حیثیت سے انگلستان روانہ کیا۔ تاکہ وہ ان تمام شاہی حقوق اور مطالبات کو ادارۂ عالیہ انگلستان کے ذریعہ سے ملکۂ معظمہ کے سامنے پیش کرے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسرانِ اعلیٰ نے ناقابل التفات سمجھ کر ہر ایک موقعہ پر ٹھکرا دیے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس اقدام سے بہادر شاہ کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ جہاں تک مسٹر تھامسن کے انتخاب کا تعلق ہے اس کی پُر خلوص شخصیت ہر طرح اعتماد کی مستحق تھی۔ مگر برطانوی قضا و قدر کے رحم و کرم پر تکیہ کرنا بادشاہ اور مشاہیرِ دربار کی سادہ لوحی کا ایک نہایت المناک منظر پیش کرتا ہے۔ اس سلسلہ کی تمام جدّ و جہد کا لبِ لباب مسٹر تھامسن کی مساعی جلیلہ، بادشاہ کی موثر اپیل اور مجلس ڈائرکٹران کے تفصیلی مراسلہ سے بخوبی ذہن نشین ہوسکتا ہے۔

۶۔ واٹرلو پلیس

پال مال۔ ۱۹ مارچ ۱۸۴۴ء

بخدمت جناب رائٹ آنریبل ارل آف رپن

عالیجاہا! میں جناب کی خدمت میں ہمرشتہ ہٰذا شاہی نامہ کا ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا

ہوں جو مجھے ملک معظم شاہِ دہلی نے ملکہ معظمہ بالقابہ کی جناب میں پیش کرنے کے لیے تفویض کیا ہے۔
اس مسودہ سے یہ بات روشن ہو جائیگی کہ مجھے شاہِ دہلی کے وکیل ہونے کا اعزاز بخشا گیا ہے۔ چنانچہ میں
اپنا فرض محسوس کرتا ہوں کہ جناب والا کو اُن واقعات سے روشناس کراؤں جن کے ماتحت میرا تقرر عمل
میں آیا ہے اور اس کو میں نے بدل قبول کیا ہے۔

۱۶۔ مارچ ۱۸۴۳ء کو جب میں کلکتہ میں تھا حکیم سید حمید حسین خاں مجھ سے ملنے کے لیے آئے
اور مجھے تبلایا کہ وہ ملک معظم بادشاہِ دہلی کی طرف سے تشریف لائے ہیں۔ بادشاہ اپنی جملہ شکایات اور
مطالبات حکومتِ برطانیہ کے علم میں لانے کے خواہشمند ہیں اور اس خدمت کے لیے بحیثیت سفیر
اور معتمد میرا نام ان کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ سید حمید حسین کو یہ ہدایات تھیں کہ اس سلسلہ میں وہ میرا
عندیہ معلوم کریں کہ امورِ شاہی کو ملکۂ انگلستان کی جناب میں پیش کرنے کی خدمت اپنے ذمہ لینے میں مجھے
کوئی پس و پیش تو نہیں ہے۔ معاملات فہمی کے بعد میں نے تحریری طور پر گذارش کیا کہ میں ملک معظم کی
ہر وہ خدمت انجام دینے کے لیے کمربستہ ہوں جو برطانیہ عظمیٰ کا وفادار شہری ہونے کی حیثیت سے مجھ
پر عائد کی جاسکتی ہیں۔ میری یہ عرضداشت ملاحظہ فرمانے کے بعد ملک معظم نے شاہی خاندان کے ایک
معتبر افسر حکیم احسان اللہ خاں بہادر کو اس مہم پر دہلی سے کلکتہ روانہ کیا تاکہ وہ امور متعلقہ کے بارہ میں
مجھ سے مشاورت کریں اور بعہدۂ سفارت میری تقرری کی سند عطا فرمائیں۔ موصوف کو یہ بھی
ہدایات تھیں کہ ملک معظم کی حضور میں باریاب کرانے کے لیے اپنے ہمراہ مجھے دہلی لے چلیں۔ ۲۱۔ جون
کو بعزم دہلی میں الہ آباد پہنچا اور اُسی روز گورنر جنرل کے سکرٹری کے نام جو اُس وقت وہاں موجود تھے ایک
عریضہ ارسال کیا۔ اس میں میں نے گورنر جنرل بہادر کو اپنے تقرر اور ملک معظم کی حضور میں عزم باریابی
سے مطلع کیا تھا۔ جواب دیا گیا کہ گورنر جنرل شاہی امور کے متعلق جملہ مراسلات صرف متعینہ سرکاری
وسائل سے وصول فرما سکتے ہیں۔ اور یہ کہ ملک معظم کو خود گورنر جنرل کے وکیل مقیم دہلی مسٹر ٹی۔ ٹی

میٹکاف سے اس سلسلہ میں خط وکتابت کرنی چاہیے۔

۲۲۔جون کے دوسرے عریضہ میں میں نے گورنر جنرل سے اجازت چاہی کہ مجھے ملک معظم کے معتمد مشاورت ہونے کی حیثیت سے باریابی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ونیز یہ بھی عرض کیا کہ مجھے حضور گورنر جنرل کی خدمت میں شاہی امور اور اپنے مقصدِ باریابی کے بارہ میں مطلوبہ معلومات بہم پہنچانے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں ہے۔

۲۳۔جون کے تیسرے عریضہ میں میں نے یہ استدعا کرنے کی جرأت کی کہ وکیل گورنر جنرل مقیم دہلی کو ایسی ہدایات روانہ کردی جائیں جن کی روسے گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں غیر اہم مراسلت روانہ کرنے کی ضرورت نہ رہے اور فروعی تفصیلات بغیر طوالت طے ہوجائیں۔

میرے دربار شاہی میں باریاب ہونے کے بعد ۱۹ جولائی تک ملک معظم اور آنریبل مسٹر جارج کلارک لفٹنٹ گورنر شمالی مغربی صوبجات کے درمیان خط وکتابت ہوتی رہی۔صاحب موصوف کی خدمت میں میں نے بھی ایک عریضہ ارسال کیا جس میں اپنے تقرر کی ماہیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ استدعا کی کہ مجھے اپنی اہم خدمات کے بارہ میں ملک معظم سے بلاواسطہ خط وکتابت کرنے کی اجازت دی جائے۔اس خط وکتابت کے دوران میں لفٹننٹ گورنر نے ملک معظم کو اطلاع دی کہ اُن کو بحیثیت وکیل شاہی میرے تقرر اور سفارت انگلستان کے سلسلہ میں کوئی اعتراض نہیں ہے، ملک معظم یہ راہِ عمل ضروری سمجھتے ہیں تو اختیار کریں۔

ملکِ معظم کی یہ خواہش بھی منظور کرلی گئی کہ وہ مجھے شاہی وکیل کی حیثیت سے اعزازی خطابات سے سرفراز فرماسکتے ہیں۔اس نوعیت سے یہ مسائل طے ہونے کے بعد مجھے ۱۲۔اگست کو رسمی طور پر دربار میں باریابی کا موقع دیا گیا۔اس موقع پر مجھے خلعت اور خطابات سے معزز فرمایا گیا۔

۷۔نومبر تک میں ملک معظم کی خدمت میں دہلی مقیم رہا اور اپنے عہدہ سے متعلقہ خدمات انجام

دیتا رہا۔ شاہی رسوم کے مطابق رخصت ملنے پر میں بعزمِ انگلستان کلکتہ روانہ ہوا۔

ملک معظم کے جملہ معاملات اور میرے تقرر کے کاغذات حکومتِ ہند کی وساطت سے خدمت عالی میں روانہ کیے جا چکے ہیں۔ اب مستدعی ہوں کہ آنجناب براہ نوازش مجھے آگہی بخشیں کہ شاہی نامہ کو حضور پُر نور ملکہ معظمہ کی خدمت میں کس صورت سے پیش کیا جائے۔

اگر آنجناب خادم کو اعزازِ باریابی کے لائق تصور فرمائینگے تو حسب ارشاد حاضر خدمت ہونے میں انتہائی افتخار اور مسرت حاصل کرونگا۔ فقط

(دستخط) جارج تھامسن ایجنٹ شاہ دہلی۔

مندرجہ بالا درخواست گذرانے پر اولاً مسٹر تھامسن کو مایوس ہونا پڑا کیونکہ اراکین ادارہ عالیہ انگلستان نے بادشاہ دہلی کی طرف سے براہِ راست مراسلت کو غیر آئینی قرار دے کر مسترد کر دیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ جملہ عرائض و گذارشات کے لیے حکومتِ ہند کا سرکاری توسل ضروری ہے مگر مسٹر تھامسن کی جان توڑ کوششوں اور اکثر با اثر حلقوں کی معاونت سے خصوصی مراعات اور شاہی اکرام والطاف کو کام میں لا کر درخواست پر غور کرنا منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ بہادر شاہ کا مندرجہ ذیل اپیل ادارہ عالیہ کا شرف ملاحظہ حاصل ہونے پر مجلس ڈائرکٹران کے سپرد کر دیا گیا۔

شقہ شاہی منجانب ملک معظم ابوظفر محمد بہادر شاہ بخدمت فیض درجت ملکہ معظمہ وکٹوریہ فرمانروائے برطانیۂ عظمیٰ، آئرلینڈ و ممالکِ محروسہ

علیا حضرت کی آگاہی کے لیے نگارش ہے کہ عالی مرتبت امیر تیمور نے روزِ اوّل ہی سے جب کہ وہ اعانتِ خداوندی سے مملکتِ ہندوستان پر کامران و حکمران ہوئے اپنا یہ نصب العین بنا لیا تھا کہ مستحقین کے حقوق دلانے اور امورِ مملکت میں رحم و کرم سے کام لینے کو اپنا اولین فرض تصور کرینگے۔

بنابریں ہندوستان کی وسیع وبسیط حکومت پر قابض ہوتے ہی شاہ تیمور نے تمام مفتوحہ علاقے اُن کے جائز وارثوں کے سپرد کردیے۔ اور اپنی مشہور خلائق بلند حوصلگی اور آزادروی کا سکہ ہر دل میں قائم کردیا۔ ان کے عام عدل وانصاف کے رویہ نے یہ بات پوری طرح ثابت کردی کہ باہمی اختلافات اور کمزوریوں کے باوجود تمام رؤسائے ملک اُن کے لیے یکساں ہمدردی اور دلچسپی کا مرکز ہیں۔ شاہ تیمور کے اس جذبۂ انصاف وکرم کو ان کے تمام ورثا اور جانشینوں نے بھی اپنے لیے شمع ہدایت بنائے رکھا کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہی لائحہ عمل فرمانروائی کی کٹھن منازل میں خدا کی مقبولیت اور انسانی بہبود کا حامل ہے۔ رعایا کے مفاد اور شاہی تعلقات کی توسیع کے خیال سے شاہانِ دہلی نے وقتاً فوقتاً بیرونی مملکتوں سے بھی تعلقات قائم کیے۔ چنانچہ مشہور عالم ملکہ الیزبتھ فرمانروائے انگلستان اور نامور شہنشاہ اکبر اعظم شہنشاہِ ہندوستان کے درمیان جو دوستانہ تعلقات تاریخِ عالم کی رونق بنے وہ اسی شاہی مصلحت کا تقاضا تھے۔ الحمد للہ شاہانہ تعلقات کا وہ شجرِ بارآور جو سنہ ۱۶۰۰ء میں نصب کیا گیا تھا سنہ ۱۷۶۵ء تک خوب پھولا پھلا۔ خاندانِ تیموریہ کے ہر ایک جانشین نے اپنے وسیع شاہی اختیارات اور بلند پایہ اقتدار کو استعمال کرتے ہوئے ہمیشہ یہ احتیاط مدنظر رکھی کہ ہر دو ممالک کے مابین خوش معاملگی برقرار رہے۔ چنانچہ مملکتِ انگلستان سے عہد بعہد جو سفیر آتے رہے اُن سے مغل دربار میں پوری مراعات برتی گئیں اور شاہی تعلقات کی خوشگواری کے تحفظ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔

شاہی تعلقات کی تفصیل پیش کرنا ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ سلطنت مغلیہ کے دورِ آخر میں مسلسل نامساعد واقعات پیش آتے رہے اور بدکیش ملازمینِ سلطنت نے پس پردہ غداری کو اپنا پیشہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی طاقت اور اقتدار کو کافی صدمہ پہنچا۔ چنانچہ اینجانب کے جدِامجد شہنشاہ شاہِ عالم کے عہد میں بہت کچھ وسائلِ دولت زائل ہوگئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر

کے سرکاری ملازمین نے ۱۸۰۳ء میں قدیم تعلقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان پُرآلام ایام میں دستِ اعانت پھیلایا اور ملک معظم کو ان بدبخت اثرات سے نجات دلانے کے لیے جو شاہی اقتدار کے زوال کے درپے تھے ہر ممکن امداد کا پُرخلوص وعدہ کیا اور ملک معظم شاہِ عالم نے برطانوی حکومت کے خلوص پر اعتماد کرتے ہوئے اقدامِ اعانت کو سندِ قبول بخشی۔ لارڈ ویلزلی اور لارڈ لیک کے مشوروں اور مساعی جمیلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ ممدوح نے دشمنوں کے نرغے سے نجات حاصل کی، اور از سرِ نو شاہی اقتدار کا استحکام عمل میں آیا۔ گویا اس طریقہ سے ہمارے قدیم تعلقات کی تجدید عمل میں آئی۔ ما بدولت برطانیہ کے ان اقدامات کو ہمیشہ نظر استحسان سے دیکھتے رہے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ تا حال ہر برطانوی مدبرِ سیاست اور گورنر جو برطانوی مقبوضات پر حکومت کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا مغل خاندان کے ساتھ پورے اعزاز و احترام کے ساتھ پیش آتا رہا ہے اور ہماری آسائش اور رضامندی کا خواہاں رہا ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ دور کے افسرانِ بالا نے اپنا رویہ بدل دیا ہے۔ اب اُنہوں نے کچھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا ہے جس کی بنا پر ہماری حکومت کا اقتدار اور نیک نامی خطرہ میں ہے۔ شاہی احترام اور درباری آداب کے جو آئین اب تک رائج تھے اور جن پر قدیم گورنر وغیرہ ہمیشہ عمل پیرا رہے ہیں اب دفعتہً نظر انداز کئے جا رہے ہیں۔ اس ناروا برتاؤ سے اینجانب کو پیرانہ سالگی میں قلبی تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اور اینجانب بادلِ ناخواستہ ان واقعات کی بنا پر علیا حضرت کی تکلیف کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ تاہم ہمیں توقع ہے کہ آں بدولت قدیم مراسم اور دوستانہ تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری شکایتوں کے رفع کرنے سے دریغ روا نہ رکھینگی۔

شاہی عرضداشت علیا حضرت کے سامنے پیش کرنے کے لیے ہمنے مسٹر جارج تھامسن کو مقرر کیا ہے۔ اور ان کو سفیر الدولہ، مشیر الملک بہادر، مصلح جنگ کے خطابات سے سرفراز فرمایا ہے

موصوف برطانوی رعایا ہونے کی حیثیت سے برطانوی تخت وتاج کے سچے وفادار اور بہی خواہ ہیں اور ساتھ ساتھ ہمارے خاندان کے بھی ہمدرد ہیں۔ اینجانب کو ان کی ذات پر کلی اعتماد ہے ہم نے ان کو ایک شاہی سند بھی عطا فرمائی ہے تاکہ وہ سلطنتِ تیموریہ سے متعلقہ امور علیا حضرت کی حکومت کے ادارۂ عالیہ کے سامنے پیش کرنے کے مجاز ہوں۔

مسٹر جارج تھامسن کو شاہی مراسم کی ادائگی کے بعد، نومبر ۱۸۴۳ء کو دربار سے رخصت کیا گیا۔ علیا حضرت کی انصاف پسندی، شہرۂ آفاق غیر جانب داری، اور مستحقین کی حق گذاری کے اوصاف روزِ روشن کی طرح معروف ہیں اور تمام دنیا اُن کی معترف ہے۔ اس لیے ہمیں کامل یقین ہے کہ اُن خوشگوار تعلقات اور ارفع جذبات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جو ہمارے اجداد کی خصوصیت رہے ہیں ہمارے دوستانہ حقوق کو فروگذاشت نہ فرمائینگی۔ تاریخ شاہد ہے کہ برطانیہ کے وکلاء اور سفراء جب بھی مغل دربار میں باریاب ہوئے ہیں اُن کا استقبال پورے اعزاز واحترام سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم بھی متوقع ہیں کہ اسی طرح ہمارے سفیر سے بھی عزت واحترام کا معاملہ کیا جائیگا۔

ناماعد واقعات کی بنا پر مغل سلطنت کا پھول مرجھا چکا ہے اور اس خاندان کی مملکت اب آپ کے زیرنگین ہے۔ علیا حضرت کی فرمانروائی دیارِ ہندوستان میں مستحکم ہو چکی ہے۔ اور اگرچہ بحالتِ موجودہ برطانوی طاقت ہمارے اقتدار اور حقوق کو پامال کرنے یا بحال کرنے پر قادر ہے۔ تاہم ہمیں قوی اُمید ہے کہ اُس انصاف اور محبت کے جذبہ کے ماتحت جو قادرِ مطلق نے علیا حضرت کو ودیعت فرمایا ہے۔ ہندوستان کے شاہی خاندان کی قدیم روایات کو باقی رکھنے میں دریغ نہ فرمائینگی۔ کمزوروں اور درماندوں کی پشت پناہی آپ کی مسلمہ خصوصیت ہے اور حاجتمندوں کی طرف دستِ کرم بڑھانا ایک مشہور حقیقت ہے۔

عمر رسیدگی کے باعث اینجانب کو جاہ وثروت کی خواہش نہیں ہے۔ ہماری تمنا صرف

اسی قدر ہے کہ باقی ماندہ زندگی مشاغلِ دینی میں صرف کردیں۔ لیکن ساتھ ساتھ اس آرزو سے روگردانی بھی ممکن نہیں کہ ہمارے اجداد کا اقتدار اور اس شاہی خاندان کی خوشنامی برقرار رہے۔ اور ہماری اولاد بھی اس آبائی اعزاز کا ترکہ حاصل کرے۔ ہماری ان خواہشات کی تکمیل از روئے معاہدات حکومتِ برطانیہ پر واجب ہے۔ چنانچہ علیا حضرت کے ارفع خصائل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری استدعا ہے کہ قدیمی تعلقات کے اقتضا پر غور فرمائیں اور برطانوی افسران ہندوستان کو ہدایت صادر فرمادیں کہ وہ ہمارے اُن تمام شاہی حقوق کی حفاظت کریں جو اجمالاً علیا حضرت کی خدمت میں ذکر کیے گئے ہیں۔ برطانوی افسرانِ بالا کی ذمہ داریاں بہت وسیع ہیں کیونکہ تمام رؤسائے ہندوستان ان کے دامنِ عافیت میں پناہ گزیں ہو چکے ہیں۔

آخر میں ہم یہ استدعا کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں کہ ازراہِ نوازش ہماری گذارشات کے اظہار اور علیا حضرت کے جواب باصواب کے بعد ہمارے مذکورہ صدر سفیر مسٹر جارج تھامسن کو واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

ملکہ معظمہ کے دورِ حکومت پر امن و امان اور ترقی و کامرانی کی رحمتیں دائم و قائم رہیں۔ فقط"

بہادر شاہ ظفر کے مندرجہ بالا شقہ کے بعد جس میں انتہائی عجز و انکسار سے طلبِ رحم کی درخواست کی گئی ہے اس سلسلۂ مکاتیب میں کوئی ایسا مشمولہ دستیاب نہیں ہوتا جو بادشاہ کی شکایات اور طلب حقوق کی تفصیل پر صحیح روشنی ڈالتا ہو۔ تاہم یہ خیال کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں کہ جس مہم کو سر کرنے کے لیے مسٹر تھامسن کو انگلستان بھیجا گیا تھا وہ درد اور دکھ کے صرف اجمالی بیان تک ہی محدود رکھی گئی ہو۔

درخواست طویل ہو یا مختصر، برطانوی آئینِ سیاست کے تمام مراحل طے ہونے کے بعد جواب وہی دیا گیا جو اگر ان تکلفات کے بغیر بھی دے دیا جاتا تو شاید کچھ مختلف نہ ہوتا یعنی حکومتِ ہند

کے فیصلے سے روگردانی کی گنجائش نہیں۔ حکومت ہند کا فیصلہ کیا تھا اور اُس نے بادشاہ کے معاملہ سے کیا رواداری برتی تھی یہ بات مجلس ڈائرکٹران کے مندرجہ ذیل مراسلہ سے بڑی حد تک واضح ہوجاتی ہے۔

اس مراسلہ میں ان متعدد عرضداشتوں کے حوالہ سے جواب تحریر کیا گیا ہے جو بدنصیب بادشاہ اپنی پُرخلوص توقعات کے سہارے وقتاً فوقتاً تحریر کرتا رہا تھا۔ چنانچہ اس مراسلہ سے ہم اُن عرضداشتوں کے مفہوم کا بھی صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مراسلہ مجلس ڈائرکٹران بنام حکومت ہند بر بنائے امور شاہی

ا۔ سیاسی سرگذشت آگرہ بابت ماہ اپریل، مئی اور جون کے پیرے نمبر ۱۵۔ اور ۲۵ کے ہمراہ شاہ دہلی کی جانب سے ایک عرضداشت جو ۱۲ دفعات پر مشتمل تھی اور گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی موصول ہوئی۔ اس کے بعد وہ تمام خط وکتابت بھی وصول ہوگئی جو پولیٹیکل ایجنٹ اور محافظین قلعہ کے افسر اعلیٰ کی طرف سے بہادر شاہ کی حضور میں نذر پیش نہ کرنے کے سلسلہ میں شہزادہ اور گورنر جنرل کے مابین عمل میں آئی تھی۔

۲۔ اسی دوران میں محکمہ خارجی کا ۲۵۔ جون کا وہ خط بھی ملا جس کے ساتھ شاہ دہلی کی طرف سے مجلس ڈائرکٹران کے نام ایک خط منسلک تھا۔

۳۔ بادشاہ کی جانب سے جو گذارشات پیش کی گئی ہیں اور جن حقوق کا اعادہ کیا گیا ہے اُن میں سے کچھ تو شاہی اقتدار کے برقراری کے بارہ میں ہیں اور کچھ شاہی وظیفہ سے متعلق ہیں۔

۴۔ اول الذکر گذارشات اُن بے بنیاد دعووں کی حامل ہیں جو یہ خاندان اپنے حقِ حکمرانی اور اقتدار شاہی کے سلسلہ میں ہمیشہ پیش کرتا رہا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

خاندانِ شاہی کے دیرینہ خیرخواہ، والیانِ ریاست اور عمائدین سلطنت یا اُن کے وکلاء

کے لیے دربار شاہی میں حاضر ہوکر نذر گزراننا ضروری قرار دیا جائے۔ اور دیرینہ رسوم کے مطابق بادشاہ کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ باریاب امرا اور عمائدین کی استدعا پر اُن کو خلعت اور خطابات سے سرفراز کر سکے۔

شاہی پیمانوں اور سکوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے۔ اور قلعہ میں ایک ٹکسال کا قیام بھی منظور کیا جائے، کیونکہ یہ بادشاہ کا امتیازی حق ہے اور حکومت برطانیہ کے ماتحت بحالت موجودہ یہ حقوق ایک ایسے شخص[1] کو حاصل بھی ہیں جو شاہ دہلی سے بہمہ وجوہ کم درجہ ہے۔

نیا قانون جس کی رو سے برطانوی عہدہ داروں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ کے اعزا سے مساویانہ طور پر خط و کتابت کر سکتے ہیں منسوخ کر دیا جائے اور آئندہ یہ احکام جاری کر دیے جائیں کہ سابق دستور کے مطابق برطانوی افسر شاہی خاندان کے افراد کو عرضداشت کی صورت میں مخاطب کریں۔ مساوات کا یہ نیا طریقۂ کار ایک طرف شاہی خاندان کے لیے باعثِ توہین ہے اور دوسری طرف برطانوی افسران کیلیے اس میں کوئی خاص مفاد مضمر نہیں ہے۔

۵۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی گذارشات کسی صورت سے بھی قابل پذیرائی نہیں ٹھہرائی جا سکتی ہیں۔

۶۔ ایک اور مطالبہ یہ ہے کہ بادشاہ کو شاہی جاگیر اور شاہی عمارتوں پر کلی اختیار دے دیا جائے۔ بلکہ جاگیر اور عمارتوں کے متعلقہ امور میں بادشاہ کی امداد کا ذمہ بھی لیا جائے۔ و نیز حمید خاں، دوبے سنگھ وغیرہ کو جو شاہی جاگیر پر قبضہ کیے ہوئے ہیں اور شاہی ملازمین کی مخالفت پر کمربستہ ہیں بے دخل کر دیا جائے اور اُن پر یہ واضح کر دیا جائے کہ اگر بادشاہ کے خلاف اُن کے کچھ مطالبات نکلتے ہیں تو اُن کے لیے چارۂ کار صرف یہی ہے کہ وہ خود بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوں اور حساب

[1] روہیلہ سردار۔

پیش کر کے لین دین طے کریں۔

۷۔ شاہی آراضی کے بارہ میں جو دشواریاں بادشاہ کو پیش آرہی ہیں اُن کی خاص وجہ یہ ہے کہ کوٹھی قاسم کے علاوہ بادشاہ کے املاک برطانوی حکومت کے حدود میں واقع ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان پر ملک معظم کو خود مختارانہ حقوق حاصل نہیں۔ ان اراضی کے سلسلہ میں بادشاہ کی حیثیت دوسرے جاگیرداروں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور مزید استحقاق پیش کرنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے۔ ان دشواریوں کو حل کرنے کے لیے گورنر جنرل بہادر پہلے ہی اپنی رائے کا اظہار فرما چکے ہیں کہ اگر ملک معظم کو شاہی جاگیر کے انتظام میں مشکلات درپیش ہیں تو وہ معقول معاوضہ لے کر اس کے انتظام سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ مگر تجربہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کو یہ سہولت پسند نہ ہوگی۔

۸۔ ملک معظم کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ جملہ شاہی عمارات اور دیگر جاگیریں جو ان سے وقتاً فوقتاً لے لی گئیں ہیں واپس کر دی جائیں لیکن یہ ظاہر نہیں ہو سکا کہ اس مطالبہ سے اُن کا اشارہ کن خاص املاک کی طرف ہے۔

۹۔ بادشاہ کی ایک استدعا یہ بھی ہے کہ اُن کے خلاف دعاوی کی برطانوی عدالتوں میں سماعت نہ کی جائے۔ بلکہ اس قسم کی تمام شکایات خود اُن کے دربار میں پیش کر دی جائیں۔ اس مسئلہ پر حکومتِ ہند مبسوط قوانین مرتب کر چکی ہے جو ہمارے سیاسی مراسلات مورخہ ۲۰ ستمبر دسمبر ۲۴ء ستمبر ۱۸۴۱ء کے پیراگراف نمبر ۱۷ میں مذکور ہیں۔ یہ آئیں بادشاہ کے پاس کوئی وجہ شکایت باقی نہیں چھوڑتے ہیں۔

۱۰۔ ملک معظم نے یہ مطالبہ بھی پیش کیا ہے کہ شاہی خاندان کے افراد کی طرف سے جو درخواستیں وظیفہ کے بارہ میں شاہی سند کے بغیر براہِ راست خزانہ میں بھیجی جائیں وہ منظور نہ کی جائیں۔ ہماری بھی دلی خواہش یہی ہے کہ ہماری جانب سے کوئی ایسا اقدام نہ ہو جو ملک معظم کے اُن جائز اختیارات میں جن کا خاندان کا ولی ہونے کی حیثیت سے اُن کو استحقاق ہے کسی طرح بھی حائل ہو۔ لیکن ظاہر ہے

کہ جب ہمارے جاری کئے ہوئے وظیفے بادشاہ مستحقین کو نہ دینگے تو ہمارے لیے بجز اس کے اور کیا چارۂ کار ہے کہ ہم خود وہ وظائف حقداروں تک پہنچائیں۔ تاہم یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرزِ عمل صرف خاص صورتوں ہی میں استعمال کیا جائے۔ اور مخصوص حالات میں بھی ملک معظم کے جذبات کا خیال رکھا جائے۔

۱۱۔ ایک اور شکایت جس پر بادشاہ نے زیادہ زور دیا ہے یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے نذر گزراننے کی رسم بند کر دینے سے شاہی اقتدار کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔

۱۲۔ پُرانے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے سات مخصوص تہواروں کے مواقع پر کمپنی بہادر کی جانب سے ہر دفعہ دس ہزار کی رقم پیش کی جاتی تھی۔ یہ رقم نومبر ۱۸۰۵ء میں شاہی وظیفہ میں چھ ہزار روپیہ ماہانہ کا اضافہ کر کے ختم کر دی گئی۔

۱۳۔ ۱۸۱۳ء میں ارل آف موائرا نے اُس نذر کو بھی جو کمانڈر انچیف کی طرف سے سال میں تین بار پیش کی جاتی تھی ختم کر دیا۔ سر ایڈورڈ پیجٹ جب کمانڈر انچیف ہو کر وارد ہندوستان ہوئے تو بادشاہ نے نذر کی پیش کش کے بارہ میں استفسار کیا لیکن گورنر جنرل اور ان کی مجلس مشاورت نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ رسم کمپنی بہادر کے ہندوستانی مقبوضات پر بادشاہ کے اقتدار کو برقرار رکھتی ہے اس کی از سر نو تجدید سے انکار کر دیا۔ جب یہ فیصلہ ہمارے علم میں لایا گیا تو ۱۲ دسمبر ۱۸۲۸ء کو ہم نے جواب دیا کہ اس رسم کے ختم کر دینے میں ہمیں بالکل تامل نہیں ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۱۳ء سے برابر اس کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

(باقی)

تلخیص و ترجمہ

امریکہ میں عربی زبان کے چند شامی ادیب

عربی زبان بولنے والی قوموں کی تاریخ سے باخبر حضرات جانتے ہیں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت سے شام اور لبنان کے رہنے والے اپنے آبائی مشرقی وطن کو خیرباد کہکر کرۂ ارضی کے نصف مغربی حصہ میں چلے آئے اور آخر ۱۹۲۰ء تک ہزارہا لوگ جنوبی اور شمالی امریکہ کے شہروں میں پھیل گئے یہیں اپنا وطن بنالیا اور کاروبار بھی کرنے لگے۔ لیکن ان شامیوں اور لبنانیوں نے اپنی روایات، اپنی عادات اور معاشرت اور اپنی زبان عربی کو اسی طرح برقرار رکھا اور تین پشتیں گذر جانے کے باوجود ان چیزوں پر کوئی حرف نہیں آنے دیا، یہ لوگ امریکہ کی تہذیب و معاشرت کے بے پناہ اور نہ تھمنے والے سیلاب کے سامنے جو یقیناً ان کی روایات کو خس و خاشاک کی طرح بہالیجاتا، مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہے۔ ان کی زبان عربی، ان کے اخبارات و رسائل اور ادبی انجمنوں کے ذریعہ زندہ ہے، ان انجمنوں میں سے نیویارک کے اندر "الرابطۃ القلمیۃ المنذھرۃ" ایک اہم ادارہ ہے۔

عربوں کی نمایاں خصوصیت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ دور دراز ملکوں میں بھی ان کی باثر اور مستحکم "عربی ادبی انجمنیں" قائم ہوجاتی ہیں اور ان کی دلچسپیاں مشرقی اور مغربی زندگی کے ہر پہلو کو حاوی ہوتی ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان شامیوں نے ہر امریکی چیز کو اختیار کرلیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے موروثی شرف و امتیاز کو نہیں بھولے ہیں

امریکہ میں "شامی امریکن" اہل قلم، اخبار نویسوں، مصنفوں اور آرٹسٹوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ان میں سے کچھ مشہور ہیں اور کچھ غیر مشہور، کچھ امریکہ ہی میں پیدا ہوئے اور کچھ بچپنے میں امریکہ آئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی، ان میں سب سے زیادہ مشہور اہل قلم "امین الریحانی" ہے، یہ شخص اپنے رجحانات اور اپنی فطرت میں اپنے عرب آباؤ اجداد سے بے حد ملتا جلتا ہے، ــــ دشوار پسندی اور سیر و سیاحت سے دلچسپی اور شیفتگی میں ان کا صحیح نمونہ ہے، یہ جزیرۂ عرب کے ریگستانوں اور شہروں سے اتنا ہی واقف ہے جتنا نیویارک کی سڑکوں سے!

۱۸۷۹ء میں "امین الریحانی" فریکہ نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا، یہ لبنان میں ایک چھوٹی سی بستی ہے، امین الریحانی کے عربی اور انگریزی میں بہت سے مضامین اور کتابیں ہیں، "ملوک العرب" اس کی تصنیفات میں سب سے اہم خیال کی جاتی ہے، اس میں اپنے بچپن لڑکپن کے زمانہ میں امریکہ آنے اور اس کے بعد امریکہ نے اس کی جدید ہیئت پر جو نقوش و احساسات پیدا کئے ان کا تذکرہ کیا ہے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔

> میری عمر بارہ برس کی تھی، جب میں نے پہلی دفعہ امریکہ کی متحدہ ریاستوں کا سفر کیا، اس وقت میں تھوڑی بہت عربی اور فرانسیسی زبانیں جانتا تھا، اور میرے حافظہ میں عرب اور ان کے حالات کے متعلق صرف وہی قصے کہانیاں تھیں جو لبنان میں مائیں اپنے بچوں کو سنایا کرتی ہیں، . . . . . . امریکہ میں دس سال رہنے کے بعد مجھ پر امریکن قوم کی زندہ دلی، فکر و رائے اور قول و عمل کی آزادی نے ایک خاص اثر پیدا کیا، مگر وہاں کی مادی جدوجہد کی انجام اور دنیاوی زندگی کی دوڑ میں سخت جانکاہی سے بھی کھٹکتا رہتا تھا . . . . میں فرانس کو ضرور بھول گیا لیکن اس کے اداب اور اس کی معاشرت کا اثر نہ گیا۔ ان آدابِ زندگی کی جولانگاہ میں میری ناتوانی اور ہچکچاہٹ کو اور بڑھا دیا اور مادی وجود کے حقائق سمجھنے سے محروم

رکھا، . . . . انگریزی آداب و تہذیب نے مجھے انگریزی قوم کی طرف متوجہ کردیا اور میں نے انگریزوں کو بہت سے اخلاقی اور اجتماعی امور میں امریکن قوم سے بڑھا ہوا پایا، یا ممکن ہے وہ امور مجھ جیسی فطرت رکھنے والے انسان کی نظر میں اچھے جچتے ہوں، . . . .

. . . انگریزوں سے میرا تعارف کرانے میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے زبردست فلاسفر "ایمرسن" کو حاصل ہے، انگریزوں کے محاسن کی طرف رہنمائی کرنے میں یہ میرا سب سے پہلا رہنما ہے اس نے اپنے مضامین میں انگریزوں کی محاسن اور ان کے آداب و تہذیب کا تذکرہ کرکے میری رہنمائی کی تھی، —— ایمرسن نے مجھے کارلائل سے بھی روشناس کرایا، کارلائل ہی وہ شخص تھا جس نے مجھے سمندر پار سے عربی ممالک کی طرف لوٹایا، —— میں نے کتاب "الحمراء" کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس عنوان سے مصنف کا مقصد "الحمراء" ہے اور مجھے یاد آگیا کہ "الحمراء" (قصر الحمراء) عرب اندلس کے تاج کا چمکتا ہوا موتی (یادگار) ہے۔

بلاد عربیہ! خدا کو یہ گوارا نہ ہوا کہ میں تمام عمر تم سے ناواقف رہوں، اس نے ایک انگریز، 'کارلائل' اور ایک امریکن کو میرا رہنما بنایا، جنھوں نے تمہارے پیغمبر (حضرت محمد صلعم) سے مجھے روشناس کرایا (امین الریحانی عیسائی ہے) اور تمہارے فرزندوں سے میرا تعارف کرادیا، یہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے!؟

امین الریحانی گذشتہ جنگ عظیم کے موقع پر چھوٹی قوموں کے جہادِ آزادی سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس نے اپنے تاثر کو اقوامِ مشرق کے حقوق کی عموماً اور عرب اقوام کی خصوصاً حمایت کرکے زبانِ قلم سے ظاہر بھی کیا تھا۔

امریکہ میں ایک دوسرا اہلِ قلم "مخائیل نعیمہ" ہے، یہ مشرقِ قریب میں امین الریحانی اور مرحوم جبران خلیل جبران کے بعد سب سے بڑا "شامی امریکن" اہلِ قلم تسلیم کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس پر یہ بہتان

لگاتے ہیں کہ وہ مشرقی چیزوں پر نکتہ چینی کرتا ہے اور مغرب کی ہر چیز کی ستائش کیا کرتا ہے، مگر یہ تہمت بالکل بے بنیاد ہے۔ جس چیز سے یہ تہمت تراشی گئی ہے وہ اس کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ "عہد حاضر میں عربی زبان اس قابل ہو سکے کہ بڑی بڑی تہذیبوں سے آنکھ ملا سکے" چنانچہ اپنے ڈرامہ" الاباء والبنون" (باپ بیٹے) میں فصیح عربی اور عامی عربی زبان کے موضوع کو اٹھایا ہے اور ڈرامائی حیثیت سے دونوں کی خدمات پر نظر ڈالی ہے کہ آیا عامی زبان زیادہ خدمت کر سکتی ہے یا فصیح؟ یہی نقطۂ نظر عموماً اس کے ہمعصر ڈراما نگار اور مصنفین کے لئے وجہ نزاع ہوا ہے، نعیمہ" عربی زبان میں ڈراما" کے عنوان کے تحت میں لکھتا ہے

"ڈراما بھی منجملہ ادبی اصناف کے ہے، اس کیلئے عامی زبان ناگزیر ہے۔ اس کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اگر ہم اس قاعدہ کو پیش نظر رکھتے تو اپنے تمام ڈراموں کو عامی زبان میں لکھنے لگتے، ہمارے اندر اب وہ لوگ نہیں رہے جو عرب جاہلیت یا ابتدائی اسلامی عہدوں کی زبان میں گفتگو کر سکیں اور اتنی دور رہ کر ہمارا فصیح زبان بولنا یہ ایک صبر آزما مصیبت ہو گی جس سے چھٹکارا کبھی ناممکن ہو جائیگا"

یہ مشہور ڈراما نگار اور مصنف تقریباً ۱۸۹۴ء میں لبنان کے "سکانتہ" نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوا، امریکہ جانے سے قبل اپنے شباب کے ابتدائی ایام میں کچھ مدت تک روس میں تعلیم پاتا رہا، اگر ہم اس کے ڈرامہ" باپ، بیٹے" اور اس کے زبردست مقدمہ" ڈرامہ نویسی کا فن اور اس کا فصیح عربی سے تعلق"، کو مستثنیٰ کر لیں۔ تو پھر اس کی مشہور ترین تصنیف "کتاب الغربال" رہ جاتی ہے، یہ ادب عربی پر تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، نعیمہ نیویارک کے "رابطۂ قلمیہ" (ادارۂ تحریر) کا نمایاں رکن ہے۔

تیسرا اہل قلم" ایلیا ابوماضی" ہے۔ یہ بھی ریحانی اور نعیمہ کی طرح لبنان کا باشندہ ہے۔ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوا، ۱۱ برس کی عمر میں مصر کا سفر کیا، دس برس تک وہاں رہا اور نجی طور سے تعلیم پاتا رہا، ۱۹۱۱ء میں امریکہ آیا اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا، نیویارک کے اخبار" مرآۃ الغرب" (مغرب کا آئینہ) میں مضامین لکھا کرتا تھا، کچھ مدت کے بعد صحافت نگاری چھوڑ دی اور تجارت کرنے لگا، مگر

صحافت کی شوقین طبیعت نے نچلا نہ بیٹھنے دیا، اور ۱۹۲۹ء میں ایک پندرہ روزہ رسالہ "سمیر" جاری کرنے پر مجبور کیا۔

"ایلیا" صاحب دیوان بھی ہے، اس کے دیوان کے تین حصے ہیں، ایک حصہ ۱۹۱۱ء میں قاہرہ سے شائع ہوا، اور باقی دونوں حصے "جداول" کے نام سے نیویارک سے شائع ہوئے۔

کہا جاتا ہے کہ جس وقت امریکہ میں جبران کی تحریروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اور "عرب امریکن کلب" کے اندر شامی اہل قلم میں وہی سب سے ممتاز نظر آتا تھا، اس وقت صرف ابوماضی ہی تنہا ایسا شخص تھا جو مجلس سے بغیر کسی قسم کا اثر لیے ہوئے اٹھتا تھا، وہ ان چیزوں سے قطعاً متاثر نہ ہوتا تھا، جن سے دوسرے لوگ سر دھننے لگتے تھے، چنانچہ اہل قلم نے اس کے متعلق یہانتک پھبتی کسی کہ "مجلس میں موجود ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں" ممکن ہے کہ اس کی نظروں میں نہ جچنے کا سبب یہ ہو کہ وہ عرصہ تک مصر میں رہ چکا تھا۔

"ایلیا" کا قصیدہ "لستُ ادری" بہترین قصیدہ خیال کیا جاتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں

قد سألت البحر یوماً هل انا یا بحرُ منکا

ایک دن میں نے سمندر سے دریافت کیا، اے سمندر! کیا میں تیرا ہی ایک قطرہ ہوں؟

اصحیحٌ ما رواهُ بعضهم عنّی وعنکا

کیا وہ سچ ہے جو میرے اور تیرے متعلق لوگ کہتے آئے ہیں ؟

أم تری ما زعموا زوراً وبهتاناً وافکا

یا جو کچھ انھوں نے بیان کیا اسے تو جھوٹ، بہتان اور دروغ بیانی خیال کرتا ہے

ضحکت امواجهُ منّی وقالت لست ادری

سمندر کی لہریں میری باتوں پر ہنس پڑیں اور کہا "مجھے نہیں معلوم"

ایھا البحر اتدری کم مضت الف علیکا
اے سمندر! کیا تو جانتا ہے؟ تجھے تو صدیاں گذر چکی ہیں،
وھل الشاطئ یدری انہ جاث علیکا
کیا ساحل کو بھی علم ہے؟ وہ تو تیرے قریب ہی رہا ہے،
وھل الانھار تدری انھا منک الیکا
کیا دریا جانتے ہیں؟ انکا منبع اور مدخل تو، تو ہی رہا ہے
ما الذی الامواج قالت حین ثارت؟ لست ادری
لہروں نے جوش میں اٹھکر کیا جواب دیا؟ "مجھے نہیں معلوم"

مشرق ہو یا مغرب یہ چیز نادر ہوا کرتی ہے کہ جس پایہ کا کوئی اہل قلم ہو، اس پایہ کا آرٹسٹ بھی ہو، یہ نادر صفت جبران خلیل جبران میں پائی جاتی تھی، اس کی شہرت مضامین اور ڈرائنوں دونوں کی وجہ سے تھی، جبران کی زندگی (جس کی شمع بجھے ہوئے پانچ برس سے زیادہ ہو چکے) بہت سے پہلو رکھتی تھی اور اس کی دلچسپی کے متعدد گوشے تھے۔

جبران ۱۸۸۳ء میں لبنان کے مضافات "بشرہ" میں پیدا ہوا، ۱۲ برس کی عمر میں امریکہ آیا، پھر کچھ مدت کے لئے بیروت واپس چلا گیا اور وہاں کے سرکاری اسکول میں تعلیم پاتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں امریکہ لوٹا، اور "پاریس" میں مشہور فرانسیسی آرٹسٹ "روداں" سے فن مصوری سیکھنا شروع کیا روداں جبران کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ "یہ بیسویں صدی کا ولیم بلیک ہے" اسے بڑے لوگوں کے سارٹیفکٹوں کے لحاظ سے ممتاز درجہ حاصل ہے۔

جبران نے آخر میں نیویارک کو وطن بنا لیا تھا، اور وہیں مضمون نگاری اور مصوری میں منہمک ہو گیا تھا، مصوری پر اس نے بہت سی تالیفات میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ایک

مدت تک "الرابطۃ القلمیہ" کا صدر رہا، جبران کی نثر کے ساتھ ساتھ نظم بھی پائی جاتی ہے۔

ان کتابوں کے سوا جو عربی میں اس کے قلم سے نکلی ہیں، انگریزی زبان میں بھی اس کی پانچ تصنیفات موجود ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی زبان میں اس کی سب سے اہم تالیف "النبی" ہے۔ عربی میں اس کا ترجمہ انطونیوس بشیر نے کیا ہے، اور وہ دس بار چھپ چکی ہے، اسی طرح یورپ کی دس زبانوں میں اور جاپانی اور ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

انطونیوس بشیر جبرانی کی کتاب "المواکب" (یہ ایک مصور اور منظوم قصیدہ ہے، طرز بیان رباعیات عمر خیام کی طرح ہے) کے مقدمہ میں اس کے متعلق طویل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"وہ قدیم وجدید معلومات میں "ہمزۂ وصل" کی حیثیت رکھتا ہے، عربی زبان کو متعارف کرنے اور اسے امتیاز بخشنے میں اس کا درجہ الف لام تعریف کا ہے، اسے درخشاں کرنے میں "عامل اکبر" کا مرتبہ رکھتا ہے، اس نے ملکِ شام کا نام ترقی یافتہ اقوام کے سامنے سربلند کر دیا، طالبان علم وفیض اس سے سچی محبت کرتے ہیں۔"

عربی میں غالباً اس کی سب سے مشہور کتاب "الارواح المتمردہ والاجنحۃ المنکسرۃ" ہے یہ ایک ڈراما ہے اس کے ایک ٹکڑے کا اقتباس ہم یہاں نقل کرتے ہیں اس سے زبان کی لطافت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے باوجودیکہ اسکی زندگی کا بڑا حصہ اجنبی ملکوں میں گذرا ہے لیکن ایک لمحہ کیلئے بھی وہ اپنے وطن مالوف کے پاکیزہ آثار اور ان کی خصوصیات کو نہیں بھولا ہے، اس دعوی کی دلیل حسب ذیل سطور میں دیکھی جا سکتی ہے۔

"میں بیروت میں اس سال کے موسم ربیع میں موجود تھا، بیروت کا یہ موسم عجائبات سے معمور تھا، ابر نیساں نے کلیاں اور لطیف سبزہ اگا دیا تھا، اور شہر کے باغات ایسے نظر آتے تھے کہ گویا وہ اسرار تھے جنکا آسمان کےسامنے زمین نے اظہار کر دیا ہے، بادام اور سیب کے درختوں نے سفید اور معطر قبائیں زیب تن کر رکھی تھیں، اور گھروں کے

اندر وہ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ سفید لباس میں آسمان سے حوریں اتری ہیں، جنھیں فطرت نے محرم بنا کر شاعروں اور نازک خیالوں کی پاس بھیجا ہے، موسم بہاریوں تو ہر مقام پر حسین ہوتا ہے، مگر شام میں حسین ترین ہوتا ہے، موسم بہار خدا کا بہترین عطیہ ہے جسے لوگ پہچانتے نہیں خراماں خراماں زمین پر چکر لگایا کرتی ہے، جبوقت شام میں پہنچتی ہے تو نہایت سبک رفتاری سے پیچھے کو مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے چلتی ہے اور ان بادشاہوں اور پیغمبروں کی روحوں سے جو فضا میں منڈلاتی ہیں دلچسپی لیتی ہے، سلیمانؑ کے غیر فانی نغمے یہودیت کے سروں میں گنگناتی ہے۔"

قصیدہ "مواکب" کے حسب ذیل اشعار شاعری کا پاکیزہ نمونہ ہیں۔

الخیر فی الناس مصنوع اذا جبروا والشر فی الناس لا یفنیٰ وان قبروا

بھلائی لوگوں سے کرنا بڑی بات اسوقت ہے جب وہ حیران و پریشان ہوں، بدی کبھی مٹتی نہیں اگرچہ کرنیوالے قبروں میں پہنچ جائیں

واکثر الناس آلات تحرکہا اصابع الدھر ثم تنکسر

اکثر لوگ آلات کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھیں زمانہ کی انگلیاں حرکت دیتی رہتی ہیں پھر وہ ٹوٹ جاتی ہیں

فلا تقولن ھذا عالم علم ولا تقولن ذاک السید الوقر

اس لئے یہ نہ کہو کہ یہ جید عالم ہے، یہ باوقار امیر ہے،

فافضل الناس قطعان یسیر بہا صوت الرعاۃ ومن لم یمش ینیثر

اچھے لوگ وہی ہیں جو ریوڑ کی بھیڑوں کی طرح ہوں، جو چرواہوں کی آواز پر چلپڑتی ہیں، اور جو نہیں چلتی ہیں بھیڑیے انکی بکا بوٹی کردیتے ہیں

جبران خلیل جبران کی موت سے ایک بڑی شخصیت اٹھ گئی مگر اس خیال سے یہ روح گداز صدمہ کم ہوجاتا ہے کہ "شامی امریکن اہل قلم" ترقی ہی کی طرف قدم اٹھائے جارہے ہیں، ان کا یہ نمایاں امتیاز رہا ہے کہ امریکنوں سے انتہائی خلا ملا اور غیر فانی امتزاج رکھنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہمیشہ اپنی عربی روایات اور اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھا ہے، خدا کرے وہ مغرب کے سامنے مشرق کی صحیح ترجمانی کریں، اور اپنے انفرادی مرکز سے ہٹ کر اس خلیج کو پاٹنے میں نمایاں حصہ لیں، جو مشرق اور مغرب کے درمیان حائل ہے۔

(المستمع العربی) (ع - ص)

ادبیات

حکایتِ آرزو

سعید احمد اکبر آبادی

پچھلے دنوں علالت کے باعث دو ہفتہ سے زیادہ صاحبِ فراش رہنا پڑا، لکھنا پڑھنا موقوف تھا، پلنگ پر پڑے پڑے کچھ تمام کچھ ناتمام چند غزلیں اور نظمیں موزوں ہوگئیں۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی زمانہ کی یادگار ہیں (س)

کہتے کہتے رک گئی آخر زبانِ آرزو — یہ تھی اک تعبیرِ صد خوابِ گرانِ آرزو

کیا سنائے رُودادِ جورِ رہبر وہ غریب — لُٹ گیا منزل میں جس کا کاروانِ آرزو

ظلمتِ حسرت، غبارِ اشک، دودِ یاس و غم — کس قدر تاریک ہے میرا جہانِ آرزو

بخش دے یارب دلِ بے مدعا ہی اک مجھے — اُٹھ نہیں سکتا ہے اب بارِ گرانِ آرزو

ایک دل کے دم سے تھی آرائشِ بزمِ خیال — اب کہاں وہ زرنگارِ کہکشانِ آرزو

اب وہ دن ہیں نہ وہ راتیں نہ وہ عہدِ جمیل — دل ہے کوئی یا چراغِ کشتہ سانِ آرزو

کیا قیامت تھی وہ برقِ یاس و حرماں الاماں — آنکھوں دیکھی ہو گیا خاک آشیانِ آرزو

کر رہی تھیں کل چمن میں بلبلیں سرگوشیاں — ہو رہا تھا اہتمامِ داستانِ آرزو

آگیا فصلِ خزاں کا یک بیک پیغام کیا — بن گئیں ماتم گسارِ بوستانِ آرزو ق

ایک وہ ہیں شادکامِ انبساطِ ہر نفس — ایک ہم ہیں وقفِ غمہائے نہانِ آرزو

ایک وہ ہیں جن کو ہر ساعت نویدِ صد طرب — ایک ہم ہیں مبتلائے امتحانِ آرزو

ایک وہ ہیں جن کی محفل صد بہار اندر کنار | ایک ہم ہیں جن کا دل داغِ نشانِ آرزو
ایک وہ کہ عشرت اندوزِ فروغِ مہر و ماہ | ایک ہم کہ شب گسارِ خاکدانِ آرزو
ایک وہ جن کے لیے گل کارواں در کارواں | ایک ہم زحمت کشِ خار و سنانِ آرزو
ایک وہ کہ جنتیں ہی جنتیں جن کے لیے | ایک ہم ہیہم جنہیں رنجِ زیانِ آرزو

آج پھر آثارِ بیتابی نمایاں ہیں سعید
کیا کہیں پھر ہوگی تجدیدِ زمانِ آرزو

غزل

از جناب ابوالفضل محمد فراہیم صاحب ثمر رحمانی

آہیں شرر فشاں ہیں سوزِ غمِ نہاں سے | بجلی چمک رہی ہے گویا مری زباں سے
جل جائیں کیوں نہ دشمن آہِ شرر فشاں سے | میں آگ پھونکتا ہوں سوزِ غمِ نہاں سے
آیا ہوں راز بن کر جاؤنگا راز بن کر | لایا ہوں کچھ وہاں سے لے جاؤں کچھ یہاں سے
کاسہ بکف ہو گردوں کیوں بیکسوں کے آگے | کچھ مانگ لے اثر سے کچھ مانگ لے فغاں سے
اب دل لگاؤں کیونکر اس کو بجھاؤں کیونکر | دل آگ بن گیا ہے سوزِ غمِ نہاں سے
دل دے رہے تھے دیتا وہ جان مانگتے ہیں | میری طرح کلیجہ لائے کوئی کہاں سے
اک رشتۂ وفا میں دونوں بندھے ہوئے ہیں | کیوں ہاتھ کھینچتے ہو بیکار امتحاں سے
عرشِ بریں کو جنبش کون و مکاں کو لرزہ | سر رکھ کے اس زمیں پر لڑتا ہوں آسماں سے
کیا جانے وہ کہاں ہیں کیا جانئے کہاں ہوں | بھٹکا ہوں کارواں سے گذرا ہوں کارواں سے
احوالِ نامرادی بس اے ثمر نہ پوچھو | آہیں بھی واپس آئیں جا جا کے لامکاں سے

تبصرے

جمہرۃ البلاغت (عربی) از مولا حمید الدین الفراہیؒ۔ تقطیع کلاں ضخامت ۸۰ صفحات کتابت طباعت عمدہ قیمت ۱۲ ار پتہ :- دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ۔

مولانا مرحوم نے اس گراں پایہ کتاب میں پہلے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے جس طرح اور علوم وفنون یونان اور فارس سے اخذ کیے ہیں۔ فنِ بلاغت کے مسائل بھی انہی کی تحقیقات کے موافق مرتب کیے، اس بنا پر عجمیوں کے نزدیک بلاغت کے اصلی ارکان تشبیہ اور بدیع تھے تو علماءِ اسلام نے بھی انہی چیزوں کو مہتم بالشان قرار دیا۔ حالانکہ اہل عرب کے نزدیک بدیع اور تشبیہ دونوں لغو اور ناقابلِ اعتنا ہیں۔ یہیں سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ چونکہ ارسطو کے نزدیک بلاغتِ کلام کا دار و مدار محاکات اور تشبیہ وتمثیل پر ہے، اس لیے علماءِ اسلام نے بھی ان دو چیزوں کو اصل معیارِ حسن قرار دے کر یہاں تک کہہ دیا کہ "اچھا شعر وہی ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا گیا ہو" لیکن اگر خالص عربوں کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک کلامِ بلیغ وہ کلام ہوتا ہے جس میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہو اور جو دل میں اُترتا چلا جائے۔

مقدمۂ کتاب میں ان امور پر تشفی بخش بحث کرنے کے بعد مولانا نے عربوں کے مذاق کے مطابق خود فنِ بلاغت کے اصول وقواعد مرتب کیے ہیں اور استشہاد کے لیے جگہ جگہ عہدِ جاہلیت کے شعراء کا کلام پیش کرتے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید کے اعجازِ بلاغت کو انہی اصول پر دیکھنا چاہیے نہ کہ اُن اصول پر جو یونان کے اثر سے عربی میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب موضوعِ بحث کے اعتبار سے ایک بالکل نئی چیز ہے اور فاضل مصنف کی وسعتِ علم، عربیت کے ذوقِ سلیم

اور عمقِ نظر کی روشن دلیل ہے۔ اے کاش کہ یہ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ مصر سے شائع ہوتی کہ
اس کی اصل قدر وہیں کے اربابِ ذوق کر سکتے ہیں۔

اقسام القرآن از مولانا حمید الدین الفراہیؒ۔ تقطیع خورد ضخامت ۸۰ صفحات، کتابت و طباعت
بہتر قیمت ۸ رپتہ:۔ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا الفراہیؒ کی کتاب کا بامحاورہ اور سلیس اردو ترجمہ مولانا امین احسن صاحب
اصلاحی کے قلم سے ہے۔ مولانا نے اس میں قرآنِ مجید کی قسموں پر بڑی محققانہ اور مبصرانہ بحث کی ہے
شروع میں تین اعتراضات نقل کرکے امام رازی اور حافظ ابن قیم کی تقریریں مختلف مقامات سے انتخاب
کرکے اپنے الفاظ میں لکھی ہیں پھر متین انداز میں تنقید کرکے اُن کی کمزوریاں بیان کی ہیں، اس کے
بعد خود اپنے جوابات قلمبند کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں قسم کی ضرورت، اس کی تاریخ، قسم کا ابتدائی مفہوم
اُس کے طریقے اور یہ کہ قسم کن کن اغراض سے کھائی جاتی ہے۔ پھر اس کے شواہد یونان کے بعض
خطیبوں کے کلاموں سے، قرآنِ مجید کی قسموں کا مفہوم اور اُن کی بلاغتیں، ان سب پر جامع اور سیر
حاصل بحث کی گئی ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ انجیل میں قسم کھانے کی ممانعت کیوں کی گئی ہے۔
اس کتاب کو پڑھ کر حضرت مصنف کے لیے بے ساختہ دل سے دعا نکلتی ہے کہ حق تعالیٰ اعلیٰ علیین
میں اُن کے مراتب بلند سے بلند تر کرے، حق یہ ہے کہ مولانا مرحوم نے قرآنِ مجید کے کما حقہٗ سمجھنے اور
سمجھانے میں جو کاوش اور محنت کی ہے اُن کا کوئی معاصر اس باب میں اُن کا حریف نہیں بن سکتا
قرآن کا ذوق رکھنے والے اصحاب کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

فہمِ قرآن

اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں فہم قرآن سے متعلق تمام قدیم وجدید نظریوں پر نہایت مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت کیا ہے، اور یہ کہ "وحی الٰہی" کا صحیح منشاء معلوم کرنے کے لیے شارع علیہ السلام کے اقوال وافعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں بعض تعلیمیافتہ اصحاب کی طرف سے جو شکوک وشبہات کیے جاتے ہیں اُن کا بھی نہایت سنجیدہ اور تشفی بخش جواب دیا گیا ہے۔ نیز تدوینِ حدیث، فتنۂ وضع حدیث، اس فتنہ کا انسداد، احادیث کا پایۂ اعتبار، صحابہ کی عدالت، کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہ کے سوانح حیات اور دور تابعین کی خصوصیات، اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد سنہری عگ

نبی عربی صلعم

تالیف مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی (رفیق ندوۃ المصنفین دہلی)

تاریخ اسلام کے ایک مختصر اور جامع نصاب کی ترتیب "ندوۃ المصنفین" دہلی کے مقاصد میں ایک ضروری مقصد ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس میں متوسط استعداد کے بچوں کے لیے سیرتِ سرورِ کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسکول کے لڑکوں کے علاوہ جو اصحاب تھوڑے وقت میں سیرت طیبہ کی اَن گنت برکتوں سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں، اُن کو اس کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے، یہ کہنا مبالغہ سے پاک ہے کہ "نبی عربی" اپنے طرز کی بالکل جدید اور بے مثل کتاب ہے۔ کتابت، طباعت نہایت اعلیٰ، ولایتی سفید چکنا کاغذ، صفحات ۱۶۰

قیمت مجلد سنہری ایک روپیہ (عہ) غیر مجلد بارہ آنے (۱۲)

منیجر ندوۃ المصنفین۔ قرولباغ۔ نئی دہلی

Registered No. L 4305

قواعد

۱۔ برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اُتریں بُرہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

۳۔ باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں۔ ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

۴۔ جواب طلب امور کے لیے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵۔ "بُرہان" کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۶۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

۷۔ منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرولباغ نئی دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

مُرتّبہ

سعید احمد اکبرآبادی

ایم اے۔ فاضل دیوبند

بُرہان

جلد ہفتم شمارہ (۴)

رمضان المبارک ۱۳۶۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۱ عیسوی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چونکہ اسلام دین فطرت ہے، اس بنا پر اُسکا نظام اتنا جامع و مکمل ہے اور اس میں ایسی جاذبیت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم سچی تڑپ اور حقیقی جذبۂ جستجو کے ساتھ جب کبھی کسی صالح اور جامع نظام کی تلاش میں نکلیگی تو اُسکا قرعۂ انتخاب اسلامی نظام کے حق میں ہی پڑیگا۔ ضرورت صرف دو چیزوں کی ہے ایک یہ کہ کج نظری اور تعصب کے غلیظ حجابات حائل نہ ہوں اور دوسری ضرورت یہ ہے کہ کوئی جماعت اس نظام کے حقیقی خط و خال، اور اس کے رخِ تاباں کو ان لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔ ایک مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ندوۃ العلماء کے جلسہ منعقدہ امرتسر کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ مولانا شبلی مرحوم کی کتاب الفاروق سے جب نوجوان ترکوں کا تعارف ہوا، تو اُن کے بعض ذمہ دار لوگوں نے برملا اعتراف کیا کہ اگر ترکی کے انقلاب سے پہلے یہ کتاب ہم لوگوں میں متعارف ہو چکی ہوتی تو یقیناً ترکی میں کبھی وہ الحاد و زندقہ نہیں پھیل سکتا تھا جو آجکل پایا جاتا ہے۔

اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی نے قیام روس کے زمانہ میں اسلام کے اقتصادی و اجتماعی نظام پر روس کے انقلابی نوجوانوں سے گفتگو کی تو یہ لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں حیرت ہوئی کہ کیا کوئی قدیم مذہب بھی ایسا معاشی نظام رکھ سکتا ہے جو اس زمانہ کی کشمکش سرمایہ دار و مزدور کا کامیاب حل پیش کر کے سوسائٹی کو انسانیت کُش اعمال و افعال سے نجات دلادے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح اسلامی نظام کو مغربی اقوام تک پہنچا سکتے ہیں اور اس کیلئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات جو نہایت ضروری اور اہم ہے وہ یہ ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کی غلامی کے باعث مسلمانوں میں جو ایک عام احساسِ کمتری اور جمود و تعطلِ ذہنی پیدا ہو گیا ہے اس کو ختم کیا جائے

یعنی ہم اس بات کا قلبی اذعان ویقین پیدا کریں کہ ہم صرف اسلئے مسلمان نہیں ہیں کہ کسی مسلمان گھرانہ میں پیدا ہوئے ہیں اور نماز روزہ کر لینا ہمارے مقتضیاتِ اسلام کی تکمیل کر دیتا ہے بلکہ ہم درحقیقت ایک ایسی جماعت ہیں جس کی زندگی کا نصب العین باطل کی طاقتوں کو کچل کر حق کا کلمہ بلند کرنا اور ناانصافیوں اور ظلم وستم کو مٹا کر دنیا میں عدل و انصاف اور حق پرستی وخدا ترسی کا پرچم لہرانا ہے۔ مسلمانوں میں ایک جماعت مخلص دیندار اور پابندِ شرع علمار کی ایسی ہونی چاہیے جو اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ عام مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کر کے ان کو "خودی" کی تعلیم دے اور اپنی عظمتِ رفتہ کو واپس حاصل کر لینے کا جذبۂ کامل ان میں پیدا کر دے اس جماعت کا کام صرف ہندوستان تک محدود ہوگا۔

ساتھ ہی ایک دوسری جماعت وسیع النظر اور بلند ہمت علمار کی ایسی ہونی چاہیے جو ایک ساتھ مجتمع ہو کر پہلے موجودہ اقوامِ مغرب کی نفسیات کا جائزہ لیں، ان کا اصل مرض معلوم کریں اور پھر ان سب چیزوں کے پیشِ نظر اسلام کا نظام ایک ایسے طریقے پر مرتب کریں کہ اس میں موجودہ اجتماعی مشکلات کا کامیاب حل ہو۔ اس دوسری جماعت میں ایسے علمار شامل ہونے چاہئیں جو اسلامیات اور علوم جدیدہ دونوں کے ماہر ہوں اور جو پوری سرگرمی اور ایثار و خدا کاری کے ساتھ کام بھی کر سکتے ہوں۔ اسلامی نظام کی جامع ومکمل ترتیب کے بعد دنیا کی مختلف علمی اور وسیع زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہونے چاہئیں اور کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو اور یورپ کے ایک ایک مرد۔ اور ایک ایک عورت تک اس کی آواز پہنچے پھر صرف اس قدر ہی نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ ایسے ہی علمار کی ایک جماعت یورپ کے مختلف ملکوں میں مبلّغ کی حیثیت سے جائے اور وہاں وہ ہر اُس ذریعہ کو کام میں لانے کی کوشش کرے جس سے اسلامی مشن کی تبلیغ میں مدد ملے۔ شہر بشہر بلکہ دیہات بدیہات پُرزور تقریریں اور لکچر ہوں، اخبارات میں پے بہ پے مضامین شائع کئے جائیں بلکہ یورپ کے ہر بڑے شہر میں کم از کم اپنا ایک اخبار ہونا چاہیے جو اس جماعت کے آرگن کی حیثیت سے جاری رہے، اس کے علاوہ وہاں کی سوشل اور پولیٹکل سوسائٹیوں میں عمل دخل پیدا کیا جائے اور ارکان سوسائٹی سے ارتباط و

اختلاط پیدا کرکے ان کی ذہنیتوں کو سنوارنے اور ان کے افکار و نظریات کو بدلکر انھیں اسلامی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اس پر ہی بس نہ ہونی چاہیئے بلکہ ہر ملک کی برسر اقتدار سیاسی پارٹی سے مل جل کر اور اس میں جہانتک ہوسکے اپنا نفوذ و اثر پیدا کرکے اسلامی طرزِ فکر پر اس کی اصلاح کی سعی کرنی چاہیئے۔

مردوں کے ساتھ ایسی ہی مسلمان عورتیں بھی کافی تعداد میں ہونی چاہیئے تاکہ وہ مردوں کی طرح اپنے حلقہء عمل میں کام کریں اور اس طرح ایک عالمگیر اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھیں۔ عورتوں کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ خود بہت جلد متاثر ہوتی ہیں اور دوسری جانب مردوں کو اپنے سے جلد متاثر کردیتی ہیں۔

لیکن اس موقع پر یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ دنیا کو نظام اسلامی کے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو پہلے ضروری ہے کہ آپ خود اس نظام کا ایک اعلیٰ نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آئیں علم میں۔ عمل میں۔ اخلاق و عادات میں۔ معاملات و خصومات میں آپ کی سوسائٹی ایک انسانی آئیڈیل سوسائٹی ہونی چاہیئے اگر آپ خود اس پر عمل پیرا نہیں ہیں تو دوسروں پر آپ کی دعوت کا کیا خاک اثر ہوسکتا ہے؟ پس تین سوالات ہیں جن پر ہر شخص کو بار بار غور کرنا چاہیئے۔

(۱) وہ مسلمان کیوں ہے؟ اور اسلام کو ہی حق کیوں سمجھتا ہے؟

(۲) مسلمان کی زندگی کا نصب العین کیا ہے؟ کیا اس نصب العین کو سامنے رکھے بغیر کسی مسلمان کی زندگی حقیقی اسلامی زندگی ہوسکتی ہے؟

(۳) وہ نصب العین کس طرح حاصل ہوسکتا ہے؟ اب تک اس نے اس کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟ اور اب اسے کیا کرنا چاہیئے؟

ذوالقرنین اور سدِ سکندری

جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۳)

برہان ماہِ اگست میں یاجوج و ماجوج کے متعلق جس قدر بحث کی جا چکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں ہیں بلکہ دنیاءِ انسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح (علیہ السلام) کی ذریت میں سے ہیں۔ اور یہ کہ یاجوج و ماجوج منگولیا (تاتار) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع و منشا ہیں اور چونکہ ان کی ہمسایہ قوم ان قبائل میں سے دو بڑے قبیلوں کو موگ اور یوجی کہتی تھی اس لئے یونانیوں نے ان کی تقلید میں ان کو میگ یا میگاگ اور یوگاگ کہا اور عبرانی اور عربی میں تصرف کر کے ان کو یاجوج و ماجوج سے یاد کیا گیا۔

اب ان تاریخی حقایق کی تائید میں عرب مورخین اور محقق مفسرین و محدثین کی تحقیق بھی قابلِ مطالعہ ہے تاکہ گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تصویب ہو سکے۔

حافظ عماد الدین بن کثیرؒ اپنی تاریخ میں تصریح فرماتے ہیں۔

ویافث ابو الترک فیاجوج و ماجوج طائفۃ من الترک وھم مُغُلُ المغول وھم اشد بأساً واکثر فساداً من ھؤلاء۔	اور یافث تاتاریوں کا نسلی باپ ہے پس یاجوج و ماجوج تاتاریوں ہی کی ایک شاخ ہیں اور یہ منگولیا کے قبائل کے منگولی ہیں اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں۔
البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۱۱۰	

اور اپنی تفسیر میں بھی اسی کی تائید فرماتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ قبائل یافث بن نوح کی نسل سے ہیں اور ان کا مولد و موطن منگولیا کا وہی علاقہ ہے جہاں سے قوموں کے طوفان اٹھے اور اٹھکر یورپ وغیرہ میں جا کر بسے ہیں۔

اور ابن اثیر نے کامل میں یہ تحریر فرمایا ہے۔

وقد اختلف الاقوال فیھم والصحیح انھم نوع من الترک لھم شوکۃ وفیھم شر وھم کثیرون وکانوا یفسدون فیما یجاورھم من الارض ویخربون ما قدروا علیہ من البلاد ویوذون من یقرب منھم الخ۔ جلد ۱ ص۶۵	یاجوج و ماجوج کے متعلق مختلف اقوال ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ وہ تاتاریوں ہی میں سے ایک قسم کے تاتاری ہیں وہ بہت طاقتور ہیں اور ان میں شر و فساد کا مادہ بہت ہے اور وہ بہت بڑی تعداد رکھتے ہیں اور قرب و جوار کی زمین میں فساد پھیلاتے اور جس بستی پر قابو پا جاتے اس کو برباد کر ڈالتے تھے اور پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔

اور سید محمود آلوسیؒ روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

"ان یاجوج و ماجوج" قبیلتان من ولد یافث بن نوح علیہ السلام و بہ جزم وھب بن منبہ وغیرہ واعتمدہ کثیر من المتاخرین۔ جلد ۱۶ ص۳۶	یاجوج و ماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں اور وہب منبہ اسی پر یقین رکھتے ہیں اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے ہے۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

وفی کلام بعضھم ان الترک منھم لما اخرجہ ابن جریر و ابن مردویہ من طریق	اور بعض کہتے ہیں کہ ترک (تاتاری) ان ہی میں سے ہیں جیسا کہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے سدی

السدی من اثر قوی الترک سریۃ من	ایک قوی اثر نقل کیا ہے کہ ترک (تاتاری) یاجوج
سرایا یاجوج وماجوج الخ جلد ۱۶ ص۳۶	وماجوج کے حصوں میں سے ایک حصہ ہیں "
وفی روایۃ عبد الرزاق عن قتادۃ ان	اور عبد الرزاق نے حضرت قتادہؓ سے
یاجوج وماجوج ثنتان وعشرون	روایت کی ہے کہ یاجوج وماجوج بائیس
قبیلۃ۔ جلد ۱۶ ص۳۶	قبائل کا مجموعہ ہیں۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں یاجوج وماجوج سے متعلق جو کچھ نقل فرمایا ہے وہ بھی نقول بالا کی ہی تائید کرتا ہے[1]۔ اور علامہ طنطاوی اپنی تفسیر جواہر القرآن میں لکھتے ہیں۔

یاجوج وماجوج اپنی اصل کے اعتبار سے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور یہ نام لفظ "اجیج النار" سے ماخوذ ہیں جس کے معنے آگ کے شعلہ اور شرارہ کے ہیں گویا ان کی شدت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے اور بعض اہل تحقیق نے ان کی اصل پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مغلوں (منگولیوں) اور تاتاریوں کا سلسلۂ نسب ایک شخص "ترک" نامی پر پہنچتا ہے اور یہی شخص ہے جس کو ابو الفداء ماجوج کہتا ہے۔

پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج سے مراد منگولین اور تاتاری قبائل ہی ہیں۔ ان قبائل کا سلسلہ ایشیا کے شمالی کنارہ سے شروع ہو کر تبت اور چین سے ہوتا ہوا محیط منجمد شمالی تک چلا گیا ہے اور غربی جانب ترکستان کے علاقہ تک پھیلا ہوا ہے۔ فاکہۃ الخلفاء اور ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق اور رسائل اخوان الصفا ان سب نے یہی کہا ہے کہ یہی قبائل یاجوج وماجوج کہلاتے ہیں[2]۔

گذشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا یا کاکیشیا کے یہ قبائل جبتک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج وماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے اور صدیوں بعد متمدن ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس نام کو بھلا دیتے ہیں اور دوسرے بھی ان کو اس وحشیانہ امتیاز سے یاد نہیں کرتے کیونکہ

[1] جلد ۱۳ ص۹۰ [2] جلد ۹ ص۱۹۹

پھر یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہوجاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے اور ان پر غارتگری کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی اپنے ہی ہم نسل مرکزی وحشی قبائل سے اسی طرح خوف کھانے لگتے ہیں جس طرح دوسرے قبائل۔ چنانچہ اس مسئلہ کی تائید حافظ عماد الدین ابن کثیر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"حتی اذا بلغ بین السدین" وھما جبلان	"سدین" سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے
متناوحان بینھما ثغرۃ یخرج منھا	کے مقابل ہیں اور ان کے درمیان شگاف ہے
یاجوج وماجوج علی بلاد الترک فیعیثون	اسی شگاف ہی یاجوج وماجوج ترکوں کی شہروں
فیھا فسادًا ویھلکون الحرث والنسل	پر آپڑتے اور ان میں فساد مچادیتے اور کھیتیوں اور
(تفسیر جلد ۳ ص۱۰۳ جدید ایڈیشن)	نسلوں کو ہلاک اور برباد کرڈالتے تھے۔

یعنی یاجوج وماجوج بھی اگرچہ منگولی (تاتاری) ہیں مگر پہاڑوں کے ورے جو تاتاری قبائل اپنے مرکز سے ہٹ کر آباد ہو گئے تھے اور متمدن بن گئے تھے۔ ہم نسل ہونے کے باوجود دونوں میں اسقدر تفاوت ہوگیا کہ ایک دوسرے سے ناآشنا بلکہ حریف بن گئے اور ایک ظالم کہلائے اور دوسرے مظلوم۔ اور ان ہی قبائل نے ذوالقرنین سے سد بنانے کی فرمائش کی۔

اور بعض عرب مورخین نے تو "ترک" کی وجہ تسمیہ ہی یہ بیان کردی کہ یہ وہ قبائل ہیں جو یاجوج وماجوج کے ہم نسل ہونے کے باوجود سد سے ورے آباد تھے اور اس لئے جب ذوالقرنین نے سد قائم کی تو چونکہ ان کو اس میں شامل نہیں کیا تو اس چھوڑ دیئے جانے کی وجہ سے "تُرِک" کہلائے۔[۱]

یہ وجہ تسمیہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے تاہم اس امر کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہے کہ متمدن قبائل تمدن وحضارت کے بعد اپنے ہم نسل مرکزی قبائل سے اجنبی ہوجاتے تھے اور وہ یاجوج وماجوج نہیں کہلاتے تھے۔

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۲۔

اور لفظ یاجوج و ماجوج صرف ان ہی قبائل کیلئے مخصوص ہوگئے ہیں جو اپنے مرکز میں سابق کی طرح ہنوز وحشت، بربریت اور درندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

سد یاجوج و ماجوج کے اس تعین کے بعد دوسرا مسئلہ "سد" کا سامنے آتا ہے یعنی وہ "سد" کس جگہ واقع ہے جو ذوالقرنین نے یاجوج و ماجوج کے فتنہ و فساد کو روکنے کیلئے بنائی اور جس کا ذکر قرآن عزیز میں بھی کیا گیا ہے۔

تعینِ سد سے پہلے یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کی تاخت و تاراج اور شر و فساد کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم و ستم کے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی شمالی دستبرد سے محفوظ نہ تھے۔

اس لئے صرف ایک ہی غرض کے لئے یعنی قبائلِ یاجوج و ماجوج کے شر و فساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لئے مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔ ان میں سے ایک "سد" وہ ہے جو "دیوارِ چین" کے نام سے مشہور ہے یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے۔ اس دیوار کو منگولی اتکوؤہ کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بوقورقہ ہے۔

دوسری "سد" وسطِ ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اس کے محلِ وقوع کا نام دربند ہے یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہِ روم کے ندیم خاص سیلابرجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاویجو نے بھی اپنے سفرنامہ میں کیا ہے۔ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہوکر جب تیمور صاحبقران کی خدمت میں حاضر ہوا ہے تو اس جگہ سے گذرا ہے وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی "سد" موصل کے اس راستہ پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔ [1]

تیسری "سد" روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے

[1] جواہر القرآن جلد ۹ ص ۱۹۸

مشہور ہے۔ اور بعض مورخین اس کو "الباب" بھی لکھدیتے ہیں۔ یاقوتِ حموی نے معجم البلدان میں، ادرلیسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے۔

"داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے۔ یہ شہر بحر خزر (کاسپین) غربی کے کنارہ واقع ہے اس کا عرض البلد ۴۳ - ۲ء۴ شمالاً اور طول البلد ۱۸ - ۴ء۸ شرقاً ہے۔ اور اس کو دربندِ انوشیروان بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے۔ اور اس کے اطراف وجوانب کو قدیم زمانہ سے سد گھیرے ہوئے ہے ان کو قدیم مورخین ابواب البانیہ کہتے آئے ہیں اور اب یہ خستہ حالت میں ہے اور اسکو باب الحدید اسلئے کہتے ہیں کہ اس کی سد کی دیواروں میں لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔[۱]

اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک درہ ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے گذرا ہے۔ یہاں ایک چوتھی "سد" ہے جو قفقاز یا جبل قوقایا یا جبل قوقاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے بستانی اس کے متعلق لکھتا ہے۔

اور اسی کے قریب ایک اور "سد" ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے غالباً اس کو اہلِ فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال نہیں معلوم ہوسکا بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کردی اور بعض نے کسریٰ ونوشیرواں کی جانب اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلاکر اس سے تیار کی گئی ہے[۲]

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی "دربند" کے مقالہ میں اس آہنی دیوار کا حال قریب قریب اسی کے بیان کیا گیا ہے[۳]

---

[۱] دائرۃ المعارف ج۷ ص۶۵۲ و معجم البلدان ج۸ ص۹ - [۲] دائرۃ المعارف ج۷ ص۶۵۳ - [۳] نواں ایڈیشن جلد ۷ لفظ (دربند) ص۱۰۶ -

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں بنائی گئی ہیں اور ایک ہی ضرورت کیلئے بنائی گئی ہیں اسلئے
ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سدّ کے تعیین میں سخت اشکال پیدا ہوگیا ہے اور اسی لئے ہم مورخین میں اس مقام
پر سخت اختلاف پاتے ہیں۔ اور اس اختلاف نے ایک دلچسپ صورت اختیار کرلی ہے جبکہ دربند کے نام
سے دو مقامات کا ذکر آتا ہے اور دونوں مقامات میں سدّ یا دیوار بھی موجود ہے اور غرضِ بنا بھی ایک ہی
نظر آتی ہے۔

چنانچہ دیوارِ چین کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے متعلق قابلِ بحث یہ بات ہے کہ ذوالقرنین
کی سدّ ان تینوں میں سے کون سی ہے اور اس سلسلہ میں جس دربند کا ذکر آتا ہے وہ کون سا ہے؟

مورخین عرب میں سے مسعودی قزوینی اصطخری یاقوت سب اسی دربند کا ذکر کر رہے ہیں جو
بحرِ خزر پر واقع ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے بھی دیوار ملتی ہے اور شہر کے
بعد بھی دیوار ہے۔ اگرچہ ایک دیوار چھوٹی ہے اور دوسری بڑی مگر شہر سدّ یا دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور
ایران کے لئے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے اور دیوار سے پرے بسنے والے قبائل کی زد سے بچاتا ہی
البتہ ابوالفدا اور بعض اس سے ناقل مورخین کو یہ غلطی ہوگئی کہ انھوں نے بخارا و ترمذ کے قریب دربند کو
اور بحرِ خزر کے قریب دربند کو ایک سمجھکر ایک کے حالات کو دوسرے کے ساتھ خلط کردیا ہے۔

مگر ادریسی نے دونوں کی جغرافیائی حالت کو مفصل اور جدا جدا بیان کرکے اس خلط کو دور کیا،
اور اصل حقیقت کو بخوبی واضح کردیا ہے۔

تاہم اس کے باوجود حال کے بعض اہلِ قلم کو اس پر اصرار ہے کہ "سدِ ذوالقرنین" یا "سدِ سکندری"
کے سلسلہ میں جس "سدّ" کا ذکر آتا ہے اس سے بحرِ خزر یا بحرِ قزوین کا دربند مراد نہیں ہے بلکہ بخارا
و ترمذ کے قریب جو دربندِ حصار کے علاقہ میں واقع ہے وہ مراد ہے[1]

[1] صدق ۱۸ اگست مضمون "سدسکندری"۔

بہر حال یہ مورخین بحرِ خزر اور کاکیشیا کے علاقہ دربند (باب الابواب) کی دیوار کے متعلق یہ گمان کرتے ہیں کہ قرآنِ عزیز میں جس سد کا ذکر ہے وہ یہی ہے مگر یہ تصریح کرتے ہیں کہ کوئی اس کو سدِ سکندری کہتا ہے اور کوئی سدِ نوشیروانی۔ اور دربند کے متعلق جب بھی مورخین کو خلط ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس کو دور کر کے یہ واضح کر دیتا ہے کہ "سدِ ذوالقرنین" کا تعلق اس دربند سے ہے جو کاکیشیا میں بحرِ خزر کے کنارہ واقع ہے اس دربند سے نہیں ہے جو بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے۔

چنانچہ وہبؒ کہتے ہیں۔

قرآنِ عزیز میں جو "بین السدین" آیا ہے تو سدین سے مراد "جبلین" ہے یعنی دو پہاڑ کہ جن کے درمیان سد قائم کی گئی پہاڑ کی یہ دونوں چوٹیاں بہت بلند ہیں اور ان کے پیچھے بھی آبادیاں ہیں اور ان کے سامنے بھی اور یہ دونوں منگولین سرزمین کے اس آخری کنارہ پر واقع ہیں جو آرمینیہ اور آذربیجان کے متصل ہے۔ [۱]

اور علامہ ہرویؒ فرماتے ہیں۔

یہ دو پہاڑ کہ جن کے درمیان ذوالقرنین کی سد قائم ہے تاتاری قبائل کے ورے واقع ہیں (گویا سد ان کو اس جانب آنے سے روکنے کیلئے بنائی گئی ہے) [۲]

اور امام رازی تحریر فرماتے ہیں۔

زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ان دو پہاڑوں کا جائے وقوع جانب شمال میں ہے اور (تعیین میں) بعض نے کہا ہے کہ وہ دو پہاڑ آرمینیہ اور آذربیجان کے درمیان واقع ہیں اور بعض نے کہا کہ تاتاری قبائل کی سرزمین کا جو آخری کنارہ ہے وہاں واقع ہیں۔

اور طبریؒ نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ شاہِ آذربیجان نے جبکہ وہ اس کو فتح کر چکا تھا ایک

---

[۱] و [۲] تفسیر البحر المحیط ابو حیان اندلسی جلد ۶ ص ۱۶۳

شخص کو خزر (بحر قزوین) کے اطراف سے بلایا کہ وہ صاحب آذربیجان کو بالمشافہ سد کے حالات سنائے اس نے بتایا کہ وہ پہاڑوں کے درمیان ایک بلند سد ہے اور اس کے اس جانب بہت بڑی خندق ہے جو نہایت گہری ہے۔

اور ابن خرداد نے کتاب المسالک والممالک میں بیان کیا ہے کہ واثق باللہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا اس نے اس سد کو کھول ڈالا ہے اس خواب کی بنا پر اس نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کیلئے بھیجا تاکہ وہ اس کا معائنہ کریں سو یہ لوگ باب الابواب سے آگے بڑھے اور ٹھیک سد کے مقام پر پہنچ گئے۔ انھوں نے واثق باللہ سے آکر بیان کیا کہ یہ سد لوہے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے جسمیں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا ہے اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے پھر جب انسان وہاں سے واپس ہوتا ہے تو راہنما اُس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو سمرقند کے محاذات میں واقع ہیں ابوریحان بیرونی کہتے ہیں کہ اس تعارف کا مقتضا یہ ہوا کہ وہ زمین کے ربع شمالی مغربی میں واقع ہے۔[۱]

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

یہ دو پہاڑ ارض تسعین جہتِ شمالی میں واقع ہیں اور کتاب حزقیل علیہ السلام میں جوج کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ شمال کی جانب سے آخری دنوں میں آئیں گے اس سے بھی یہی مراد ہے اور کاتب چلپی کا میلان بھی اسی جانب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے آرمینیہ اور آذربیجان کے پہاڑ مراد ہیں اور قاضی بیضاوی کی رائے بھی یہی ہے اور بعض نے تو یہانتک کہدیا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی یہی روایت ہے اگرچہ اس قول کا تعاقب کیا گیا ہے اور اسکی صحت میں کلام ہے۔

ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اس کا مصداق باب الابواب (دربند بحر قزوین) ہے حالانکہ ان ہی مورخین کے نزدیک اس کا بانی کسریٰ نوشیرواں ہے۔[۲]

---

[۱] تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۵۱۳ و طبری جلد ص ۲۵۶ ۔ [۲] خلاصہ روح المعانی جلد ۱۶ ص ۳۵

اور حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہ) عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں۔

قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے تیسرے سفر کی جہت کا ذکر نہیں کیا اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ وہ شمال کی جانب تھا اور اسی جانب اس کی سد ہے جو قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے.....

.... اور جس غرض کیلئے ذوالقرنین نے سد بنائی تھی اسی غرض کیلئے اور بادشاہوں نے بھی سد تعمیر کی ہیں۔ مثلاً چینیوں نے دیوار چین بنائی جس کو منگولین انکووہ اور ترک بوقورقہ کہتے ہیں صاحبِ ناسخ التواریخ نے اسکا مفصل ذکر کیا ہے اور اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے دربند (باب الابواب) کی سد تعمیر کی اور اسی طرح اور سد بھی ہیں جو شمال ہی کی جانب ہیں۔ [1]

اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں کاکیشیا کے علاقہ یا بحر قزوین کے کنارہ واقع دربند (باب الابواب) کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں تحریر ہے۔

یہاں جو دیوار ہے اس کو یزدگرد اول نے دوبارہ صاف کرایا اور اس کی مرمت کرائی، اس دیوار کو سکندر اعظم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ [2]

اور دوسری جگہ بحر خزر کے متعلق تحریر ہے۔

رسالہ اخوان الصفا میں جو بحر یاجوج و ماجوج کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد بحر کاسپین یعنی بحر خزر ہے۔ [3]

پس عرب مورخین، محدثین، مفسرین، اور محققینِ تاریخ کے ان حوالجات سے چند امور ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) کوئی ایک مورخ بھی یہ صراحت نہیں کرتا کہ دربند ضلع حصار کی سد، سدِ سکندری ہے

---

[1] ملخص عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسی علیہ السلام صـ ۱۹۹ - [2] جلد اول صـ ۹۴۰

[3] صـ ۱۱۴۲ بحث یاجوج و ماجوج۔

(۲) ابوالفدا اور بعض مورخین کو دربند کے متعلق یہ غلط ہوگیا ہے کہ وہ بحرِ قزوین والے دربند کا ذکر شروع کرتے ہیں اور پھر ترمذ وبخارا والے دربند (حصار) کے ساتھ اس کو ملادیتے ہیں اور دونوں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر رہے ہیں

(۳) باقی تمام محققین، مورخین ہوں یا محدثین ومفسرین امتیاز کے ساتھ یہ تصریح کررہے ہیں کہ جو سدہ سدِ سکندری" کے نام سے مشہور ہے وہ وہی ہے جو بحرِ قزوین کے قریب دربند (باب الابواب) میں واقع ہے۔

چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور دائرۃ المعارف بستانی میں بھی جو کہ جدید وقدیم تحقیق کا ذخیرہ ہیں) یہی ہے۔ حتیٰ کہ برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۵۳۶ طبع یازدہم میں جو دربند ضلع حصار کا مختصر حال بیان کیا ہے اس میں بھی اس سد کو سدِ سکندری نہیں بتایا بلکہ اس کے برعکس بحرِ قزوین والے دربند کی سد کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی نسبت سکندر کی جانب کی جاتی ہے اور اس لئے "سدِ سکندری" کے نام سے مشہور ہے۔

(۴) وہب بن منبہ، ابوحیان اندلسی، صاحبِ ناسخ التواریخ (جو ایران کا درباری مورخ ہے) بستانی، اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ نے دربند "بحرِ قزوین" کے متعلق یہ توجہ دلائی ہے کہ "سد ذوالقرنین" اس دربند "بحرِ قزوین" کی سد نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اوپر قفقاز کے آخری کنارہ پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے چنانچہ مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر میں اس کو درۂ داریال کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اب ان چاروں باتوں سے تھوڑی دیر کیلئے قطع نظر کرلیجئے اور اس مسئلہ میں بھی سابق کی طرح قرآنِ عزیز ہی کو حَکَم بنائیے تاکہ معاملہ واضح سے واضح تر ہوجائے۔

"سدِ ذوالقرنین" کے متعلق قرآنِ عزیز نے دو باتیں صاف صاف بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ "سد" دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی ہے اور اس نے پہاڑوں کے درمیان اس "درہ" کو

بند کر دیا ہے جہاں سے ہو کر یاجوج و ماجوج اِس جانب کے بسنے والوں کو تنگ کرتے تھے۔" حتّیٰ اذا بلغ بین السدّین (ای بین الجبلین)[1] وجد من دونھما قوماً لا یکادون یفقھون قولا قالوا یا ذوالقرنین ان یاجوج وماجوج مفسدون فی الارض۔" یہانتک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اُن دونوں کے اِس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا وہ کہنے لگے اے ذوالقرنین بلاشبہ یاجوج و ماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ سدّ چونے یا اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں تانبا پگھلا ہوا شامل کیا گیا تھا۔" اجعل بینکم وبینھم ردماً اٰتونی زبر الحدید حتّیٰ اذا ساوی بین الصدفین قال انفخوا حتّیٰ اذا جعلہ نارا قال اٰتونی اُفرغ علیہ قطراً۔" میں تمہارے اور ان کے (یاجوج وماجوج کے) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کر دونگا، تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاکر دو یہانتک کہ پہاڑ کی دونوں پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان جب دیوار کو برابر کر دیا تو اس نے کہا کہ دھونکو یہانتک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کر دیا کہا لاؤ میرے پاس، پگھلا ہوا تانبا کہ اس پر ڈالوں۔

قرآنِ عزیز کی بتائی ہوئی ان دونوں صفات کو سامنے رکھکر اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ بغیر کسی تاویل کے ان کا مصداق کونسی "سدّ" ہو سکتی ہے۔ اور کس سد پر یہ صفات ٹھیک ٹھیک صادق آتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

[1] سدین کی تفسیر ہے۔

مسئلۂ زبان اور ہندوستان

(شرعی نقطۂ نظر سے)

جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

مالک الملک نے اپنی وسیع قدرت اور محکم صنعت سے انسانی زندگی کی ہر حقیقۃ و معنویۃ کے مقابلہ میں جس طرح عام بدنی حرکات (یعنی اعمال) وضع فرمائے ہیں جن سے پوشیدہ حقائق کی حسی صورتیں نمایاں ہوتی ہیں اسی طرح ان کی ترجمانی کے لئے لسانی حرکات (یعنی اقوال) بھی رکھے ہیں جن سے ان کی علمی صورتیں قائم ہو کر انھیں دائمی اور متعدی بنا دیتی ہیں۔ گویا روح کو کیفیات کا حامل بنایا، بدن کو اعمال کا اور زبان کو اظہار و بیان کا۔ پس روح کی کیفیات جب ظہور کے لئے بیتاب ہوتی ہیں تو میدانِ عمل میں آجاتی ہیں اور جب متعدی ہونے کے لئے تڑپتی ہیں تو لغت اور زبان پر جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ اور اس طرح یہ کیفیات و اعمال جو شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں لغت کے ذریعہ ہمہ گیر اور وسعت پذیر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ لغت یا زبان زندگی کا کوئی جزوی شعبہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا ایک متوازی پہلو ہے یعنی انسان کی پوری زندگی ایک دفعہ کیفیاتی ہے جو باطنِ محض ہے پھر وہی پوری زندگی عملی ہے جو ظاہرِ محض ہے اور پھر وہی ساری زندگی قولی بھی ہے جو اس ظاہر و باطن کو شائع اور ہمہ گیر کر دیتی ہے۔ اس لئے لغت انسان کی پوری زندگی پر اس طرح حاوی اور شامل ہے کہ اُسے زندگی کا پہلو نہیں بلکہ خود ایک مستقل زندگی کہا جا سکتا ہے۔

عہدِ الست کا اقرار اس حسی حقیقت کو شرعی رنگ میں دیکھنا ہو تو عہدِ الست پر ایک گہری نظر

ڈالکر دیکھئے کہ حق تعالیٰ نے یوم الست یعنی انسانی ازل میں آدمؑ اوران کی ساری ذریۃ کو اپنے سامنے کھڑا کیا اور اپنے جمالِ جہاں آرا کی کوئی جھلک عیاناً ان کے سامنے بے نقاب کر کے ان کی ارواح میں عشق و محبت کی کیفیات پیوست کر دیں جیسا کہ اس موضع قرب میں صیغۂ خطاب اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ اور حدیث کے لفظ عیاناً اور بین یدیہ سے مواجہہ اور مشافہ کا اندازہ ہوتا ہے ارشادِ ربّانی ہے۔

واذ اخذ ربك من بنی آدم	اور جبکہ آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے انکی
من ظھورھم ذریتھم و	اولاد کو نکالا اور اُن سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا
اشھدھم علیٰ انفسھم الست	میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں
بربکم قالوا بلیٰ شھدنا۔	نہیں! ہم گواہ بنتے ہیں۔

ادھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اخذ اللہ المیثاق من ظھر آدم	اللہ نے اقرار لیا آدمؑ کی پشت سے (اولاد نکالکر)
بنعمان یعنی عرفۃ فاخرج من	وادیِ نعمان یعنی میدان عرفات میں پس ان کی کمر سے
صلبہ کل ذریۃ ذرأھا فنثرھم	ساری وہ اولاد نکال لی جسے پیدا کیا تھا پھر انہیں اپنے
بین یدیھم کالذر ثم	سامنے پھیلایا پھر اُن سے کلام کیا ان کے سامنے کہا کہ
کلمھم قُبُلاً الست بربکم	کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں
قالوا بلیٰ شھدنا۔	نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں۔

اس مواجہت سے انسانوں کی اندرونی کیفیاتی زندگی قائم ہوئی وہ اللہ کے جمال کے بھی شیدائی ہو گئے اور بقدر مواجہہ باہم بھی ایک دوسرے کی نسبت عشق و محبت کے جذبات قائم ہو گئے پھر حق تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کا ان سے اقرار لیا جس سے قلوب کے اعتقادات اور

بصورتِ عقدان کے مستحکم کیے جانے کی بنیاد پڑی یہ انسان کی باطنی زندگی کا آغاز تھا۔

پھر جبکہ حضرت ابوالبشر کو دنیا میں بھیجا جانے لگا تو اُن پر عملی زندگی بھی لازم کی گئی جس کا پروانہ اتباعِ ہدیٰ کے عنوان سے انھیں دیدیا گیا۔ جس سے عملی زندگی کی اساس قائم ہوئی۔ ارشاد فرمایا گیا

قلنا اهبطوا منها جميعا فاما	ہم نے کہا یہاں سے تم سب اترو پس اگر آئے تمہارے
ياتينكم مني هدىً فمن	پاس میری جانب سے ہدایت پس جو شخص میری
تبع هُدٰیَ فلا خوف عليهم	ہدایت کا پیرو ہوا تو اس پر نہ کوئی خوف طاری
ولا هم يحزنون ٥	ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

مگر ابھی تک یہ باطنی اور ظاہری زندگی محض شخصی اور ذاتی تھی جس کے انوار ہر فردِ انسان میں بقدرِ استعداد و ظرف الگ الگ تھے کہ نہ ایک کے کیفیاتی مقام کی دوسرے کو اطلاع تھی اور نہ ایک کی کسی اعلیٰ حالت سے دوسرا استفادہ کر سکتا تھا اور اس لیے ان علوم و اسرار میں کوئی اجتماعی شان نہ تھی کہ افادہ و استفادہ کا دروازہ کھل سکے۔

انسانی شرف میں لغت کی اہمیت

جب انسانی پوزیشن اور منصبی حیثیت یعنی عہدۂ نیابت و خلافتِ الٰہی دیئے جانیکا وقت آیا جس کا مقصد انسانوں کی اجتماعیت، باہمی تعاون و تناصر اور افادہ و استفادہ تھا تو اس کے لیے یہ ابتک کی کیفیاتی اور عملی زندگی کافی نہیں سمجھی گئی (ورنہ ملائکہ جو کیفیاتِ باطن اور عبادتِ ظاہر میں انسان سے آگے تھے خلیفۂ الٰہی بنا دیئے جاتے) بلکہ اس لغۃ و زبان اور قول و افادہ کی زندگی کو سامنے لایا گیا جو اُن باطنی کیفیات اور حسی اعمال کی ترجمانی کر سکے اور ایک کے کمالات سے دوسروں کے لئے منتفع ہونے کا موقع بہم پہونچائے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کو سب سے پہلا علم لغۃ اور اسماء و خواص ہی کا دیا گیا اور ایسی امتیازی شان کے ساتھ کہ فرشتے بھی امتحان مقابلہ میں پیچھے رہ گئے اور اپنے عجز کو نہ چھپا سکے۔

وعلم اٰدم الاسماء کلھا ثم
عرضھم علی الملائکۃ فقال
انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم
صٰدقین ۝ قالوا سبحانک
لاعلم لنا الا ما علمتنا انک
انت العلیم الحکیم ۝ قال یا
اٰدم انبئھم باسماءھم فلما
انباءھم باسماءھم قال
الم اقل لکم انی اعلم
غیب السمٰوٰت والارض
واعلم ما تبدون وما کنتم
تکتمون ۝

اور آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں
کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ
اگر تم اپنے قول میں سچے ہو۔ فرشتوں نے کہا ہم
تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ
کچھ علم نہیں جو تو نے ہم کو بتا دیا ہے۔ بلاشبہ تو
جاننے والا حکمت والا ہے۔ (پھر آدمؑ سے) کہا
اے آدمؑ تو ان چیزوں کے نام بتا۔ پس جب آدمؑ
نے اُن کے نام بتا دیے (اللہ نے) کہا (اے فرشتو)
کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ بلاشبہ میں آسمانوں
اور زمین کے غیب کا دانا ہوں اور جو تم چھپاتے
اور جو ظاہر کرتے ہو اُن سب کا جاننے والا
ہوں۔

اس سے صاف نمایاں ہے کہ حکومت و خلافت کا مسئلہ چھڑتے ہی سرکاری زبان کا مسئلہ اس سے پہلے طے کیا گیا۔ کہ کوئی حکومت اپنے لٹریچر میں زبان کے بغیر ہمہ گیری پیدا نہیں کر سکتی۔

بہر حال انسانی ازل میں یہ تینوں مقامات کیفیت باطن، عملِ ظاہر اور قولِ لسان یعنی لغۃ انسان کو ودیعت کیے گئے اور ساتھ ہی طرزِ تفویض سے یہ بھی نمایاں کر دیا گیا کہ خلافتِ الٰہی کا معیار کیفیت و عمل نہیں بلکہ علم ہے جس کے بروئے کار لانے کا سب سے بڑا ذریعہ لغۃ اور زبان ہے اور اس لئے حکومت و سلطنت کی بنیادیں زیادہ تر زبان ہی کے افادہ اور استفادہ پر ٹھہر سکتی ہیں۔

زبان اور قومیت یہی وجہ ہے کہ اقوام کی زندگی میں لغۃ اور زبان کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ قوموں کی قومیت حکومتوں کی تنفیذ و وسعت اور ممالک کے مختلف تمدنوں کی ترویج و اشاعت بہت حد تک ان کے لغۃ کے پھیلاؤ پر موقوف ہے اسی لئے ہر قوم نے اپنی زبان کو اپنی قومیت کا زبردست شعار سمجھا ہے اور اس کے قائم رکھنے بلکہ پھیلانے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

آج تنازع للبقاء کے میدان میں زبان کا مسئلہ بقاءِ قومیت کا سب سے اہم رکن شمار کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کا ہندو ہندی کی ترویج کے لئے، عیسائی انگلش کے لئے، ایرانی فارسی کیلئے افغانی پشتو کے لئے، حجازی عربی کیلئے۔ ان میں سے ہر ایک قوم سمجھ چکی ہے کہ اس کی قومی روایات اس کا مخصوص تمدن و معاشرت اور بالفاظِ مختصر قومیت کا تحفظ صرف ان کی زبان کے بقاء و تحفظ میں مضمر ہے۔

کیا اُن کا یہ سمجھنا غلط ہے؟ نہیں۔ بلکہ یہ ایک مشاہدہ اور حسی حقیقت ہے کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنے میں مدغم کرنا اور بالفاظ دیگر اُسے فنا کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے وہ اس قوم میں اپنا لغۃ رائج کرنے پر پورا زور صرف کرتی ہے جس کا قدرتی نتیجہ چند دن بعد خود بخود یہ نکل آتا ہے کہ اس لغۃ کا اثر متاثر قوم کے اخلاق، عادات، روایات اور مذہب و معاشرت پر پڑ جاتا ہے۔ پھر یا وہ کلیۃً موثر قوم میں مدغم ہوکر اسی کے اخلاق و عادات قبول کر لیتی ہے یا کم از کم اپنی مخصوص قومیت اور شعائر سے بیگانہ ہوکر ایک مخلوط قومیت پیدا کر لیتی ہے۔ بہر دو صورت خود اس قوم کی اصل بنیاد منہدم ہوکر اس کی اپنی قومیت فنا ہو جاتی ہے۔

اوّلاً اس لئے کہ عادۃً کسی قوم کی زبان پر عموم کے ساتھ عبور کرنا اور اس کے محاورات اور طریقِ ادا یا طرز تکلم کو سیکھنا بغیر اہلِ زبان کے اختلاط کے ممکن نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس اختلاط و ارتباط کے

باعث اُن کے عام افعال واقوال سے وہ بعد باقی نہیں رہ سکتا جو اب تک تھا بلکہ ایک گونہ مؤانست باہمی اوران کے ہر کردار و گفتار سے قرب و رضا کی کیفیات پیدا ہو کر اُس قوم کی عام معاشرت کے ساتھ خود بخود شرکت پیدا ہو جاتی ہے پس زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ معلمین کی ہمہ وقت معیت ومجاورت ان کی مخصوص قومی روایات سے قرب اور اپنی قومی روایات سے بُعد پیدا کر دیتی ہے جو انجام کار اس متعلم قوم کو اسی معلم قوم میں مدغم کر دیتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلّی الفاظ میں اس حقیقت کو یوں ارشاد فرمایا ہے۔

من کثّر سواد قوم فھو منھم ومن رضی عمل قوم کان شریک من عملہ۔ (کنز العمال جلد ۵ ص۶۰ بحوالۂ دیلمی)	جو شخص کسی قوم میں گھسکر (مثلاً بواسطہ لغۃ) اسکی جمعیۃ میں اضافہ کرے وہ اسی قوم میں سے ہوجائیگا اور جو شخص کسی قوم کے عمل سے راضی ہو گیا (مثلاً اردو میں ہندی کی اختلاط اور غلبہ سے) وہ اسی قوم کے عمل کا شریک سمجھا جائے گا۔ [1]

دوسری جگہ مزید تفصیل کے ساتھ ارشاد ہے۔

اذا رضی الرجل عمل الرجل وھدیہ وسمتہ فانہ مثلہ (کنز العمال ج۵)	جب کوئی شخص کسی شخص کے کام سے یا اسکی کسی خصلت اور عادۃ سے راضی ہو گیا تو وہ بھی اسی جیسا ہے۔

زبان اور قومی روایات کا تعلق پس جبکہ محض رضائے کار سے شریکِ کار ہونے کا حکم لگا دیا گیا ہے تو جہاں حقیقتاً عملی شرکت بھی کیجائے تو وہاں بالاولیٰ شرکِ عمل کا حکم لگایا جائے گا۔ پھر عادت اور تجربہ شاہد ہے کہ ہر ایک قوم کی زبان اور اس کا لٹریچر صرف اسی کے تہذیب وتمدن کی ترجمانی کرتا ہے کہ وہ زبان ان ہی اشیاء کی ترجمانی کے لئے منصۂ ظہور پر آتی ہے جو اس قوم میں رمز و بوم کی خصوصیات مذہبی روایات اور اُس قوم کی مخصوص ذہنیت کے ماتحت رائج ہوتی ہیں۔ گویا ہر ایک قوم اپنی زبان کے ذریعہ اپنے ہی

[1] ہمارے نزدیک حدیث کی یہ توجیہ محلِ نظر اور تفصیل طلب ہے۔ (برہان)

احوال و کیفیات کا اظہار کرتی ہے نہ کہ دوسری اقوام کے حالات کا۔ مثلاً اہلِ دیہات اپنے دیہاتی بول چال میں شہری حالات کی ترجمانی نہیں کریں گے بلکہ وہی اپنے بدوی مقامات ظاہر کریں گے۔ ان کے محاورات ضرب الامثال اور عام تشبیہات و استعارات کھیت کے ڈولوں مویشیوں اور گھانس پھونس وغیرہ سے آگے نہیں گذر سکتے کہ ان کی زبان انہی کے حالات کی ترجمانی کے لئے ہے اور وہ حالات بداوت ہی سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ حضارت و شہریت سے۔

اسی طرح ایک متمدن اور شہری قوم کا لٹریچر اپنے محاورات و تعبیرات کے لحاظ سے گھانس پھونس وغیرہ کے بجائے انجن، مشین، ریل، تار، سربفلک عمارات اور عام تمدنی ترقیات کا آئینہ دار ہوگا گویا وہ تمام مادی ترقیات جو اُن کے عمل نے سطح زمین پر مجسم کی ہیں ان کی زبان اور لغۃ اُنہی کی ترجمانی کریگی جو چیز ان کی قومیت کے دائرہ میں موجود ہی نہیں اسکی ترجمانی اس لٹریچر میں کیسے ہوسکتی ہے؟

پھر اسی طرح جس قوم کے حالات و کیفیات میں مادیت کے بجائے مثلاً روحانیت کا غلبہ ہو۔ تدین اخلاص اور وابستگیٔ حق اس پر چھایا ہوا ہو تو اس کے لغۃ و محاورہ کہاوتوں اور مثلوں، تشبیہوں اور استعاروں میں بھی اُنہی امور کی عام ترجمانی ہوگی۔ زبان کا ہر ہر جملہ حقائقِ مذہب، معارفِ الٰہیہ، اخلاقِ ربانی اور اسماءِ خداوندی سے لبریز ہوگا۔ اور اس زبان کا بولنا ایسا ہوگا گویا ایک مذہبی وعظ ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی قبیلہ یا قوم اہل دیہات کے محاورات کا گرویدہ ہو کر انھیں حاصل کرے تو زبان کے ذریعہ درحقیقت وہ دیہی زندگی اور بداوۃ کے حالات حاصل کر رہا ہے یا کسی متمدن قوم کا لٹریچر حاصل کرلے تو لغۃ کے واسطے سے وہ اس کی تمدنی روایات حاصل کر رہا ہے اور کسی مذہبی قوم کی زبان سیکھے تو وہ فی الحقیقت اس کے مذہبی خیالات سیکھ رہا ہے کہ وہ زبان ان حالات و خیالات ہی کی ترجمان اور انہی کیفیات کا دوسرا رُخ ہے۔

بہرحال جبکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ کسی قوم کے لغۃ پر عبور کرنا حقیقتاً اُس قوم کی تہذیب و تمدن

اور مذہب و معاشرت پر علماً و خیالاً عبور کر جاتا ہے تو ساتھ ہی اس پر بھی غور کر لینا چاہئے کہ جبکہ ہر تہذیب و تمدن میں کچھ نہ کچھ جزئیات دلفریب اور دلکش بھی ہوتی ہیں تو یہ ناممکن ہے کہ ان کے مقابلہ میں اپنی تہذیب و معاشرت کی مخصوص جزئیات سے بُعد یا کم از کم ان کی بے وقعتی یا اور بھی کچھ نہیں تو ان کی موزونیت کے بارہ میں کچھ نہ کچھ شکوک و شبہات اور اعتراضات نہ پیدا ہو جائیں ظاہر ہے کہ ذہنیت کی اس طبعی رفتار کے ماتحت جتنا جتنا کسی قوم کی زبان اور لٹریچر کا مطالعہ وسیع ہوتا جائیگا اسی حد تک اس کی تہذیب و تمدن سے مؤانست اور اپنی تہذیب و تمدن سے بیزاری اور بے رخی بڑھتی جائے گی اور اس کا آخری نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہو سکتا ہے کہ انسان کی جدت پسند ذہنیت کے ماتحت یہ متعلم قوم ہمیشہ کے لئے اپنی قدیم مخصوص قومیت کا سرمایہ چھوڑ کر معلم قوم کی دریوزہ گر ہو جائے اور پھر اسی کی قومیت کا ایک پرزہ بنکر گھومنے لگے۔

انگریزی زبان کا اثر

کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کے راستہ سے جب اس کا مخصوص تمدن و معاشرت آیا جس کی وہ ترجمان تھی تو مفتوح قوم کیا محض زبان دانی ہی کی حد پر ٹھیری رہی یا اس سے متجاوز ہو کر اپنا تمام سرمایہ تہذیب و تمدن اور مذہب و معاشرت چھوڑ کر اسی جدید زبان کے تمدن کا آلۂ کار بن گئی۔ اور مشرقی خوبو اُن سے اس طرح مٹ گئی گویا وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ کیا ہندوستانیوں کی ماہیتوں میں یہ انقلاب کسی مغربی عقائد نامہ کے ذریعہ کرایا گیا؟ کبھی انھیں صاف لفظوں میں اس کی تلقین کی گئی کہ تمہاری قومیت یا مذہب قابل ستائش نہیں اُسے ترک کر دو؟ یا ان سے کبھی یہ فرمائش کی گئی کہ تم مشرقی اشراقیت کو خیرباد کہکر مغرب کا سیاہ رنگ قبول کر لو۔؟ نہیں! بلکہ مغربی تمدن کا یہ تمامتر سرمایہ اس کی زبان اور لغت میں محفوظ تھا لغت نے اس کی ترجمانی شروع کی، زباندانی کے سلسلہ میں قلوب نے اوّلاً خیال کا اثر لیا پھر جب زبان و قلم نے اس کے چرچے شروع کئے تو قلوب نے مزید رسوخ کا اثر لیکر اُس کے ساتھ شغف قائم کر لیا۔ اور

جب یہ لٹریچر زبان وقلم کے واسطہ سے دل ودماغ پر چھا گیا تو جوارح نے اسے عملاً قبول کرلیا اور پرانا لباس اُتر کر جب نیا لباس زیب تن ہو گیا تو کیسے ممکن تھا کہ پرانے لباس کی وہی قدر ومنزلت باقی رہتی جو کبھی تھی؟ نتیجہ یہ ہوا کہ لغت جدید نے تہذیبِ قدیم کو مطعون اور تہذیب جدید پر مفتون کردیا اور مشرقی قوم اپنے دل ودماغ کے اعتبار سے خالص مغربی قوم بن گئی گو اپنی زبان سے وہ دعویٰ مشرقی ہونیکا کرتی رہی۔ پس حالت موجودہ یہ ہے کہ قلوب میں عظمت تو مغربیت کی ہے اور زبانوں پر نام مشرقیت کا ہے۔ دل مغرب کا گھائل ہے اور زبان مشرقیت کی طرف مائل ہے. گویا قوم مغرب کے حق میں تو مخلص ہے اور مشرق کے حق میں منافق۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک کوئی زبان کلیتہً مفتوح ہو کر اپنی نہ ہوجائے وہ اپنی ابتدائی ترویج میں نفاق ہی کے جراثیم پیدا کرتی ہے۔

فارسی زبان اور مسلمان

یہی وجہ ہے کہ فتح ایران سے قبل جب تک کہ فارسی زبان خود اپنی ایرانی روایات اور تہذیب ومعاشرت کی ترجمان تھی اور اسلامی تہذیب کے لئے اس کی تعبیرات بیگانہ ہی نہیں بلکہ تضاد کا حکم رکھتی تھیں مسلمانوں کو اس کی عمومی تعلیم کی اجازت نہیں دی گئی کیونکہ اس حالت میں کہ فارسی محاورات وتعبیرات نہ اسلامی حقائق کے مُعبّر تھے نہ اُس خو بو کے ترجمان تھے جو اسلام نے عربوں میں پیدا کی تھی. فارسی لغۃ کا عربوں میں عام رواج فی الحقیقت فارسیۃ اور فارسی معاشرت کا رواج ہوتا جس سے نہ وہ عربیۃ ہی کے رہتے اور نہ فارسیۃ ہی کے ہوتے۔ یعنی کچھ ادھر مائل اور کچھ اُدھر کے گھائل بنجاتے اور ان میں وہی دورُخی کے جراثیم پیدا ہوجاتے جسکو نفاق کہتے ہیں۔ اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ

من یحسن ان یتکلم بالعربیۃ فلا یتکلم بالعجمیۃ فانھا تورث النفاق	جو عربی اچھی طرح بول سکتا ہے وہ عجمی (فارسی) میں نہ بولے کیونکہ وہ نفاق پیدا کرتی ہے۔
(اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ)۔	

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی اسوہ کے ماتحت مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ

ایاکم ورطانۃ الاعاجم وقال عجمیوں کی بک بک سے بچو اور فرمایا کہ

انہا خِبٌّ (اقتضاء) وہ دھوکہ ہے۔

پس حضورؐ نے اس وقت کی فارسیۃ کو نفاق اور فاروقِ اعظمؓ نے دھوکہ بتلا کر اس اصول کیطرف رہنمائی فرمائی ہے کہ جب تک زبان پر کسی قوم کا قبضہ نہ ہوجائے اور اس کی مخصوص روایات اس میں دخیل ہوکر اُس کا غالب عُنصر نہ بن جائیں اس کی عام تعلیم یا اُسے عام طور پر قبول کرنا دھوکہ۔ نفاق اور دورُخی پیدا کرتا ہے جس سے انسان نہ پوری طرح اپنا ہی رہتا ہے نہ غیر ہی کا ہوتا ہے اور انسانی دائرہ میں یہ ایک انتہائی ذلیل اور ناپاک حالت ہے۔

ہاں جب فتح ایران کے بعد فارسی زبان بھی فتح ہوگئی اور مسلمانوں کے غلبۂ شوکت کے ماتحت یہ زبان اسلامی محاورات، اسلامی علوم، اسلامی معاشرت اور مسلمانوں کی عام اسلامی ذہنیت سے مالامال ہوگئی گویا فارسیۃ ومجوسیۃ کے بجائے وہ اسلامیۃ اور عربیۃ کی ترجمان ہوگئی تو وہ فی الحقیقت کوئی غیر زبان ہی نہ رہی بلکہ اپنی ہوگئی اور اس لئے اُسے نہ صرف قبول ہی کرلیا گیا بلکہ اس کے بقار کو عربیۃ کا بقار اور اس کے تحفظ کو اسلامیت کا تحفظ سمجھا جانے لگا۔

یہ جداگانہ بات ہے کہ غلبہ اور فتحیابی سے پیشتر کسی اسلامی ضرورت سے غیر زبان کو خصوصی طور پر سیکھا جائے مثلاً اسلامی تبلیغ یا غیر ممالک سے سیاسی غیر سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لئے اگر مسلمانوں کے مخصوص افراد کسی غیر زبان کو سیکھیں تو یہ صورت حال ہمارے مذکورہ دلائل سے ممنوع نہیں ہے کیونکہ ایک بضرورت کسی زبان کو خصوصی طور پر استعمال کرنا ہے اور ایک عمومی ترویج سے اسے اپنا شعار بنا لینا ہے۔ پہلی صورت میں غیر زبان خود اپنے تمدن وتہذیب کی اشاعت وترویج کیلئے آلۂ کار بنتی ہے اور دوسری صورت میں وہ اپنی مخصوص روایات کے مٹانے کا واسطہ ثابت ہوتی ہے۔

غیر زبانوں کی تعلیم کے متعلق آنحضرتؐ کا ارشادِ گرامی

آج یورپین ممالک کے لوگ جن جن مشرقی ممالک پر اپنا اثر و اقتدار قائم کئے ہوئے ہیں ان کی زبانوں کو بھی سیکھتے ہیں لیکن اپنا شعار بنانے کیلئے نہیں۔ بلکہ خود اپنے شعائر کو رائج کرنے کے سلسلہ میں غیروں کے تمدن و معاشرت سے باخبر ہونے کیلئے بس اس طرح کے مصالح کے ماتحت غیر زبانوں کی خصوصی تعلیم کو شریعت اسلام بھی ممنوع قرار نہیں دیتی بلکہ اُس کے جواز کا عملی اسوہ اس میں موجود ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اقوام سے عبرانی زبان میں مراسلت کرنے کیلئے یہود کو ترجمان بنایا لیکن جب نوشت و خواند میں ان کی خیانت ثابت ہوئی تو آپ نے مخصوص صحابہؓ کو عبرانی سیکھنے پر مامور فرمایا اور حضرت زید بن ثابت نے سترہ دن میں عبرانی زبان سیکھکر اس بارہ میں حضورؐ کو یہود سے مستغنی کر دیا۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے حبشی زبان کے بعض کلمات کا تکلم فرما کر حقیقتاً مخصوص حالات میں غیر زبانوں کے خصوصی تکلم کی اجازت دی ہے۔ حضرت ام خالد بنت خالد بن سعید بن العاص حبشہ میں پیدا ہوئی تھیں جبکہ ان کے والد نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی حضورؐ نے ان کو اپنا قمیص متبارک پہنایا اور فرمایا۔

یا ام خالد ھذا سنا — اے ام خالد یہ بہت خوشنما ہے (سنا حبشی زبان میں خوبصورت کو کہتے تھے)

یا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جبکہ ایک فارسی کے پیٹ میں درد ہوا۔

اشکم بدرد — کیا پیٹ میں درد ہے؟

دو نتیجیں

بہر حال ایک ہے کسی غیر زبان میں کلام کرنا یا خصوصی طور پر مخصوص افراد کو بضرورت اس کی تعلیم دلانا اور ایک ہے اُسے بطور اپنے شعار کے قبول کرنا۔ تو یہ قبولِ عام کا اُس کو شعار بنانا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ وہ زبان مفتوح ہو کر اجنبی نہ ہو جائے اور اس کی تعبیرات و محاورات پر عربیت و اسلامیت قبضہ نہ کر لے کیونکہ کسی قوم کی زبان سے اصل مقصود اُن ہی مخصوص حقائق و روایات

اور خیالات و کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے جو اس قوم کے ہیں اور جبکہ غیر مفتوحہ زبانوں کی ترویج سے وہی حقائق مٹتی ہوں جو اپنی زبان کا مقصد وحید تھا تو پھر اس ترویج و اختلاط کو کیسے برداشت کیا جا سکیگا۔

غیر اسلامی لغات و محاورات کی ترویج کی ممانعت

نہیں بلکہ اس معیار کے لحاظ سے شریعت اسلامیہ نے تو یہانتک احتیاط کی ہے کہ غیر زبان تو بجائے خود اپنی دینی عربی زبان کے بھی وہ کلمات جو غیر مسلم اقوام کے ممتاز کلمات یا مخصوص اصطلاح شمار ہوتے ہوں مسلمان استعمال نہ کریں تاکہ ادھر تو مسلمانوں کے مخصوص محاورات محفوظ رہیں اور اُدھر غیروں کے مخصوص لغات کی ترویج سے مسلمانوں کی زبان اور زبان کے واسطہ سے اخلاق و عادات اور خیالات پر بُرا اثر نہ پڑے۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے ہدایت کی کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حالت پر توجہ دلانے کے لئے راعنا (ہماری رعایت کیجئے) کا لفظ استعمال نہ کریں کہ یہ یہود کی اصطلاح ہے بلکہ اُنظرنا (ہم پر نگاہ کرم کیجئے) کا کلمہ استعمال کریں۔ خود حضورؐ نے فرمایا کہ نمازِ عشا کو عتمہ مت کہو کہ یہ گنواروں کی اصطلاح ہے بلکہ عشار کہو جو اسلامی اصطلاح ہے۔ فرمایا کہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے پاس کی انگلی کو سبابہ مت کہو یہ اہلِ جاہلیت کا لغت ہے بلکہ سباحہ کہو کہ یہ اسلامی لغت ہے آپ نے فرمایا کہ تحیۃ کے وقت حُیّیتم صباحاً وغیرہ مت کہو کہ یہ اہل جاہلیت کا تحیۃ ہے بلکہ السّلام علیکم کہو کہ یہ اسلامی تحیۃ ہے۔

ایک فارسی نوجوان صحابی نے غزوۂ احد میں ایک مشرک پر تلوار کا وار کرکے کہا کہ لے یہ میرا ہاتھ دیکھ وانا الغلام الفارسی تو حضورؐ نے فرمایا یوں کیوں نہیں کہتا کہ وانا الغلام الانصاری یعنی اس موقعۂ رجز و شجاعت میں اعلان بھی اسلامی ہی نسبتوں کا ہونا چاہیئے نہ کہ وطنی نسبتوں کا۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ دکاندار کو سمسار مت کہو کہ یہ اہل جاہلیۃ کا لغتہ ہے بلکہ تاجر کہو جو قرآن کا لغتہ ہے[1]۔

---

[1] یہ تمام آثار اقتضار الصراط المستقیم میں منقول ہیں

اس سے اصولاً واضح ہوتا ہے کہ عربی زبان سے بھی محض عربی الفاظ مقصود نہیں بلکہ ایک مخصوص ذہنیت وکیفیت کے ساتھ ایک مخصوص اور مستقل قوم کے حقائق کی ترجمانی مقصود ہے جسکی تعبیرات بھی مخصوص اور اپنی ہی ہوں ورنہ عربی زبان سے خود عربی کے الفاظ ان شرعی ہدایات کی رو سے ہرگز نہ نکالے جاتے۔

اسی سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اگر یہی اسلامیت وعربیت اور یہی اسلامی محاورات وتعبیرات کسی غیر عربی زبان کا جامہ پہن لیں اور اس سے اس طرح وابستہ ہوجائیں کہ وہ زبان انہی اسلامی حقائق کی ترجمان کہلانے لگے تو چونکہ اصل مقصود ان حقائق کا تحفظ ہے اس لیے اس زبان کا تحفظ بھی ضروری ہوجائے گا۔ کیونکہ خود عربی زبان کا تحفظ بھی انہی حقائق کے تحفظ کی خاطر مطلوب ہے، پس جس دلیل سے عربی کی حفاظت ناگزیر ہوگی اسی دلیل سے اس زبان کی حفاظت بھی ایک شرعی فریضہ ہوجائیگا جو عربیۃ کی حامل اور اس کے حقائق کی ترجمان بن جائے۔

اردو زبان کی اسلامی حیثیت

آج ہندوستان میں اردو کی حیثیت کلیتہً یہی ہے کہ وہ اسلامی محاورات کی امین عربیت کی ترجمان اسلامی علوم وفنون کی حامل اور عام اسلامی ذہنیت کی آئینہ دار ہے اس کی شاعری ہو یا نثر کتب ورسائل ہوں یا مضامین ومقالات پھر ادبی سلسلہ میں غزلیات ہوں یا قصائد حقائق نویسی ہو یا واقعہ نگاری تشبیہات ہوں یا استعارات، ضرب الامثال ہوں یا کہاوتیں یا قصص تاریخ وایام ہوں یا سنین وشہور، اصطلاحات ہوں یا عنوانات، نعرے ہوں یا رجز، تحیات ہوں یا القاب وخطابات غرض اس زبان کا کوئی بھی شعبہ ہو سب میں اسلامی ذہنیت کی روشنی مذہبیت کا رنگ دینی جذبات کی آمیزش، خداشناسی کی جھلک، اکابرینِ اسلام کی روایات اور پیغمبروں اور اولیاء کی سیرتوں کی چاشنی اس درجہ اس میں رچی ہوئی ہے کہ اس کا ہر گوشہ عام نگاہوں میں اسلامی گوشہ اور اس کا ہر فقرہ اسلام کا فقرہ محسوس ہوتا ہے۔

ایک مسلمان اپنی روزمرہ کی بات چیت اور محاورات میں جو کلمات استعمال کرتا ہے وہ عربیت اور اسلامیت کی اس درجہ آمیزش لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ غیر مسلم ان کے استعمال کی کبھی جراٴت ہی نہیں کر سکتا مثلاً ابتدائے کار پر بسم اللہ۔ من مانے کام ہوجانے پر الحمدللہ تعجب پر سبحان اللہ۔ قدر افزائی پر ماشاء اللہ، تحاشی و تبری پر معاذ اللہ۔ ندامت پر استغفراللہ، افسوس پر اناللہ، حلف پر واللہ باللہ، توقع پر انشاء اللہ، بچاؤ پر اللہ اللہ، ندا پر یا اللہ، شکریہ پر جزاک اللہ، اظہارِ عظمت پر لا الہ اللہ، ظہورِ منکر پر لاحول ولاقوۃ الا باللہ، پیغمبروں کا نام آنے پر صلی اللہ، جوش پر اللہ اکبر وغیرہ اس کی بے تکلف زندگی ہے جبکہ اسی قسم کے اسلامیت شعار اور عربیت نواز محاورے اردو کی روح ہیں تو پھر کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ اُسے اسلامی زبان نہ کہا جائے اور مسلمانوں کی چیز نہ شمار کیا جائے۔

دو مسلمانوں میں ملاقات اور مکالمے کا آغاز ہوتے ہی بے تکلف جو کلمات نکلتے ہیں وہ صرف عربیت و اسلامیت ہی کے آئینہ وار ہوتے ہیں مثلاً السلام علیکم، مزاج اقدس یا مزاج شریف، جنابعالی، خیروعافیت، تشریف ارزانی، ماحضر، تناول، اہلبیت کی صحت، حاضر ہوتا ہوں وغیرہ وغیرہ ان جملوں کا اگر عطر کشید کیا جائے تو اسلامیۃ وعربیۃ کے سوا ان میں سے اور کیا نکل سکتا ہے؟ یہ وہ جملے ہیں جو ملاقات ہوتے ہی گویا ایک سانس میں زبان سے نکلتے ہیں، اس سے دوسری عام بے تکلف گفتگوؤں کا اندازہ کر لیا جائے۔ اور وہ تصانیف یا عبارات یا شاعری جس میں ایک اردو کا مصنف یا شاعر کچھ سوچ بچار سے کام لیکر کلام کرے تو اس کی اسلامی ذہنیت جس عربیت و اسلامیت کا مظاہرہ کرے گی وہ اس سے بھی زیادہ ہوگا جو ان جملوں سے اندازہ کرایا گیا ہے۔ غرض عربی زبان جوہر ہے اور اردو زبان وہ آئینہ ہے جس میں اس جوہر کی عکاسی ہو رہی ہے تو کیا اس اسلامیۃ کی آئینہ داری کے ہوتے ہوئے اُردو مسلمانوں کے لئے کوئی ناقابل اعتنا زبان رہ جاتی ہے؟ اگر فی الحقیقت اللہ کے ان ناموں اُس کے اُن محاوراتی حقائق و معارف کی حفاظت کوئی اسلامی فریضہ ہے جن کو اُردو کی تعبیرات نے

اپنے دامنوں میں چھپا رکھا ہے تو خود اردو کی حفاظت کیوں اسلامی فریضہ نہیں ہے؟ پھر اردو کی صورت چھوڑ کر اگر اس کے مادہ پر غور کیا جائے تو مسلمانوں نے اپنے مخصوص علمی مذاق کے ماتحت اسلامی علوم اس میں منتقل کئے۔ آج کوئی علم وفن ایسا نہیں جس میں ہزاروں کی تعداد میں اردو کے سفینے موجود نہ ہوں اور عربی سے اردو میں منتقل نہ ہو چکے ہوں۔

پھر ایک علوم قدیمہ ہی نہیں بلکہ علوم جدیدہ اور فنون عصریہ کا لامحدود ذخیرہ ہے جسے مسلمانوں نے اردو کی زینت بنا دیا ہے۔ دکن کی دولت ابد مدت نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے سائنس، فلسفہ، کیمسٹری، تاریخ، جغرافیہ اور تمام جدید فنون کو دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ غرض اردو زبان آج ایک قابل فخر علمی زبان بن گئی ہے جس نے تمام علوم قدیمہ وجدیدہ کو اپنے وسیع دامنوں میں چھپا لیا ہے۔ پس جس طرح اس وقت ہندوستان کی کوئی ایک زبان بھی خواہ وہ ہندی ہو یا سنسکرت اس میدان میں اپنے کو سرخروئی کے ساتھ پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے اسقدر علوم وفنون کا ذخیرہ اپنی تعبیرات کے بطون میں پنہاں کر رکھا ہو۔ اسی طرح اس ملک کی کوئی ایک قوم بھی خواہ وہ ہندو ہو یا غیر ہندو اپنے کو پیش نہیں کر سکتی کہ اس نے مسلمانوں کی برابر نہ سہی اُس کی آدھی تہائی بھی اس ترقی اردو اور اس کے مادۂ وصورت کے بنانے اور سنوارنے میں حصہ لیا ہو۔ چنانچہ اردو کے اسلامی اور مسلمانوں کی زبان ہونے کی ایک سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم اُسے بحالت موجودہ اپنی نہیں بلکہ مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کی نوک پلک قطع کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

غور اس پر کیجئے کہ وہ اردو کی فکر میں محض ایک زبان ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہیں کہ وہ اسلامیت اور عربیت کی ترجمان ہے۔ پس وہ نفس اردو کو مٹانا نہیں چاہتے بلکہ اس کی عربیت اور اس مخصوص اسلامیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پس اگر وہ اسلامیت وعربیت کے

فنا کرنے کی خاطر اردو کی ہیئۃ تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو کیا اسی اسلامیت کے بقار کی خاطر مسلمانوں کا شرعی فریضہ نہ ہوگا کہ وہ اردو کو اس کی اسی ہیئۃ کذائی کے ساتھ باقی رکھنے کی ان تھک سعی کریں؟

جبکہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ خود عربی زبان کا بقار و تحفظ بھی اسی اسلامیت کے بقار کے لئے ایک شرعی فریضہ ہے پس علّت کے اشتراک سے حکم بھی مشترک رہیگا۔ اگر عربی زبان کا بقار اسلامیت کی خاطر فرض ہے تو ہندوستان میں اُسی علۃ وحکمۃ کی خاطر اردو کا بقار بھی شرعی فرض ہوگا۔ اگر خدانخواستہ اردو کا یہ اسلامی مغز نکالکر اس کے چھلکے کو باقی رکھا جائے یا اس کے موجودہ شیریں مغز کے بجائے اس میں کسی مردہ زبان کا تلخ مغز بھر دیا جائے تو مسلمان اُسے کیسے برداشت کر سکیں گے کہ ان کے یہاں چھلکے کا تحفظ ہی صرف مغز کی خاطر ہے۔ (باقی)

دلّی کا آخری مغل تاجدار

جدید تاریخی تحقیق کی روشنی میں

از جناب ہدایت الرحمٰن صاحب محسنی ایم اے

(۳)

۱۴ - لارڈ موئیرا کے حکم سے گورنر جنرل کی مہر سے ایسے نشانات بھی حذف کر دیئے گئے جن سے سلطنتِ مغلیہ کی ماتحتی کا اظہار مقصود تھا۔ ان امور کی بنا پر کئی سال تک بادشاہ اور برطانوی حکومت کے درمیان خط وکتابت بند رہی۔ بایں ہمہ ۱۸۲۷ء میں لارڈ اَیمہرسٹ نے بادشاہ سے ملاقات کی جسکو دوستانہ تعلقات کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس موقعہ پر نذر پیش کرنے کے مسئلہ کو بڑی احتیاط سے نظر انداز کیا گیا تھا۔ بادشاہ سے خط وکتابت کے سلسلہ میں بھی لارڈ اَیمہرسٹ نے ایسے تمام فقروں اور عبارتوں کو ترک کر دیا جس سے یہ مترشح ہونے کا امکان ہو کہ کمپنی بہادر سلطنتِ ہند کے زیرنگیں ہے۔ ان تبدیلیوں پر بادشاہ نے ہمیشہ ایسے زوردار الفاظ میں اپنی توہین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جو کسی صورت میں زیرغور معروضات سے کم نہ تھے۔ اسی وجہ سے لارڈ ولیم بنٹنگ نے دانستہ طور پر بادشاہ کی ملاقات سے احتراز ضروری سمجھا۔ جہانتک حالات پہنچ چکے تھے اب یہ ممکن نہ تھا کہ بادشاہ کی آرزو کے مطابق برطانوی افسر اپنے رویہ کو تبدیل کریں۔ موجودہ گورنر جنرل اپنے پیش رووں کے نقش قدم پر چلنا ضروری خیال کرتے تھے۔ لارڈ اَیمہرسٹ کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ نام نہاد مغل شاہنشاہیت کا ظاہری طور پر اعتراف کرتے رہنا ایک قابلِ اعتراض طرزِ عمل ہے۔ بحالت موجودہ تباہ شدہ شاہی خاندان ایک معمولی

ہمدردی کے علاوہ دوسری مراعات کا مستحق نہ تھا۔

۱۵۔ مذکورہ بالا ملاقات کے بعد جب لارڈ امہرسٹ کلکتہ واپس آئے تو انھوں نے مجلسِ مشاورت کے اتفاق سے یہ فیصلہ کیا کہ سفیرِ دہلی کا گورنر جنرل کی جانب سے سال میں چار تہواروں پر بادشاہ کی حضور میں نذر گذراننا کمپنی بہادر کے اقتدار کے منافی ہے۔ بقدرِ اِن رقومات کے یا تو بادشاہ کے وظیفہ میں اضافہ کر دیا جائے یا یہ رقم بھی اُن نذرانوں میں ملا دی جائے جو برطانوی ایجنٹ اپنی طرف سے پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۰ر نومبر ۱۸۳۰ء کو ہم نے یہ منظور کر لیا کہ گورنر جنرل کے نذرانوں کی رقم بھی ایجنٹ ہی اپنے نذرانوں میں اضافہ کر کے پیش کیا کرے۔

۱۶۔ جب ماسبق گورنر جنرل کی توجہ ان سالانہ نذرانوں کی طرف مبذول کرائی گئی جو لارڈ امہرسٹ نے ایجنٹ کے نذرانوں میں اضافہ کی صورت میں برقرار رکھی تھیں تو یہ طے پایا کہ ماتحتی کا یہ ادنیٰ مظاہرہ بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ چنانچہ انھوں نے اُن رقومات کو کلیتہً ترک کر دینے کے احکامات صادر فرما دیئے اور ساتھ ساتھ ملک معظم کو اطمینان دلا دیا گیا کہ حکومتِ برطانیہ کے نمایندوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ بادشاہ کے ساتھ رواداری اور توجہ سے پیش آئیں اور حسبِ معمول دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کیلئے بطورِ خود نذرانے بھی پیش کریں۔

۱۷۔ ملک معظم نے ۲۶ر مارچ ۱۸۴۳ء کے خریطہ میں نذرانہ ترک ہو جانے پر مالی نقصان کی پُر زور الفاظ میں شکایت کی۔ بنا بریں گورنر جنرل نے حکم صادر فرمایا کہ بادشاہ کے ماہانہ وظیفہ میں دس ہزار روپیہ سالانہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ گو اس موقعہ پر بھی وہی طریقہ کار اختیار کیا گیا جو پہلے برتا گیا تھا۔

۱۸۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ مملکت ہندوستان میں کمپنی بہادر کی حکومت کو جو بلند رتبہ حاصل ہو چکا ہے اس کے پیشِ نظر یہ امر کسی حالت میں بھی سزاوار نہیں ہے کہ برطانوی سلطنت کے نمایندے بادشاہ کی جناب میں خراجِ عقیدت کے طور پر نذرانہ پیش کر کے مغلیہ سلطنت کی اطاعت

گذاری کا اعتراف کریں۔

۱۹۔ تاہم ان مصالح کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ بغیر کسی قصور کے ایک شخص سے وہ مراعات واپس لے لیں جن کا وہ روایتاً عادی ہو چکا ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اپنے یکم مئی نمبر ۱۹ کے مراسلہ میں (جو قرائن سے معلوم ہوتا ہے شمال مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر کو بھیجدیا گیا ہے۔) جہاں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اکثر صورتوں میں برطانوی حکومت کے نمایندوں کے لئے مقامی حکمرانوں کے سامنے سیاسی ماتحتی اور کمتری کا مروجہ طریقۂ کار ختم کر دینا ضروری ہے وہاں یہ بھی تحریر ہے کہ ہم تیمور خاندان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے مجوزہ تبدیلیوں کو مغل بادشاہ کی آئندہ رسم تاجپوشی تک ملتوی رکھیں گے۔ گویا بادشاہ کے احتجاج کی بنا پر مروجہ رسوم شاہی ان کی زندگی تک باقی رہینگی

۲۰۔ ہم خیال کرتے ہیں اس اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔

۲۱۔ اب ہم شاہی مراسلات کے اس حصہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں شاہی وظیفہ کے اضافہ پر زور دیا گیا ہے۔

۲۲۔ جو گذارشات گورنر جنرل کی خدمت میں جنوری ۱۸۴۳ء میں پیش کی گئی ہیں اُن کا وہ حصہ جو شاہی وظیفہ سے متعلق ہے ذیل کی عبادت پر مشتمل ہے۔

"یہ کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ جو حکومت نے شاہی خاندان کی گذراوقات کیلئے مقرر کیا تھا افزائش نسل کی وجہ سے موجودہ ضروریات کیلئے قطعی ناکافی ہے۔ چونکہ موجودہ اخراجات آمدنی سے بہت زیادہ ہیں اسلئے وظیفہ کی کمی شاہی خاندان کیلئے بیحد دشواریوں کا باعث بنی ہوئی ہے اسی وجہ سے دربار کے نظام میں ابتری پیدا ہو گئی ہے اور ملک معظم کیلئے ازحد پریشانی کا سبب ہے۔ نظم و نسق کی یہ خرابیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور ان کا تدارک صرف توسیع وظیفہ ہی سے ممکن ہے۔

"یہ کہ سابق بادشاہ کے عہدِ حکومت میں برطانوی افسران نے ملک معظم کی انھیں دشواریوں کا احساس کرتے ہوئے شاہی وظیفہ میں اضافہ منظور کیا تھا۔ ملک معظم کی خواہش ہے کہ اضافہ شدہ رقم کی تقسیم کا مسئلہ بھی انہی کے اختیار میں رکھا جائے تاکہ وہ ہر شخص کی ضروریات کا اندازہ لگا کر اپنے طور پر حصے مقرر فرماسکیں۔ مزید برآں توسیع وظیفہ کے ابتدائی احکام کی تاریخ سے تاحال غیر اداشدہ رقوم یکمشت ملک معظم کو ادا کردی جائیں۔ تاکہ گذشتہ سالوں کے قرضے بیباق کئے جاسکیں اور شاہی عمارتوں کی مرمت کرائی جاسکے۔"

۲۳۔ ملک معظم کا یہ خط جو ۱۹ر جنوری ۱۸۴۰ء کا تحریر کردہ ہے بہت سے بے بنیاد دعووں کا حامل ہے۔ دراصل یہ اُن تمام حقوق کی تجدید کراتا ہے جن کے استحکام کے لئے رام موہن رائے آنجہانی کو ملک معظم کے پیشرو نے انگلستان روانہ کیا تھا اور جس کے بارہ میں ہمارا آخری فیصلہ ۱۸۳۳ء میں روانہ کیا جاچکا ہے۔

۲۴۔ ملک معظم کے ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ کے وظیفہ میں مزید ۳ لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ کرنیکے سلسلہ میں ہماری شرائط یہ تھیں کہ بادشاہ کو اضافہ شدہ رقم اسوقت ملیگی جب وہ اپنے جملہ حقوق حکومتِ برطانیہ کے حق میں واگذار کردینگے۔ دوسرے یہ کہ ۲۵ ہزار روپیہ ماہانہ کی رقم شاہی خاندان کے افراد میں گورنر جنرل کے منشار کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔ اس تجویز کے مطابق گورنر جنرل نے جو تقسیم منظور کی تھی وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) پانچ ہزار روپیہ سالانہ قلعہ کی مرمت پر صرف ہونگے۔

(۲) ۵۲۵ روپیہ شاہی خاندان کے کم عمر افراد کی تعلیم پر صرف ہوں گے۔

(۳) دو ہزار روپیہ ولیعہد کے وظیفہ میں اضافہ کئے جائیں گے۔

(۴) پانچ سو روپیہ ملک معظم کی دوسری بیگم کے وظیفہ میں اضافہ کئے جائینگے۔

(۵) اور باقیماندہ رقم ملک معظم کے ایسے غریب خویش واقارب میں تقسیم کی جائیگی جن کے لئے بادشاہ نے گذر اوقات کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا ہے۔

اس تقسیم پر زیادہ زور اس وجہ سے دیا گیا تھا کہ بادشاہ کا ذاتی وظیفہ پہلے ہی بہت کافی تھا۔ لیکن یہ شرائط بادشاہ نے قبول نہ کیں اور توسیع وظیفہ کا مسئلہ نامنظور کر دیا گیا۔

۲۵۔ بادشاہ کا وظیفہ جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے ساتھ شاہی خاندان بھی معزز زندگی بسر کر سکے۔ چنانچہ گورنر جنرل اپنے فرضِ منصبی کے پیش نظر سابق ملک معظم کا پیش کردہ طریقہ تقسیم منظور نہ کر سکتے تھے۔

۲۶۔ شاہ موصوف نے رام موہن رائے کے لڑکوں اور مرزا محمد سلیم کیلئے تین لاکھ روپیہ بطورِ خاص اور تین ہزار سات سو پچاس روپیہ ماہانہ دائمی طور پر دیا جانا تجویز کیا تھا۔ اضافہ شدہ تین لاکھ روپیہ سالانہ میں سے بادشاہ ایک فیصدی غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے اور اُن کا منشا یہ بھی تھا کہ اس رقم میں سے حسب خواہش ایک غیر متعین رقم اس قرضہ کی ادائیگی میں دیتے رہیں جو وقتاً فوقتاً وکلائے شاہی کو کلکتہ اور انگلستان بھیجنے پر صرف ہوا تھا۔

۲۷۔ بادشاہ کی اپنی تجاویز اور ان سے خاندان کے افراد کے حقیقی مفاد میں اتنا تضاد ہے کہ طرفین میں سے ایک کی خوشنودی حاصل کرنا اور دوسرے کی بہبودی مدنظر رکھنا بیک وقت مشکل ہے۔ بادشاہ کا اولین مقصد یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح دربار کی شاہانہ شان وشوکت برقرار رکھی جائے اور ان کے حلقۂ اثر سے شاہی خاندان کا کوئی فرد کسی حالت میں آزادی حاصل نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قلعہ کی چار دیواری میں مقید رہنے کی وجہ سے شاہی خاندان کی موجودہ نسلیں ایک ناقابل اصلاح پستی تک پہونچ چکی ہیں۔

۲۸۔ پولٹیکل ایجنٹ نے سلاطین کے طبقہ کے بارہ میں جو خیال ظاہر کیا ہے وہ یہ ہے " یہ لوگ

ہر قسم کے قانون سے آزاد ہیں۔ رائے عامہ کی پرواہ کئے بغیر کاہلی اور آوارہ منشی کو اپنا مستقل شعار بنا چکے ہیں۔ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت اور مستقبل کے بہبود کے خیال سے قطعی غافل ہیں۔ خود سلاطین نے ۱۸۳۹ء کی عرضداشت میں اپنی حالتِ زار کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ "شاہ تیمور کی اولاد اور مغل بادشاہوں کے بیٹے اور پوتے، بغیر کسی مالی اعانت کے زندگی گذار رہے ہیں۔ ہم میں سے اکثر تو صبح و شام کی روٹی کیلئے بھی محتاج اور عاجز ہیں۔ ہم کو بادشاہ کی طرف سے جو نام نہاد وظیفہ ملتا ہے وہ ہماری اور ہمارے خاندان کی ضروریات کیلئے ناکافی ہے اور ہمارے پاس کوئی دوسرا ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔"

۲۹۔ اس مظاہرہ کے بعد برطانوی سفیر مقیم دہلی کا یہ فعل حد درجہ دانشمندی پر مبنی تھا کہ اس نے چھوٹے خاندانوں کو قلعہ کے مذموم اثرات سے علیحدہ کرنا چاہا۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ ان لوگوں کو برطانوی قوانین کے ماتحت شہروں اور صوبوں میں شہری حقوق دیئے جائیں اور ان کی حسبِ ضرورت وظائف مقرر کئے جائیں۔ سلاطین کو شاہی اقتدار سے آزاد کرانیکا یہ اقدام دوگونہ مصالح کا حامل تھا ایک تو یہ کہ شاہی خاندان کا بیجا غرور اور غلط دعاوی ختم ہو جاتے اور دوسرے یہ کہ عام شہریوں کی مانند سوسائٹی میں رہ کر ان لوگوں میں خود اپنی فلاح و بہبود کا جذبہ پیدا ہو جانا بھی عین قرین قیاس تھا۔

۳۰۔ سلاطین کا محض وثیقہ مقرر کر دینا بڑی بات نہیں ہے۔ ہمیں اپنے فرائض کے ماتحت اس تباہ شدہ خاندان سے کچھ اور زیادہ ہمدردی ہے۔ ہم یہ کوشش کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی دماغی اور ذہنی صلاحیتوں کو ابھاریں لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ قلعہ کی محدود دنیا اور اس کے نامبارک اثرات سے علیحدہ کر دیئے جائیں تاوقتیکہ دنیوی ترقی کے نئے مراحل اور روزافزوں بین الاقوامی تجارت کے اعلیٰ مقاصد سے آگاہ ہو کر وہ اپنے کردار کو بہتر بنا سکیں تاوقتیکہ یہ واحد طریقۂ کار اختیار نہ کیا جائے گا محض وثیقوں میں اضافہ کر دینے سے ایک عارضی خوشنودی کے علاوہ اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر حالات جوں کے توں رہے تو آئندہ چند ہی

سالوں میں سلاطین کی تباہی۔ فلاکت۔ آوارگی اور ذلت کی المناک داستان زیادہ سے زیادہ مکمل ہوکر منظر عام پر آئے گی۔ کیونکہ ناعاقبت اندیشی سے یہی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔

۳۱۔ ہماری یہ عین خواہش ہے کہ اس خاندان کے کم درجہ افراد عام شہریوں میں داخل ہوکر نام نہاد شہزادیت کے تفوق میں گرفتار نہ رہیں۔ اس نہج سے زیادتی وظیفہ سے ان کی زندگی میں بہتری کے آثار پیدا ہوسکتے ہیں۔

۳۲۔ ہمیں یقین ہے کہ اس تجویز سے بادشاہ کو ہرگز اختلاف نہ ہوتا اگر وہ دیکھتے کہ اس سے ان کو بھی مالی مفاد ہے لیکن اضافہ شدہ رقم پر ان کو اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ سلاطین کی بہبود کا اہم مقصد قطعی فوت ہوجائے۔

۳۳۔ چھوٹے چھوٹے وظائف کے علاوہ جو حکومت برطانیہ کے احکامات کے ماتحت شاہی خاندان کے کم حیثیت اشخاص وظیفہ شاہی سے حاصل کرتے رہے ہیں ملک معظم ان میں سے اکثر کو گاہ گاہ صرف خاص سے کچھ رقوم دیتے رہے ہیں۔ لیکن برطانوی امداد کے علاوہ وہ کسی مالی اعانت پر بھروسہ نہیں کرسکتے ہیں۔ نہ اس کے جاری رہنے کی کوئی مستحکم توقع کی جاسکتی ہے۔ اگر مستقل وظائف کی طرح ایسی رقوم کی تقسیم پر بھی کوئی پابندی عائد کردی جائے تو یہ امر سلاطین کیلئے بے حد فائدہ مند ہوگا اس کے ساتھ ساتھ سابق بادشاہ کی تجویز کے مطابق اگر وظیفہ شاہی میں اس غرض سے اضافہ کیا جائے کہ ان لوگوں کا خیال رکھا جائیگا تو حالات میں نمایاں بہتری پیدا کی جاسکتی ہے۔

۳۴۔ مذکورہ بالا اصولوں اور مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم آپ (گورنر جنرل) کو اختیار دیتے ہیں کہ تین لاکھ روپیہ سالانہ کی منظور شدہ رقم میں حسب ضرورت ترمیم کرکے بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کریں کہ ان کے ذاتی اخراجات کیلئے ایک مقررہ رقم بشرائطِ ذیل دیجاسکتی ہے۔

(۱) اول یہ کہ ملک معظم کو مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق خاندانِ شاہی کے ادنیٰ افراد میں وظیفہ کی

ایسی رقوم تقسیم کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا جو گورنر جنرل کے خیال میں مناسب سمجھی جائیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ ملک معظم ہماری اس تجویز میں حائل نہ ہوں گے کہ اُن کے دور دراز کے عزیزوں کو قلعہ سے علیحدہ کر کے کسی ایسے مقام پر جو گورنر جنرل خود تجویز کریں آباد کر دیا جائے۔ اور یہ لوگ حکومتِ برطانیہ کے عام شہری باشندوں کی حیثیت سے مروجہ قوانین کے تحت اپنی زندگی بسر کریں۔ یہ انتظام بادشاہ کے لئے زیادہ فائدہ مند ہوگا چونکہ ایسے لوگوں کو جو قلعہ سے علیحدہ کئے جائیں گے صرف اضافہ شدہ رقم میں سے وظیفہ دیئے جائیں گے۔ جو وظیفے بادشاہ اپنے پاس سے دیتے ہیں وہ قلعہ سے باہر رہنے والے شاہی خاندان کے افراد پر صرف نہ ہوں گے۔ یہ رقوم بادشاہ کے اپنے مصارف کیلئے بچ سکیں گی۔ اس صورت میں ایسے اشخاص کو بھی وظیفہ جاری کر دیئے جائیں گے جو اب تک مالی امداد سے محروم ہیں۔

۳۵ - مزید براں چونکہ ملک معظم بحالت موجودہ اپنے قرضوں کی ادائیگی کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت محسوس کر رہے ہیں ہم گورنر جنرل کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر یہ امر بادشاہ سے سمجھوتے میں معاون ہو تو وہ اپنی رائے کے مطابق بادشاہ کی ان ضروریات کیلئے کوئی فوری انتظام کریں۔ خواہ بادشاہ کے موجودہ وظیفہ میں کسی فوری رقم کا اضافہ کریں یا قلعہ کی مرمت کا بار حکومت کے ذمہ لے لیں، یا ان دونوں صورتوں کے بین بین کوئی راہِ عمل اختیار کریں۔

۳۶ - ہمیں قوی امید ہے کہ ان انتظامات کے ذریعہ جن کا ہم نے گورنر جنرل کو مجاز قرار دیا ہے ملک معظم کی دشواریوں کا ان کی منشار کے مطابق ازالہ ہو سکیگا۔ اور یہ راہ عمل شاہی خاندان کے غریب افراد کے لئے بھی فائدہ مند ثابت ہوگی۔

(باقی آئندہ)

کلامِ عارف پر ایک نظر

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ ادیبِ فاضل)

برہان بابت فروری سنہ ۴۰ء میں نواب زین العابدین خاں عارف پر محترمہ حمیدہ سلطانہ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جو اس وقت علمی و ادبی حلقوں میں بنظرِ پسندیدگی دیکھا گیا تھا ذیل کا مضمون اس مقالہ کا تکملہ ہے۔ (برہان)

عارف کا کلام ہموار نہیں ہے اس کی وجہ اس کا وہ بکھراؤ ہے جو غدر میں تلف ہو جانے کی وجہ سے ہوا۔ عارف کے تمام اشعار کو تو بلند نہیں کہا جا سکتا لیکن ان میں سے اکثر نفسِ شاعری کی جان ہیں اور سادہ الفاظ کی سطح کے نیچے عمیق معنی اس طرح پنہاں ہیں کہ گویا عارف کے قالب میں غالب کی روح بول رہی ہے۔

عارف کے کلام میں تصوف کی چاشنی بہت ہے لیکن ان کا تصوف کوئی شغل دلچسپی نہیں اور نہ ان کی شاعری محض خیالی شاعری ہے بلکہ وہ حقائق سے لبریز ہے اس بنا پر ان کو اپنے معاصر شعرا میں ایک امتیازی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو ان کا تخیل اس درجے بلند ہو جاتا اور طرزِ بیان ایسا دلنشین ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاصرین سے بھی سبقت لیجاتے ہیں۔

عارف کے کلام میں شوخی و ظرافت کے بجائے حسرت و یاس کا عنصر زیادہ ہے متانت ان کے کلام کی خاص صفت ہے۔ عریاں خیالات اور لغو باتوں سے عارف کی شاعری بالکل پاک ہے۔ نازک سے نازک مقامات پر دامن بچا کر عارف اس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے گذر جاتے ہیں کہ بے اختیار مُنھ سے دادِ تحسین نکلجاتی ہے۔ اور یہی ایک اچھے شاعر کی شان ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز بہت بلند ہے

ایک موقع پر خود ہی فرماتے ہیں ؎

دیکھئے جو رہنے دے یہاں بلندیٔ ہمت — سدرہ پر بنایا ہے ہم نے آشیاں اپنا

ایک غزل میں اپنی عالی نسبی کا اس طرح ذکر کرتے ہیں ؎

رتبہ ہمارے جدؔ[1] کا فرشتوں سے پوچھئے — کیا اپنے خاندان کا بیان سلسلہ کریں

کلامِ عارف کا تاریخی اور واقعاتی حصہ

عارف مرحوم صاحب عالم مرزا فخرو فتح الملک بہادر کے بھی استاد تھے نواب معظم زماں بیگم صاحبہ فرماتی ہیں کہ ان کو صاحب عالم بہادر ایکسو بیس روپے ماہوار استادی کی تنخواہ دیتے تھے چنانچہ دیوانِ عارف میں ایک قصیدہ فتح الملک بہادر کی شان میں ہے اور اس سے اس واقعہ پر صاف روشنی پڑتی ہے۔

ہی سر پہ میرے سایۂ دامانِ فتحِ ملک — کیا شکر ہوں ادا کرمِ ذوالجلال کے

نیساں میں ابر اٹھتے ہیں جتنے اِدھر اُدھر — ممنون ہیں شاہزادۂ دریا نوال کے

عارف اور نواب ضیاؤالدین احمد نیرؔ رخشاں میں معاصرانہ چشمک تھی یہ دونوں صاحب علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ اور دونوں ہی حضرت غالب کے محبوب شاگرد اور عزیز تھے اس لئے کبھی کبھی شاعرانہ چوٹیں آپس میں چل جاتی تھیں۔ دیوانِ عارف میں ایک قطعہ ہے۔ اس قطعہ سے اس پر روشنی پڑتی ہی کہ حضرت غالب تورانی النسل ہونے کے باعث تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے اور ان کے فیضانِ صحبت نے عارف کے دل میں بھی اہلبیتِ اطہار کی عقیدت و محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔

ایک مرتبہ باہمی چشمک کے باعث نیرؔ رخشاں نے حضرت غالب کو عارف کی جانب سے بدظن کر دیا اور وہ اپنے پیارے شاگرد سے کچھ آزردہ ہو گئے تو عارف نے یہ قطعہ لکھکر بھیجا۔

قبلۂ جان و دل ترا فدوی — تجھکو کہوے بُرا یہ طاقت ہے

[1] عارف کے آبا و اجداد محمد بن حنفیہ بن حضرت علیؓ شیر خدا کی اولادیں سے تھے۔

اسد اللہ نام ہے تیرا — اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے
وردِ نامِ بزرگ کا تیرے — اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے[1]
حق نے سب پر کیا تجھے غالب — تجھ سے رو کش ہو کس کی طاقت ہے
مجھکو زیبا ہے جتنا ناز کروں — مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے
عرض کرتا ہوں شکوۂ حسّاد — گرچہ میری خلافِ عادت ہے
وہ سبب میں بیان کرتا ہوں — ان کی جس وجہ یہ شرارت ہے
فیضِ صحبت سے تیری نیر اغلام — جو بدل قائلِ امامت ہے
نیر و محو ہیں مرے دشمن — آسمان کی انھیں نیابت ہے
ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر — ایک آفت ہے ایک قیامت ہے
ایک جلتا ہے رشک سے دائم — بسکہ عزت انھیں نہایت ہے
دوسرا محوِ کینہ جوئی ہے — یہ ہمیشہ سے اس کی عادت ہے
زور کرتے ہیں ناتوانوں پر — زوف ہے گر یہی شجاعت ہے
ہیں وہ سارے جہان کے جھوٹے — قول میں اُن کے کب صداقت ہے

محو سے مراد غالباً نواب غلام حسین خاں محو ہیں۔ عارف مرحوم نیر و محو دونوں کے شاکی ہیں۔ حضرت غالب نے نیر و عارف کی اس معاصرانہ چشمک کی طرف ہی اشارا کرتے ہوئے عارف کی وفات پر لکھا ہے۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

لیکن ان شکر رنجیوں نے عارف و نیر کی باہمی دوستی اور عزیزانہ تعلقات پر ایسا اثر نہیں

---

[1] حضرت علیؓ کے لقب کی طرف اشارہ ہے۔

ڈالاتھا کہ وہ واقعی عناد کی صورت اختیار کرلیتی۔ عارف مرحوم کا دل نیر کی سچی محبت سے لبریز تھا اور اس صداقت وخلوص کی بناپر انھوں نے دو مدحیہ چیزیں نواب نیر کے لئے لکھیں جو اُن کے دیوان میں موجود ہیں ایک میں لکھتے ہیں

روشن سوا ہے ذات تری آفتاب سے ۔۔۔ حائل ہوں پردے چشم کے تو آئے کیا نظر
حق نے ضیاءِ دینِ محمدؐ تجھے کیا ۔۔۔ سو پردوں میں بھی نور ترا نکلے چیر کر
تو دوسرا ہے نیرِ اعظم جہان میں ۔۔۔ بے پردہ تجھ پہ رازہیں عیسیٰؑ[1] کے سربسر

پھر دوسری جگہ اس طرح گوہر فشانی کرتے ہیں۔

پیدا ہوا جہاں میں وہ فخر روزگار ۔۔۔ قدموں کے ساتھ جس کے لگی آئی ہی بہار
تیرے نسیم خلق سے کھلتا ہے مثلِ گُل ۔۔۔ جس جس کا دل گرفتہ ہے عالم میں غنچہ وار
رہتا ہے یا علیؑ ترے وردِ زباں سدا ۔۔۔ کیا بہترین وظیفہ کیا تو نے اختیار
یہ نام وہ ہے جس پہ ہے روح الامینؑ فدا ۔۔۔ یہ نام وہ ہے جسپہ جہاں سربسر نثار
مشکل کشائے ہر دو جہاں ہے وہ ذاتِ پاک ۔۔۔ وابستہ اُس کے ساتھ ہے سب کا کشادکار
وہ ہمدم رسولؐ ہے وہ ہمدمِ رسولؐ ۔۔۔ وہ شیرِ کردگار رہے وہ شیرِ کردگار
معلوم کر سکے ہے کوئی مرتضیٰؑ کی شان؟ ۔۔۔ عالم میں جز رسولؐ و بجز آفریدگار
اولادِ مرتضیٰ میں کیا حق نے جب تجھے ۔۔۔ ہمرتبہ تیرا کون ہے نواب نامدار
لایا ہوں نذر کو یہ قصیدہ ترے حضور ۔۔۔ الطافِ عام سے ترے ہو کر امیدوار
عارف قلم کو رکھدے اٹھا جلد دونوں ہاتھ ۔۔۔ بہرِ دعا بدرگہ دادار کردگار
ہو کامیاب خلق ترے باغِ خُلق سے ۔۔۔ جبتک ریاضِ دہر میں آیا کرے بہار

[1] مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰؑ چوتھے آسمان پر جو فلک خورشید کہلاتا ہے تشریف رکھتے ہیں۔

عارف وغالب | عارف نے ان زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ جو حضرت غالب کے اشہب خیال کی جولانگاہ رہیں۔ نمونہ کے لئے اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

غالب۔	منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے	عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا
عارف۔	دیکھئے جو رہنے دے یہاں بلندی ہمت	سدرے پر بنایا ہے ہم نے آشیاں اپنا
غالب۔	اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعدِ مرگ	ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں
عارف۔	ہے تیری جستجو کا مجھے موت پر بھی شوق	بیساختہ جو ہلتے ہیں اندر کفن کے پاؤں

غالب کا شعر بہت بلند ہے مگر دیکھئے عارف بھی ان کے ساتھ ہی ساتھ چل رہے ہیں۔

غالب۔	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے	میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
عارف۔	کیجئے ہے دل میں عارف عالمِ بالا کی سیر	اب تو کچھ اس خاکداں میں دل بہت گھبرائے ہے
غالب۔	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
عارف	تمہیں کھنچوا کے بلانا ہمیں منظور نہیں	ورنہ یہ جاذبۂ عشق سے کچھ دور نہیں
غالب	دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
عارف	کیونکر رفو کرے گا مرا جیب بخیہ گر	باقی خدا کے فضل سے اک تار بھی نہیں
غالب	دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی	حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
عارف	دامن سے جسم زار جو الجھا تو کیا ہوا	جھٹکو نہ اس طرح سے کہ یہ خار بھی نہیں
غالب	رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
عارف	سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو	ہمنشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو
غالب	جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن	بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
عارف	دھوکے میں آکے باغِ جناں میں چلے گئے	دل میں گمان کوچۂ جاناں کئے ہوئے

غالب — اپنی گلی میں مجھکو نہ کر دفن بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
عارف — پھرتا ہوں ساتھ گھر لئے خانہ بدوش ہوں — جبتک نہ میں ملوں تو مرا کس کو گھر ملے

عارف نے حضرتِ غالب کی بعض غزلوں پر بند بھی لگائے ہیں مثلاً:۔

مدت ہوئی ہے عیش کا ساماں کئے ہوئے — روشن چراغ مہ سے شبستاں کئے ہوئے
مدت ہوئی ہے حجرہ گلستاں کئے ہوئے — مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

عارف میں پاکے بوئے دل آغوشِ اشک سے — بھرتا ہوں جامِ چشم کو سر جوش اشک سے
آتی ہے یہ صدا لبِ خاموشِ اشک سے — غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

دیگر

ساتھ تیرے مجھے نسبت ہی سہی — کچھ نہ کچھ ہووے فضیحت ہی سہی
تجھکو عزلت مجھے ذلت ہی سہی — عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

آپ کو عشق میں کھو ڈالیں گے — رونا آوے گا تو رو ڈالیں گے
آرزو سینے سے دھو ڈالیں گے — ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

حضرت غالب کے رنگ میں کامیابی کے ساتھ شعر کہنا اور غالب جیسے نازک خیال شاعر کی غزلوں پر بند لگانا معمولی کام نہیں مگر اقتباساتِ بالا سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عارف کی تضمینیں بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں ہیں۔

عارف کا نعتیہ کلام

عارف کا دل پاکیزہ جذبات کا ایک بحرِ بیکراں تھا جس سے معرفت و تصوف کے چشمے ہمیشہ ابلتے رہتے تھے۔ ان کا بیشتر کلام حقائق و معرفت سے لبریز بلند تخیل کا حامل اور کثافت سے پاک ہے۔ سرورِ کائنات صحابۂ کبار اہلبیت اطہار اور اولیائے کرام سے ان کو دلی عقیدت تھی ان کا دل مئے حُبِّ نبیؐ سے سرشار تھا۔ سرورِ دوعالم کی شان میں جھوم جھوم کر انھوں نے مدح سرائی کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بیاں میں کیا کروں شانِ محمدؐ | خدا جب ہو ثنا خوانِ محمدؐ
مرے قربان ہوتے ہیں ملائک | ہوا ہوں جب سے قربانِ محمدؐ

قدسی کی مشہور فارسی نعتیہ غزل پر جوشِ عقیدت سے بند لگائے ہیں۔

تری ہمت کے برابر تری عالی نسبی | تو ہے آب و گہرِ ہاشمی و مطّلبی
جبکہ ایسا ہو خدا چاہئے ایسا ہی نبیؐ | مرحبا سید مکّی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

پیکرِ خاک کہاں اور کہاں نورِ خدا | رفعتِ عرش کہاں اور کہاں تحتِ ثریٰ
ہے تفاوت سا تفاوت زکجا تا بکجا | نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از آدمؑ و عالم تو چہ عالی نسبی

کسکی تشخیص میں آوے مرضِ فتنہ دلی | آج تک کوئی دوا درد کی عارف نے نہ کی
ہو سکے تیرے سوا کس سے مری چارہ گری | سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

عارف کا کلام مدح اہلبیت میں

عارف کو سیدنا امام حسینؓ اور شہدائے کربلا سے خاص عقیدت تھی امام مظلومؑ کی شان میں انھوں نے متعدد چیزیں کہی ہیں ایک جگہ امام عالیمقام کی مدح

بطرز سلام کی ہے۔ اس مدح کے لفظ لفظ سے جوش ایمان اور خلوص ٹپکا پڑتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

رتبہ جو ہے مجرئی آلِ عبا کے واسطے
فخر کرتے گریہ ہوتا انبیا کے واسطے

وحدتِ روحانی شبیر و پیغمبر کو دیکھ
ہوگئی گویا شہادت مصطفٰے کیواسطے

شکر للہ ہوں عزاداروں میں اُسکی سرخرو
خون روتا ہوں شہید کربلا کے واسطے

رات دن کھاتا ہوں میں عارف غمِ آلِ نبیؐ
دل مرا معدہ بنا ہے اس غذا کیواسطے

پھر دوسرے سلام میں کہتے ہیں۔

سلام قبلۂ حاجات دو جہاں پر ہے
جہاں کو سجدہ روا جسکے آستاں پر ہے

جزائے صبر جو موقوف امتحاں پر ہے
جفا و جور شہنشاہ انس و جاں پر ہے

مرا ہوں ترے غم میں مرے مقابل آئے
خضر کو ناز اگر عمر جاوداں پر ہے

فرشتے غم میں سہی پر مری طرح عارف
انھیں اُڑانے کو کیا خاک آسماں پر ہے

عارف کا کلام مدح صحابہؓ میں

عارف مرحوم خوش عقیدہ انسان تھے۔ اہلبیت اطہار سے ان کو دلی عقیدت تھی ان کی یہ عقیدت محبت مخلصانہ اور تعصب مذہبی سے پاک تھی۔ امام مظلومؑ کی اس زبردست قربانی کو وہ اس نظر سے دیکھتے تھے جیساکہ ایک اہلِ دل انسان کو دیکھنا چاہیئے لیکن اُن کے اس پاکیزہ جذبے کو جو محض ان کی حساس طبیعت کا جوہر تھا۔ بیوقوف لوگوں نے مذہبی رنگ دینا چاہا۔ عام طور پر خیال کیا جانے لگا کہ حضرت غالب کی معیت نے ان کے تخیل کو تبدیل کردیا ہے۔ اسی عام خیال کے متعلق عارف نے خود جو نیر ومحو سے چشمک ہوجانے پر قطعہ حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا تھا لکھا ہے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط تھا۔ درحقیقت عارف شیعہ نہ تھے۔ ان کے دیوان میں ہم کو اس کی تردید کے لئے کافی مسالہ مل جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں کہتے ہیں۔

ایزد جاں آفریں کو کر کے کہتا ہوں گواہ | گر نہ تیرا عشق ہو تو میں رد سیاہ
لائقِ تختِ خلافت ہے ازل سے تیری ذات | تجھکو ارزانی ہو یہ اے بادشاہِ دیں پناہ
کیا شجاعت کے تری اوصاف ہوں مجھسے رقم | دیکھکر شیرِ خدا کہتے ہیں جسکو واہ واہ
عرشِ منزل جو کہے تجھکو نہ سمجھا تجھکو آہ | روضۂ خیر البشر میں جب ہو تیری خوابگاہ

اگر لوگوں کا کہنا صحیح ہوتا تو عارف مرحوم کے قلم سے اس عقیدت کا اظہار کس طرح ممکن تھا۔ لہذا یہ اُن کی خوش عقیدگی پر ایک بیجا اتہام تھا۔ شاعر عام انسانوں سے الگ ایک بلند نظر ہستی ہے جو ہر اس انسان کے کارناموں کو سراہتی ہے جسکی ذات اہلِ عالم کیلئے سود مند ثابت ہو

عارف کا کلام اپنے پیر طریقت کی شان میں

حضرت مولانا فخر الدین نواب احمد بخشی خاں فخر الدولہ بہادر رئیس جھرکہ فیروز پور و لوہارو کے پیر تھے۔ تمام خاندان کو آپ سے بیعت تھی اور عقیدت تھی۔ عارف مرحوم بھی حضرت اقدس کے مرید با اخلاص تھے اور ان کی شان میں کئی چیزیں لکھی ہیں جس کا کچھ حصہ پیش کرنے کا فخر میں حاصل کر رہی ہوں۔ ایک ترجیع بند میں جوشِ عقیدت سے بیخود ہو کر کہتے ہیں۔

کیا ہی بیاں ہو کس سے مقدورِ فخرِ دیں | ہوتا ہے وہی جو کہ ہو منظورِ فخرِ دیں
خادم کو اُسکے کہتے ہیں مخدومِ خاص و عام | آمر ہے دو جہاں میں ماُمورِ فخرِ دیں
کرتا ہوں عرض رو کے یہ میں ہو کے با ادب | استادہ ہو کے سوئے روضۂ پرنورِ فخرِ دیں
آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند | آیا بود کہ گوشۂ چشمے با کنند

پھر دوسری جگہ اس طرح مدح حضرت میں گلفشانی فرماتے ہیں۔

ہوئی پھر انجمنِ عرس قطبِ ربانی | بہ بست و ہفتم ماہِ جمادی الثانی
رکھے جو آن اس آستاں پہ پیشانی | تو بھول جائے مہ و مہر کی درخشانی
جب اس مقام پہ ہو خوابگاہِ فخرِ دیں | زمیں سے تا بفلک کیوں نہ ہووے نورانی

عارف و معروف	عارف نے اپنے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروف کے جو ایک کہنہ مشق شاعر تھے

اشعار پر بھی بند لگائے ہیں۔ دو بند ملاحظہ کیجیے۔

اس طرح میں تو کبھی نقش بدیوار نہ تھا   دیکھتا سوئے فلک رنج میں سو بار نہ تھا
چشم حیران نہ تھی نالہ شرربار نہ تھا   جب تلک زلف میں دل اُسکی گرفتار نہ تھا
سرِ مو غم سے کبھی مجھکو سروکار نہ تھا

یہ تو مانا کہ وہ بیہوش تھا ہشیار نہ تھا   لیک کچھ اس کو مرض نام کو زنہار نہ تھا
ایک میسّر پہ ترا شربتِ دیدار نہ تھا   تیرے بیمار کو دیکھا تو وہ بیمار نہ تھا
دردِ فرقت کے سوا اور کچھ آزار نہ تھا

حضرتِ عارف نے جراَت کی ایک غزل پر بھی تضمین کی ہے لیکن وہ فنی اعتبار سے کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ پھر جراَت کی عریاں گوئی مشہور ہے۔ اسلیے یہاں اسکا نقل کرنا غیر ضروری اور نامناسب بھی ہے۔

عارف کا فارسی کلام	دیوان میں عارف کا کچھ فارسی کلام بھی ہے جو چند غزلوں پر مشتمل ہے۔ عارف مرحوم کی فارسی شعر کہنے کی قابلیت اردو سے کم نہیں تھی۔ انھوں نے عرفی جیسے فارسی کے بلند پایہ شاعر کی

غزل پر غزل کہی ہے اور اس میں ایک بڑی حد تک وہ کامیاب رہے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اردو سے زیادہ شغف تھا کیونکہ فارسی میں انھوں نے صرف تین غزلیں کہی ہیں ان کے علاوہ چند چیزیں اور ہیں۔ یہ گمان غالب ہے کہ اُن کے فارسی کلام کا بیشتر حصہ غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا ورنہ حضرت غالب کا فیضانِ صحبت اور عارف جیسا خوش فکر یہ کیسے ممکن ہے کہ صرف اِن چیزوں پر ہی اکتفا کرتا۔ ذیل میں اس غزل کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو عارف مرحوم نے عرفی کی غزل پر کہے ہیں۔

امروز نقدِ عیش چرا میدہی زکف   از عقل نیست در غمِ فردا گریستن
محو است در تصورِ حسنِ تو چشمِ من   دیگر چہ کار ماند مرا با گریستن

سر زد بروں ز کلبۂ من سیل اشکِ من | پنہاں نماند راز ز تنہا گریستن
رحم آمدش بہ بے اثریہائے گریہ ام | ضائع نہ گشت درونِ شبہا گریستن
ساقی مگر بخشمِ گلویش فشردہ! | کاغاز کرد شیشۂ صہبا گریستن
رانند سوئے باغِ جناں گرز کوئے دوست | باید بزیر سایۂ طوبیٰ گریستن
منت بود بچشم من از روزنِ درش | زیں راہ کردہ دوست تماشا گریستن

مشہور اردو شعراء کے علاوہ عارفؔ نے فارسی کے نامور شعراء کی غزلوں پر بھی تضمین کی ہے۔ چنانچہ حافظ شیرازی کی غزل ہے "دل سرا پردۂ محبت اوست * دیدہ آیئنہ دار طلعت اوست" عارفؔ نے اس پر بھی اشعار کہے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ان اشعار سے عارفؔ کی جدت پسندی اور شوخیٔ طبع تو ضرور معلوم ہوتی ہے مگر اشعار میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔ پھر فارسی اشعار کے ساتھ اردو کا پیوند یوں بھی کچھ بھلا نہیں لگتا۔

ایک قطعہ میں اپنے عزیز دوست نواب ضیاؔء الدین احمد خاں نیر رخشاں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ طنزیہ چیز ہے۔

ہاں دہاں میرزا ضیاء الدین | ایں پیامم جاں فرستادے
گوئیا بر شکوہِ فرتوت | باز عمر جواں فرستادے
تا بر آیم بیام شکوہِ فراز | آہنی نردباں فرستادے
مرجا مرجا کہ اے عارف | رشک برہمناں فرستادے
چوں شنید غزل دگر بشنو | کہ چو نثرم عیاں فرستادے
نظم نے نثر نے لغاتِ عرب | داستاں داستاں فرستادے
من فرستادہ ام گلِ جنت | تو گلِ گلستاں فرستادے

بحر دکان ہدیہ کردہ ام بر تو — تو متاعِ دکاں فرستادے
من ز طوبیٰ بریدہ ام شاخ — تو عصا خیزراں فرستادے
مغزِ جاں است اینکہ می بینی — تو مرا استخواں فرستادے
بہ تو خندید زادۂ طبعم — کہ من ایں و تو آں فرستادے

فارسی تاریخیں بھی دو ہیں ایک مرزا فخرو فتح الملک بہادر کے منظوم خط کی اور دوسری مولوی کریم الدین کے تذکرے گلستانِ سخن کی پہلی تاریخ ذیل میں درج ہے۔

قلم شاہزادۂ فتح الملک — چوں بجنبید در بیاں یکبار
چوں رگ ابر ماہ نیسانی — سیر اوراق گشت گوہر بار
خطِ منظوم از ورق انگیخت — چوں خط نو خطانِ ماہِ رخسار
سالِ تاریخ ایں خطِ منظوم — عارف از فضل داورِ دادار
سرِ بدخواہ را برید و دگر — از سرِ ناز گفت باغ و بہار

کلامِ عارف کے اس تھوڑے حصے سے جو میں نے پیش کیا ہے نکتہ سنج اصحاب کو واضح ہو جائیگا کہ ان کا تخیل کس قدر بلند تھا۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے انکی بہارِ زندگی اگر قبل از وقت نہ لوٹ لی ہوتی تو یقین تھا کہ مرزا غالب کے صحیح جانشین عارف ہی بن سکتے لیکن اس تھوڑے عرصے میں انھوں نے توسنِ طبع کی جو جولانیاں دکھائیں وہ اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کرنے کیلئے کافی ہیں۔

کاش کہ ان کا وہ کلام مل جاتا جو غدر کی ہنگامہ خیزیوں میں تلف ہو گیا۔ خدا جانے کتنے جواہر پارے اس قیامت خیز تلاطم میں گم ہو گئے جنکا حاصل کرنا اب ممکن نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نواب زین العابدین خاں عارف اپنے معاصرین میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے

مخطوطات عجائب خانۂ بیجاپور کی مختصر فہرست

(ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ڈی لٹ (پیرس) پروفیسر دکن کالج پونہ)

(۳)

۵۳- بیاض - ایک لمبی صورت میں ہے اور اسی کے اندر بعض اہم تاریخی مسودات بھی ہیں جو بالخصوص سلاطین بہمنیہ سے متعلق ہیں اور یہ مطالعہ طلب ہیں اور بعض تحریرات سید غوث گوالیاری پر بھی ہیں اور ایک رباعی یوں الگ ملتی ہے۔

شاہ جہان وقت بر آمدن بر تخت ایں رباعی خوانده اشک ریختہ بر می نشست ؎

فاختہ بر سرِ سرو بلند نعرہ بر آورد کہ اے ہوشمند

دولت گیتی کہ تمنا کنند باکہ وفا کرد کہ با ما کنند

مگر اس میں ۱۲۱۸ھ تک کے بعض واقعات کا اندراج ملتا ہے۔ (م ۶۷)

۵۴- مطلع الانوار امیر خسرو - معمولی سا نسخہ ہے۔ (م ۱۲)

۵۵- بینظیر بدر منیر - (قدیم اردو) یہ ایک اخیر زمانہ کا مصور نمونہ دکنی طرز کا ہے یعنی یہ مشہور نسخہ بینظیر بدر منیر مصور ہے اور بعض جگہ صاف صاف انگریزی مصوری کا اثر بھی واضح ہے (م ۱۲)

کتب تاریخ و قصص

۵۶- تذکرہ دکن - اس نسخہ کے باہر تو اگرچہ متذکرہ بالا نام لکھا ہے مگر اس کے اندر یوں لکھا ہے "ایں کتاب شاہزادہ تسخیر دکن" یعنی ایں کتاب تسخیر دکن شاہزادگان مراد شاہ و دانیال

شاہزادہ است" اس کے ابتدا میں یوں لکھا ہے۔

شاہزادہ مراد تسخیر دکن تعین شد دریں سال راجہ مالدیو شیخ فیضی و حکیم حمام فوت کردند درسال چہل و یکم سنہ ہزار و چہار ملک برار تصرف آمد۔ (م ۶۴)

۵۷۔ اس کے بعد ایک اور سودہ شروع ہوتا ہے۔

۱۲۰۴ھ ہجری۔ درایام کہ چھاؤنی دکن نواب آصف جاہ نظام الملک نظام الدولہ میر نظام علیخاں درسوار دل کشای قلعہ پانگل مقابلہ ٹیپو سلطان باتفاق کمپنی عالیشان انگریز بتصرف انگریز بود ایں شاہد زیبا قبای احتشام دریا بست ایں عروس اعتنا برکرسی اتمام نشست ؎

شکر للہ بانصرام رسید — نسخہ دلپذیر مطبوعہ براتمام آں

سالِ تاریخ ختم مجموعہ بتاریخ دوم ماہ شعبان روز یکشنبہ بوقتِ مغرب ۱۲۴۴ھ ہجری موجب حکم حضرت خواجہ سید محمد حسین صاحب قبلہ مدظلہ العالی کاتب الحروف مرزا بابا صاحب نقل کتاب نمودہ شد۔ (م ۶۴)

۵۸۔ اس کے ساتھ ایک اور مخطوطہ ملحق ہے جو بطرز روزنامچہ ہے مگر بعض تحریرات نے اس کا موضوع جغرافیہ معلوم ہوتا ہے اور زیادہ تر متعلقہ دکن کہیں سے یہ تذکرۃ البلاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ (م ۶۴)

۵۹۔ بساطین السلاطین ۔ یہ نسخہ بالکل معمولی بڑی تقطیع پر ہے اور ۱۳۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے (م ۶۲)

۶۰۔ قصہ بھوج راج وسنگاسن فارسی ۔ اس کے سرسری ایک نظر دیکھنے سے ذیل کے الفاظ اخذ کرکے تاریخی اہمیت کو مدنظر رکھکر درج کئے جاتے ہیں۔

امیر الممالک آصف الدولہ صلابت جنگ بہادر بندگان حضرت —— راقم ایں افسانۂ دلاویز از قوم کھتریان دہوسہ سیالکوٹی ۔ موسوم بہ نانک رام پسر گوبند رام ابن گوپال رام بنیرہ

جادورائے اسد خانیست کہ بزرگانِ احقر در عہد حضرت خلد مکان بادشاہ عالمگیر بدیوانی اسد خاں بہادر جلیۃ الملک وزیر الملک سرفراز بودہ و ـــــ نصیحت ہائے رنگین ـــــ حلاوت و ظفر رای موہن لعل بہادر خلف الصدق راجہ بالکشن بہادر کہ از ابا و اجداد بعلاقہ چودھرای بلدہ فرخندہ بنیاد سرفراز ـــــ موضع ہیم برتی من مضافات سرکار بھونگیر شرف اقامت دارند (م ۵۴)

۶۱۔ قصہ بھوج راج فارسی ۔ سبب تالیف :۔ امیر الملک آصف الدولہ صلابت جنگ بہادر بندگان حضرت راقم افسانہ دلاویزے یکے از قوم کھتریان دہوسہ سیالکوٹی موسوم بہ نانک رام پسر گوبند رام ابن گوپالرام نبیرہ جادورای اسد خانست کہ بزرگانِ احقر در عہد حضرت خلد مکان بادشاہ عالمگیر بدیوانی مان اسد خان بہادر جلیۃ الملک وزیر الملک سرفراز بودہ ـــــ نصیحت ہا رنگین ـــــ حلاوت و ظفر رای موہن لعل بہادر خلف الصدق راجہ بالکشن بہادر کہ از ابا و اجداد بعلاقہ چودھرای بلدۂ فرخندہ بنیاد سرفراز ـــــ موضع ہیم برتی من مضافات سرکار شیونگر شرف اقامت دارند۔ (م ۵۴)

۶۲۔ کتاب محمد اکبر بادشاہ غازی۔ مگر بغور دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل منتخب التواریخ بدیوانی کا وہ حصہ ہے جس میں علما و شعرار کے حالات ہیں۔ (م ۶۳)

۶۳۔ محمد نامہ ظہور ابن ظہوری۔ یہ دراصل ایک معاصر تاریخ سلطان محمد عادل شاہ غازی کی ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی۔ اس کی ابتدار بسم اللہ کے بعد یوں ہوتی ہے۔

سلطان سریر دلہا یگانہ بے ہمتائی است کہ تاج نبوت الخ

مقدمہ کو نہایت عمدہ مرصع عبارات اور اشعار سے مزین کیا ہے۔ اور خاصہ طویل ہے اور اس کے اخیر میں اس طرح مصنف کہتا ہے . . . تلاش تعریف و توصیف ایں شہنشاہ محمدی صفات نمودن ”سر پر دکن“ نمود۔ فتح بیک حملہ حملہ کرنانک . . . حق سبحانہٗ و تعالیٰ چوں

روزِ نخستین . . . سلطان محمد عادل شاہ غازی را برا رندہ شکوہ بے نیازی گردانید۔ اس محمد نامہ کو اس نے نواب محمد مصطفےٰ المخاطب بخطاب خان باباؒ کے فرمانے پر لکھا۔

اول۔ آغاز تواریخ حضرت بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ یعنی محمدؐ بادشاہ غازی ابن ابراہیم عادل شاہ ولادت بادشاہ جو ذیقعدہ بشب یکشنبہ ۱۰۲۲ھ ہزار و بست و دو ہجری کو ہوئی۔ جلوس بادشاہ محمد عادل شاہ۔ شورش انگریزی نظام شاہ بحری اور اس کا سدباب۔ برہم خوردن لشکر نظام شاہ۔

برآفراشتن لوائے مخالفت کدم راؤ نایکواری در قلعہ بنکاپور و قید کردن پسر میر علی رضا۔

جلوس فرمودن حضرت خدایگانی برادرنگ دا ما دی بتاریخ ہیزدہم رجب ۱۰۳۸ھ

درنگ نمودن در ابلاغ قطب شاہ و باز سر بسجود آوردن و تعریف عرس شاہ فردوس بارگاہ۔ یہ ۱۰۴۲ھ حوالی زہرہ پور میں واقع ہوا۔ جہاں کی عمارات کی تعریف کی گئی ہے۔ ذکر بجہنم شتافتن نظام شاہ و رسیدن امرائی شاہجہاں آباد بر شہر محمد پور۔

فتح نامہ داد صاف بادشاہ غازی۔

آمدن سردارے معہ توپ میران از قلعہ پرینڈہ بحضور اور چند اشعار در مدح توپ۔

رونق افزا شدن خدیو گیہان بار دیگر و بزم عروسی آراستن۔ ذکر کتخدا شدن ہمشیرہ عبداللہ قطب شاہ حضرت گیہان خدیو برآشفتہ شدن شاہجہاں از ہزیمت آصف خاں در دادنہ کردن مہابت خاں بدکن۔ . . برافراختن لوای مخالفت مہابت خاں بہ سبب پیدا شدن نظام شاہ دیگر۔

ذکر سلطنت فردوس آرامگاہ و تمہید واقعہ آنحضرت و نشستن بر تخت۔

وفات پادشاہ فردوس بارگاہ پدر محمد شاہ غازی ۱۰۲۷ھ۔

ذکر بانوی حشمت پیرای شاہنشاہی خاتون خاندان رسالت پناہی تاج المخدرات۔

تاریخ وفات تاج سلطانہ ۱۰۴۳ھ بعد نخوت در دماغ خواص خاں پیچیدن و قید شدن نواب خان بابا از دست خواصخاں و بازگشتہ شدن خواصخاں بایمار بادشاہ۔

شکست خوردن شاہ جہاں از قلعہ پرینڈہ واز یں سبب رسیدن شاہجہاں بدولت آباد بارادۂ فاسدہ و باز برگشتن بملک خود۔

جلوس فرمودن حضرت خدیو گیہان بر تخت دامادی با اختر برج نواب خاں بابا کہ تاج جہاں بیگم۔ بجہت حاصل کردن بادشاہ غازی از طواف روضہ حضرت سید محمد حسین گیسو دراز۔

اشعار قصیدہ روضہ۔ . . . روانہ کردن حضرت بادشاہ غازی رندولہ را بر قلعہ سکہری شاہجہانی در بند دیگراں۔ رندولہ کو خطاب رستم زماں دیا گیا۔ باز روانہ شدن رستم زماں برائے تسخیر ولایت کرناٹک و مالابار۔ ذکر فتحیاب شدن رستم زماں بر قلعہ سیری بمیامن اقبال بادشاہ؟ باز باغی شدن کینگ نایک و تعین شدن رستم زماں۔ برافراختن لوای مخالفت جکنا بکن بیلی و تعین شدن فوج۔ جس معرکہ میں رستم زماں اور فضل خاں دونوں نے بہادری دکھائی۔ بعد فتح قلعہ بیلور خاں ظفر قرین افضل خاں بقلعہ تمکور روانہ شدن۔ خان ظفر نشستن قرین رستم زماں بعد فتح قلعہ سیرہ بقلعہ پیلکوشتافت۔

تعمیر شدن بادشاہ پور باہتمام خان ظفر قرین خانخانان۔ اقوال نشستن شاہزادہ علی در مکتب بنا بر تحصیل علم ظاہر ۱۰۵۶ھ۔ تیار شدن عمارت بادشاہ پور بموجب حکم والا۔ حضرت خدیو گیہاں بنا بر مصلحت نواب خان بابا را قید نمودن و باز خلاص کردن۔ آراستن بزم جشن ختنہ شاہزادہ و نواختن عالم۔ رخصت فرمودن حضرت خدیو گیہان خان نصرت قرین مظفر الدین خانخاناں را بر تسخیر کرناٹک و مالبار۔ نہضت فرمودن حضرت خدیو گیہان بارادۂ عرس حضرت سید حسین گیسو دراز نور اللہ مرقدہٗ۔ قصیدہ در تعریف عرس حضرت شاہباز۔

سعادت بادشاہ بمحمد پور و رسیدن نوید افتتاح قلاع بر تردد خانخاناں۔
تمہید قضیہ گذشتہ خواص خاں و رسیدن شاہجہاں بدولت آباد غوری او و ذکر تسخیر دکن
از تردد اسلامیاں۔۔ مقدمہ دیگر نظم

زہی شاہنشاہِ غازی کہ افلاک	بود از راہِ او یکمشت خاشاک
چو گرد د ابر جود او گہر ریز	شود گوہر بحر لبریز
جہاں بختی کہ مہر از حسن رائش	سرِ خود کردہ وقفِ خاکپائش
صفات او نمی گنجد در اوہام	کہ قائم گشت ازو بنیادِ اسلام
چو خورشید شرف زیں نامہ در تافت	محمد نامہ نام از شاہ دیں یافت
زند حِ شاہِ غازی کامرانم	کہ در ملکِ سخن صاحب سرانم
بنائے دولت و اقبال سرمد	بود تا قائم از دینِ محمد
نور نبی از روئے شہ باد	فلک را خاک راہش سجدہ گہ باد

ذکر آراستگی ایں نثر بوسیلہ نواب خان باباحسب الحکم بادشاہ جہان ستان۔

نظم

چو گیرم بکف کلک گوہر نگار	شود صفحہ دلکش چو رخسارۂ یار
منم آں سخن سنج عالی بیاں	کہ بر درگہ فکرم از قدر وشاں
در آیند صف بستہ ہر صبح و شام	مضامین نایاب بہرِ سلام
چو طبعم ز معنی شود بہرہ یاب	کنم ذرہ را روکش آفتاب

چنانچہ اس کے بعد مصنف ظہور خود کہتا ہے کہ سخنوری اور نکتہ پروری کا سبب یہ ہے کہ نظم و نثر میں اس کتاب کو آراستہ کیا جس کا نام محمد نامہ ہے اور عالم میں مشہور ہو گئی۔ اور ماحصل

یکہ بادشاہ نے خود خواہش ظاہر فرمائی کہ ابتدا سے لیکر اخیر تک اس کے عہد کے حالات کو قلمبند کیا جائے تاکہ اہلِ علم اس سے بہرہ مند ہوں۔ جسے مصنف نے ۱۰۵۱ھ میں نواب مملکت مدار بابا خان کے فرمانے پر شروع کیا یہ وہ سال ہے جب کہ شہر کی بنا اور عالی عمارات کی تعمیر شروع ہوئی اور مجھے خود نواب صاحب نے طلب کر کے تاریخ احوالات سلاطین دکن جسے رفیع الدین حسین شیرازی نے قلمبند کیا مجھے عطا کی اور کہا کہ اسی نہج پر تحریر کروں۔ پھر مصنف یہ بھی کہتا ہے کہ میں نے حالات میں اکبر نامہ ابوالفضل سے بھی استفادہ کیا اور اپنی کتاب محمد نامہ کو یوں بیان کیا ہے ؎ قطعہ

نوازش شہ غازی چو رتبہ ام افزود	گذشت پایہ قدم زاو جگاہِ علیین
گرفت عرش بریں چار رتبہ سخنم	بروی خاتمہ اندیشہ بر مثال نگین

اس کے بعد دیگر ابوابِ کتاب شروع ہوتے ہیں۔

ارادۂ نصرتِ انتظام نواب مصطفےٰ خان بنوازش خسروانہ بنا بر تسخیر کرناٹک ملبار بموجب حکم۔ جو ۱۰۵۶ھ کو ہوا۔ اور شہر محمد پور سے روانگی۔ حوالی شہر ابراہیم پور میں آکر ٹھیرنا پھر باگر کوندیں برائے تاخت قلعہ نکتی بلسری دریائے کے کنارے پہنچنا۔ پھر متوجہ کرناٹک ہونا اور حوالی کرک لکیری پہنچکر کنارِ نہر پر قیام کرنا۔ وہاں سے نکلکر مقام بنی ملی پہنچنا پھر وہاں سے نکلکر ان لوگوں سے ملاقات کرنا جن کو اس فتح کے لئے ارسال کیا ہوا تھا اور ان میں شاہ جی راجہ بھی تھا اور سپوٹ ناٹک زمیندار ولایت ملبار چار رمضان کو خود نواب نامدار کی ملازمت میں آیا اور اس نے برائے مہم کرناٹک ہزار سوار اور دو ہزار پیادہ ہمراہ کئے اور سرحد پر مقابل ولایت راجہ سرنگ پٹن بیاسی ہزار پیادہ و دو ہزار سوار سے مقیم ہوگیا دوسری منزل میں راؤ ناٹک راجہ ہرحن ھلی دو ہزار پیادہ اور تین ہزار سوار لیکر پہنچا۔ وہاں سے نواب بابا خان نے منزل بمنزل کوچ کیا اور حوالی سکری پٹن میں آکر مقام کیا۔ وہاں سے تمام افواج کو ایک کیا جس میں خان عالیشان حشمی عنبر خان۔ جھجار راؤ۔ اباجی کہانتکہ اور کینگ نایک کا بھائی شامل تھے۔ اسی طرح

دلپائی لکمیسر دس ہزار پیادہ اور ایک سو سوار سے۔ دلسپائی گوپل دس ہزار پیادہ اور دو صد سوار سے محمد نگر کی سمت پر تعین ہوئے۔ غرضکہ بیشمار تیاریوں اور تکالیف کے بعد فتح حاصل ہوئی جس کی مزید طویل تفصیل دی ہے۔ اسکے بعد فتح قلعہ کش درگ کے متعلق نواب مصطفےٰ خاں کا بیان دیا ہے۔ بیان فتح قلعہ کیری فتح قلعہ انبور سر فتح قلعہ رائے درگ۔ قطب شاہ کی تنبیہ کے لئے نواب نامدار کا ارسال کرنا۔ قصیدہ در فتح نامہ قلعہ جیجی اس کے بعد افضل خاں معہ ساز و سامان پہنچا اور شاہ جی راجہ کو پابزنجیر بوجہ فتنہ فساد ارسال کرنا۔

غرضکہ یہ نسخہ "تواریخ محمدی" موسوم بہ محمد نامہ مقالہ شاہ سکندر بارگاہ محمد شاہ بن ابراہیم عادل شاہ فرمانروائے دکن" تصنیف مولانا محمد ظہور پسر مولوی ظہوری (م ۶۱)

۶۴- تاریخی واقعات- یہ مخطوطہ دراصل تاریخ وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ اور اس کے آخیر میں یوں مذکور ہے۔

"چند تاریخ ہائے چیدہ نوشتہ شد از کتاب شاہد صادق عزیزی سید مہر بن سید نو نوشتہ بود فقیر حقیر محمد نجم الدین۔ نقل آں بستم شہر جمادی الثانی ۱۱۶۵ھ نمود شد۔ (م ۷۱)

۶۵- تاریخی کاغذات:- اس مخطوطہ پر کوئی خاص نشان نہیں دیا گیا مگر بغور دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مشہور نسخہ منشارت چندر بھان برہمن ہے۔ جو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور ۱۱۷۳ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (م ۶۸)

۶۶- تذکرہ سرخوش- یہ مشہور تذکرۃ الشعراء ۱۱۶۷ھ کا لکھا ہوا ہے اور بالکل مکمل ہے یہ تذکرہ عہد عالمگیر اورنگ زیب کی یادگار ہے۔ مگر اس مخطوطہ کے باہر جو کتاب کا نام لکھا ہے وہ تاریخ افضل خانی ہے جو ضرور گمراہ کن ہے۔ (م ۶۹)

اس مخطوطہ کے ساتھ ایک اور مخطوطہ ذیل ہے۔

۶۷۔ مبدا و معاد۔ اس کے مقدمہ کی ابتدا یہ ہے۔

الحمد للہ رب العالمین ـــــ اما بعد چنیں گوید اضعف ضعفا و خادم فقرا عزیزی محمد النسفی کہ حمایت درویشاں کثرہم السرازیں. بیچارہ درخواست کردند کہ در معرفت عالم کبیر و عالم صغیر الخ (م ۶۹)

۶۸۔ قدیم داستان امیر حمزہ۔ اس مخطوطہ کے ابتدا میں رسالہ قوسیہ تصنیف حضرت شاہ عبدالرحمٰن ولد شاہ صالح عرب قدس سرہٗ العزیز ہے۔

اس کے بعد قصہ امیر حمزہ شروع ہوتا ہے مگر بہ "داستان دراصل پنجم ولست اور دن امیرالمومنین" ہے۔ اور اس کے آخر میں یوں لکھا ہے۔ تمت تمام شد قصہ امیر المومنین حمزہ رضی اللہ عنہ"

اس کے ساتھ ایک اور نسخہ "تذکرۃ الحلاوت یعنی شکرستانِ خیال" ہے۔ اس کے آخر میں "میر عبدالواحد ذوقی مصنف" رسالہ شکرستانِ خیال" لکھا ہے اور تاریخ ۱۱۴۲ھ ہے۔" در عہد خلیفہ الرحمٰن ظل سبحانی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۲ سنہ جلوسی" (م ۵۳)

۶۹۔ تذکرۃ الاولیاء۔ یعنی اقتباس الانوار۔ اس کی ابتدا یوں ہے۔

الحمد للہ الذی ـــــ اما بعد میگوید ذرۂ بمیقدار محمد اکرام ابن محمد علی الراسوی موطنا و مسکنا الحنفی مذہبا و نسبا القدوی طریقا و ملکا ایں کتابے است در بیان احوال حالات خاتم النبیین وائمہ معصومین و خلفا راشدین و پیشوایان دین و اولیا متقدمین و متاخرین بر ترتیب شجرہ چشتیہ ایں کاتب حروف کہ باستدعا بعضے مقبولاں ایں خاندان کہ مسمی بحافظ فتح محمد سرہندی۔ امیر محمد جعفر و شیخ یار محمد و حافظ امان اللہ دہلوی است . . . . . چوں ایں کتاب مقتبس بود از کتب متداولہ متقدمان و متاخران" بقوت انوار فکر و خیراست باطنی و بہرا اقتباس الانوار نام نہادہ شد (م ۱۳)

۷۰۔ مناقب علی مرتضی کرم اللہ وجہہٗ۔ یہ مخطوطہ دراصل مطالعہ پر معلوم ہوا کہ یہ

کلیات مرزا معز المخاطب بموسوی خاں المتخلص بمعروف فطرت موسوی ہے۔ دیباچہ ا۔
قصیدہ شمس المناقب در منقبت مظہر العجائب اسد اللہ الغالب امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام
یہ قصیدہ خاصہ طویل کئی صفحات پر ہے۔ اس کے بعد غزلیات ہیں جو کئی صفحات پر ہیں۔ آخر میں
روز جمعہ شانزدہ شہر ذی قعدہ (م ۶۵)

۷۱۔ نقل روزنامچہ وقائع۔ گلکندہ عرف حیدر آباد۔ انشا مرزا محمد مخاطب بنعمت خاں
المتخلص بعالی۔ یازدہم رجب ۱۰۳۰ھ۔ ادرنگ زیب عالمگیر۔ اخیر۔ بعرض میر ساند۔ قلعہ جنجی مفتوح
شد . . . حدادا آفتاب خلافت سادہ پائندہ باد۔ (م ۶۵)

متفرقات

۷۲۔ نصاب الصبیان۔ یہ دراصل مشہور رسالہ امام ابونصر الفراہی کا ہے۔ اس کی
ابتدا یوں ہے — الحمد للہ . . . قال الشیخ الامام . . . ابونصر محمد الفراہی . .
. . . ان را نصاب الصبیان نام نہادم۔

یہ موجودہ نسخہ ۱۱۳۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ معمولی خط ہے کاتب کا نام یحیی محمد ولد شیخ
نور محمد ابن شیخ احمد قادری ہے۔ (م ۵۵)

۷۳۔ کفایتہ مجاهدیہ۔ اس کے مقدمہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم الطب
میں ہے۔ اس کا مصنف منصور بن محمد بن احمد بن یوسف نقیہ ہے اور دیباچہ سے یہ بھی معلوم
ہوتا ہے کہ یہ علاؤ الدین خلجی کو معنون کی گئی ہے۔

"آنرا مزین گردانید بالقاب ہمایوں حضرت اسکندر ثانی واضع اساس جہانبانی حامی قوانین
ملک وملت الخ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہی اسکندر ثانی سے مراد سلطان زین العابدین ہے جیسا کہ بعض نے

اس طرح بیان کیا ہے۔ افسوس کہ اس کے مقدمہ کے الفاظ میں علاؤ الدین خلجی کا اصل نام محمد شاہ نہیں ملتا۔ (م ۵۸)

۷۴۔ یہ چند اوراق غایتہ تہذیب الکلام سے متعلق ہیں۔ (م ۴۷)

۷۵۔ فلسفہ۔ نام کتاب کچھ مبہم سا ہے مگر علم فلسفہ میں معلوم ہوتی ہے کیونکہ شیخ شہاب الدین سہروردی کا نام ملتا ہے۔ اور خاصی ضخیم ہے۔ اس پر مفتی شرع متین۔ سید سعد الدین کی ایک مہر ۱۲۱۱ھ کی ہے۔ مگر اس پر تحریر جو ہے اس سے معلوم ہوتا ہے "من مملکات احقر الدین سعد الدین مشوانی مدرس و مفتی حیدر آباد" ایک اور مہر ہے جس میں خالی سامان لکھا ہے۔ (م ۵۹)

۷۶۔ انشاء خلیفہ۔ مگر غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل کارستان منیر کا نسخہ ہے جیسا کہ اس کے اخیر میں یوں لکھا ہوا ہے۔ "کتاب کارستان منیر بتاریخ ۲۷ محرم الحرام ۱۲۴۷ھ" (م ۵۶)

تلخیص و ترجمہ

بین الاقوامی مدوجزر

معاہدہ ورسائی جنوری ۱۹۱۹ء سے آغاز جنگ ستمبر ۱۹۳۹ء تک

موجودہ جنگ کے صحیح اسباب، اس کا نشیب و فراز اور اس کے مستقبل پر غور کرنے کیلئے ناگزیر ہے کہ قوموں کے ان حالات کا جائزہ لیا جائے جو اختتام جنگ (نومبر ۱۹۱۸ء) سے آغاز جنگ (ستمبر ۱۹۳۹ء) تک ان میں رونما ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں انھیں حالات پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔

۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء میں ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ ختم ہوئی اس میں اتحادیوں کو کامیابی ہوئی اور جرمنی آسٹریلیا، ہنگری، اور ان کے ساتھی ترکی اور بلغاریہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جنوری ۱۹۱۹ء میں ورسائی (Versailles) کے اندر ایک بین الاقوامی معاہدہ ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کے اندر ایک جدید نظام قائم کیا جائے۔ جون ۱۹۲۰ء سے اس پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا گیا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں اور ہنگری کے مابین ایک اور خصوصی معاہدہ (تریانون) ہوا۔ اس کا مقصد ہنگری کے حدود مملکت کی تجدید اور جنگ سے پیدا شدہ مسائل کی تنظیم قرار دیا گیا۔ ایک معاہدہ "سیورے" اگست ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں اور ترکوں کے درمیان ہوا۔ اس کا مطمح نظر یہ تھا کہ قدیم سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کر لئے جائیں۔

سان ریمو کانفرنس ۱۹ر اپریل ۱۹۲۰ء میں انگلستان، فرانس، اور اٹلی کے وزرائے اعظم کی ایک کانفرنس سان ریمو کے اندر منعقد ہوئی۔ اس میں جرمنی کو نہتا کرنے کی تجویز پر غور و خوض کیا گیا اور اس کے ماسوا انتداب کے مسئلہ پر نہ صرف بحث کی گئی بلکہ فرانس کا شام پر اور انگلستان کا عراق و فلسطین پر انتدابی

حق تسلیم بھی کرلیا گیا۔

یونان وترکی کی جنگ اور ترکی میں جمہوریت کا قیام

۱۹۲۰ء میں ترکوں اور یونانیوں کی جنگ چھڑ گئی یونانیوں نے اناطولیہ کے شہروں میں گھسنے کا ارادہ کیا۔ ان کا مقابلہ انقرہ کی قومی انجمن کی فوج نے کیا۔ اور دو سال کے چند معرکوں کے بعد یونانیوں کو شکست ہوئی اور انھیں ترکی حدود سے باہر نکال دیا گیا۔ اس کامیابی کے بعد ترکوں نے معاہدۂ سیورے کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور اس کا اعلان بھی کردیا، یہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا کہ اس معاہدہ کو زبردستی اتحادیوں نے ترکوں کے سر تھوپا تھا۔ نومبر ۱۹۲۲ء میں اتحادیوں اور ترکوں کی ایک کانفرنس "لوزان" میں منعقد ہوئی اور ۲۴ر جنوری ۱۹۲۳ء کو دونوں میں وہاں ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ لوزان کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اتحادیوں نے ترکی کی موجودہ حدودِ سلطنت کو تسلیم کیا اور ترکی کو شام، عراق اور بلادِ عرب سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یکم نومبر ۱۹۲۲ء میں انقرہ کی جمعیت وطنیہ نے سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ کردیا اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جمہوریہ ترکیہ کے قیام کا اعلان کردیا گیا پھر ۳ مارچ ۱۹۲۴ء میں خلافت کے لاشہ کو بھی دفن کردیا گیا۔

اٹلی میں فاشزم کا قیام

۱۹۱۹ء میں مسولینی نے فاشسٹ پارٹی قائم کی اور نومبر ۱۹۲۱ء میں اسے ایک سیاسی جماعت کی حیثیت دیدی۔ اس نے نہایت سرعت کے ساتھ ترقی اور استحکام حاصل کرلیا۔ اگست ۱۹۲۹ء میں فاشستی پارٹی کا لیڈر مسولینی اطالیہ کے وزیر اعظم سینور فاکٹ کے پاس گیا اور اس سے تحکمانہ لب ولہجہ میں کہا "یا تو اطالیہ کی پارلیمنٹ کا کوئی حل سوچو یا وزارت سے استعفا دیدو" وزارت نے اس کی دھمکی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ لیکن مسولینی برابر اپنی پارٹی کی قوت کو روما پر دھاوا بول دینے کے خیال سے بڑھاتا رہا۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۲ء کو فاشسٹ پارٹی مسلح ہوکر روما پہنچی تو شہنشاہ روما ڈر گیا اور اس نے مسولینی سے نہ صرف یہ درخواست کی کہ "ابھی تم اپنی وزارت بنالو" بلکہ زمامِ اقتدار تک اس کے سپرد کردی۔ اسوقت سے اب تک اطالیہ کی قسمت اس کے ہاتھ میں ہے۔

جرمنی میں جمہوریت کا قیام

جنگ عظیم ۱۹۱۸ء میں جرمنی کی شکست اور قیصر جرمنی کی معزولی کے بعد فروری ۱۹۱۹ء میں وطنی انجمن ویمر میں جمع ہوئی اور جرمنی میں جمہوریت کا قیام تجویز کیا اور اس کیلئے ایک دستور بھی بنایا جو دستورِ ویمر کے نام سے مشہور ہے۔ صدر جمہوریت کے لئے ہر ایبرٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی جگہ مارشل ہنڈنبرگ مقرر ہوئے نظام جمہوری جنوری ۱۹۳۳ء تک قائم رہا۔ ۱۹۳۴ء میں ہنڈنبرگ کا انتقال ہوگیا

جنوری ۱۹۳۰ء میں فرانس اور بلجیم کی فوجوں نے دریائے رور کے جرمنی علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ الزام یہ تھا کہ معاہدۂ ورسا کے روسے جو قسطیں تاوانِ جنگ کی جرمنی پر واجب تھیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی۔ ان فوجوں نے اس علاقہ کے غلّے اور صنعتی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہا لیکن جرمنوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ رور کا معاملہ ۱۹۲۵ء تک جاری رہا پھر جدید معاہدہ کے ذریعہ اس کا تصفیہ ہوگیا۔

مجلس اقوام اور بے اسلحگی کی تجویز

یکم جنوری ۱۹۲۰ء میں مجلسِ اقوام نے جنم لیا۔ اس کا خاکہ تو معاہدۂ ورسا کے وقت ہی بنا لیا گیا تھا۔ اس کے ترکیبی عناصر میں ۲۸ اتحادی اور ۱۴ غیر جانبدار سلطنتیں شامل تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ دنیا کی خود مختار حکومتوں کی بڑی تعداد اس میں شامل ہوگئی۔ اور سب نے اہم بین الاقوامی دشواریوں کو حل کرنے کیلئے اشتراک عمل کیا۔ چنانچہ اٹلی اور یونان کی گتھی سلجھانے کی کوشش کی جو ایپرس کے اندر اطالوی وفد کے قتل کردینے اور اٹلی کے جزیرہ کارفو پر قبضہ کر لینے سے پیدا ہوگئی تھی۔ (۱۹۲۳ء) انگلستان اور ترکی کے درمیان موصل کے قضیہ کا تصفیہ (۲۶-۱۹۲۵ء) یہ مجلس اقوام کے اہم کارنامے خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن مجلسِ اقوام کی پوری توجہ تخفیف اسلحہ کی تجویز کی طرف مرکوز رہی۔ اس کی کوشش تو اس نے اپنے جنم دن سے ہی کر رکھی تھی لیکن ۱۹۲۴ء میں تو ہیروٹو کول جنیف . . . . نے اپنی تقریر کے دوران میں خصوصی حالات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی صورتوں میں جنگ کے عدم جواز کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۲۴ء میں امریکہ نے تخفیف اسلحہ کے لئے ایک فارمولا بنایا۔ ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام کے

نمایاں اراکین سے ایک سب کمیٹی تشکیل کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ انجمن کی اس تجویز میں خصوصی طور سے حصہ لے اور اس کا ہاتھ بٹائے۔ ۱۹۳۰ء میں بڑی بڑی حکومتوں کی ایک کانفرنس اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کیلئے لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کے بعد بھی اس کی کوشش برابر جاری رہی۔ اور ۱۹۳۳ء تک مختلف کانفرنسوں میں اس کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر بحثیں ہوتی رہیں۔ لیکن یہ کوشش زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ وجہ یہ تھی کہ بڑی بڑی حکومتوں کے خیالات میں اس مسئلہ میں شدید اختلاف تھا۔

معاہدۂ لوکارنو یہ معاہدہ ۱۶ ار نومبر ۱۹۲۵ء کو فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، اور بلجیم کے درمیان لوکارنو کے مقام پر ہوا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے طے یہ پایا تھا کہ معاہدۂ وارسا کے مطابق جرمنی، فرانس اور بلجیم کے لئے جو سرحدیں متعین ہو چکی ہیں اس معاہدہ کے بموجب اب نہ تو ان میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے اور نہ ان میں کوئی کسی اپنے حلیف پر حملہ کر سکتا ہے۔ اور اگر جرمنی، بلجیم، فرانس، پولینڈ اور چیکوسلاویہ کے درمیان کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو، تو سب مل کر اس کا تصفیہ کرا دیں۔ اور اس کی پوری طرح سے وضاحت کر دی گئی تھی کہ اگر ان دستخط کنندہ حکومتوں میں کسی قسم کے اختلافات پیدا ہوں تو سب سے پہلے باہمی مفاہمت کے ذریعہ انھیں دور کرنے کی جدوجہد لازمی تصور کی جائیگی۔

اس معاہدہ کے بعد ستمبر ۱۹۲۶ء میں جرمنی بھی مجلس اقوام میں شریک ہو گیا اور اس کی کرسی ہمیشہ اس میں رزرو ڈرہی،

معاہدۂ کیلوگ اگست ۱۹۲۸ء میں ایک میثاق ہوا جس کا مطمح نظر یہ تھا کہ جنگ کو مردار چیز سمجھکر اس سے کراہیت کی جائے یہ میثاق امریکہ کے وزیر خارجہ کیلاگ کی جدوجہد کا ثمرہ تھا اسی لئے اسے معاہدہ کیلاگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس میں صراحت کر دی گئی تھی کہ اب آئندہ سلطنت کے جھگڑوں کو ختم کرنے اور قومی سیاست کی بقا کی آڑ لیکر جنگ کرنے کو جائز نہیں خیال جائیگا، اس میں تمام بڑی

بڑی حکومتیں اور خود مختار حکومتوں کی ایک خاص تعداد شامل تھی۔ مصر بھی اس سے علیحدہ نہیں تھا۔

معاہدۂ لاٹران ۱۱ر فروری ۱۹۲۹ء میں حکومت اٹلی اور پاپائے روم کے درمیان معاہدہ لاٹران ہوا، اس میں حکومت اٹلی نے پوپ کی سیادت فاٹیکان (پوپ کے رہنے کے محل کا نام) پر تسلیم کرلی۔ اس طرح سے کلیسا، اور حکومتِ اٹلی کے تعلقات پھر قائم ہوگئے اور باہمی نزاع جو مدت سے چلا آتا تھا ختم ہوگیا۔

ہندوستان کا مسئلہ اور گول میز کانفرنس ۱۹۲۹ء میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک نے زور پکڑ لیا تھا۔ اس نازک صورتِ حالات کے بعد جو گاندھی جی کی دعوت پر ترکِ موالات کی تحریک سے پیدا ہوئی تھی۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں ایک گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے لئے ایک جدید آئین پارلیمنٹ کی زیر ہدایات مرتب کیا جائے۔ اس غرض کے لئے پارلیمنٹ کی طرف سے نمایندوں کو دعوت دی گئی تھی، گاندھی جی بھی دوسری گول میز کانفرنس میں جو آخر ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی تھی، گئے تھے لیکن ان کا یہ سفر ناکام رہا اور کوئی مفاہمت نہ ہوسکی، وجہ یہ تھی کہ مسلمان اور ہندو نمایندوں میں ریاستہائے ہند اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے مسئلہ پر شدید اختلاف تھا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت برطانیہ نے خود چند آئینی اصلاحات نافذ کردیں جن کی پارلیمنٹ نے سفارش کی تھی۔

چین وجاپان چین میں طویل خانہ جنگیاں جو مدت سے چلی آرہی تھیں ۱۹۲۸ء میں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ نانکین میں وطنی مرکزی حکومت قائم ہوگئی۔ اور شاہی دفاتر کی بڑی تعداد اس کے زیر نگیں ہوگئی، اور جاپان مدت سے چین میں اپنی سیادت وسیع کرنے کی فکر میں تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں منچوریا پر یورش کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔ پھر چند شمالی ملکوں پر تسلط قائم کرلیا۔ ان واقعات سے قومی حکومت کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور اس وقت سے چین وجاپان کا نزاع بڑھتا ہی گیا۔ ۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں وسطی چین پر جاپان نے حملہ کردیا اور شنگھائی کی سرحد پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت سے لیکر آج تک چین وجاپان میں شدید جنگ ہوتی رہی ہے اور جاپان نے چین کے تمام ساحلوں پر اور بہت سے داخلی ممالک پر

تسلط قائم کرلیا ہے، اس کے باوجود وطنی طاقتیں اجنبی حملہ کی روک تھام مارشل چیانگ کائی شک کی قیادت میں برابر کررہی ہیں۔

حبشہ پر اٹلی کا قبضہ ۱۹۳۵ء کے موسم خریف میں حبشہ سے تمام کئے ہوئے وعدے وعید بالائے طاق رکھدیئے گئے اور اٹلی کی فوجوں نے جوار ٹیریا پر جمع تھیں حبشہ پر چڑھائی کردی۔ چندماہ یہ جنگ جاری رہی، مارچ ۱۹۳۶ء میں اطالیہ کی فوجوں نے زہریلی گیس کا استعمال کیا اور اس طرح حبشہ کی قوتوں کو پاش پاش کرکے ادیس ابابا میں داخل ہوگئیں اور حبشہ کے ممالک پر یکے بعد دیگرے قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد اطالیہ میں حبشہ کے الحاق کا اعلان کردیا گیا۔

اسپین کی خانہ جنگیاں جولائی ۱۹۳۶ء میں اسپین کے اندر خانہ جنگی شروع ہوئی اور جنرل فرانکو ارض جزیرہ میں باغی قوتوں کے ساتھ فروکش ہوا، کچھ اطالیہ کی طاقتوں نے بھی اس کو مدد دی، اس کے بعد جنگ کا دامن بڑی سرعت سے پھیلتا گیا۔ جنرل فرانکو کو اطالیہ اور جرمنی سے بہت زیادہ سامان رسد پہنچا۔ خصوصاً ہوائی جہازوں کے ذریعہ کافی مدد ملی۔ یہ جنگ آخر ۱۹۳۸ء تک جاری رہی، اس کے بعد جنرل فرانکو نے جمہوریت کی مشینری پر قبضہ کرلیا اور یہ جنگ وطنی طاقتوں کی کامیابی اور اسپین میں جمہوریت کی شکست کے ساتھ ختم ہوئی۔

جرمنی میں نازی ازم کا قیام ۳۰ جون ۱۹۳۳ء کو مارشل فان ہنڈنبرگ صدر جمہوریہ جرمنی نے اوڈولف ہٹلر لیڈر نازی پارٹی سے استدعا کی کہ جدید انتخابات کے بعد عنان اقتدار وہ سنبھال لے اور اپنی مخالف پارٹی کو نکال باہر کرے چنانچہ اسوقت سے ہٹلر اور اسکی پارٹی برسر اقتدار آئی اور چندماہ کے اندر ہی پوری حکومت کی مشینری پر قبضہ کرلیا اور تمام پارٹیوں کو نکال باہر کیا پھر جمہوریت کے دستور کو ختم کردیا اور اپنا نظام اپنے اصول اور اپنے ضوابط جرمنی قوم پر نافذ کردیئے۔ ہٹلر نے اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں اپنے سیاسی اصول اور اپنی داخلی وخارجی سیاست پر شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے۔ ہٹلر کے سیاسی کارناموں کا ۴۴

اور نظام کا اصول یا سلسلے ایک مستقل...

۴۴ ایک اجمالی خاکہ ان حوادث کی شکل میں نظروں کے سامنے ہے جو یورپ کی موجودہ جنگ تک اس کی داخلی

ادبیات

نعت سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام

ازجناب المم صاحب مظفرنگری

سجی ہے جلوۂ عرفانِ حق سے جن کی پیشانی
بجچے کیا ان کی نظروں میں شکوہ تاجِ سلطانی

گدا کو بخشتے ہیں دم میں اورنگِ جہانبانی
اڑاتے ہیں ہوا میں پرچمِ تختِ سلیمانی

وہ لذت گیر جب ہوتے ہیں خوانِ من وسلویٰ سے
کیا کرتے ہیں پتے شاخِ طوبیٰ کے مگس رانی

وہ جس دم عالمِ تنزیہ میں پرواز کرتے ہیں
دباتی ہے پرِ جبریل کو اُن کی پرافشانی

ہے ان کی ذات خود اک کعبۂ مقصودِ اہلِ دل
طواف انکی گلی کا افتخارِ باغِ رضوانی

کبھی روتے بھی ہیں گر شدتِ دردِ محبت سے
تو آنسو بن کے گرتا ہے دُرِ دریائے عمانی

ٹپکتی ہیں لبوں سے ان کے بوندیں آبِ حیواں کی
ہے پیدا ان کے ہر اک لفظ سے تفسیرِ قرآنی

نہ آنے دے تصور میں خیالِ جذبۂ باطل
ارے غافل نہ دب جائیں کہیں جذباتِ روحانی

نہیں ہیں فخر کے قابل قیاساتِ اہلِ یوناں کے
کہاں نکلی ہے آئینے سے اسکندر کے حیرانی

تو حاصل کر وہ دل جو مرکزِ اسرارِ وحدت ہے
وفورِ غم سے جس میں رات دن آتی ہے طغیانی

وہ دل جو برزخِ کبریٰ ہے دنیائے محبت میں
جو ہر عالم میں رہتا ہے ہلاک ذوقِ وجدانی

کبھی ہے سجدہ آرائے ستم شمشیرِ قاتل پر
کبھی حلقومِ بسمل پر نشانِ تشنہ سامانی

یہی شانہ کشِ مستی طراز زلفِ لیلیٰ ہے
عطا کی ہے اسی نے قیس کو بھی خانہ ویرانی

ہے نے بست زلیخا میں کبھی اندوہ جاں فرسا
کبھی کاخِ مصور میں جمالِ ماہ کنعانی

کبھی الہام تسکیں ہے خلیل اللہ کے دل پر
کبھی دشتِ بلا میں سرخیِ رومانِ قربانی
جہانِ قدس اس کی عظمتوں پر رشک کرتا ہے
بنا ہے جب سے تفسیر کلامِ حسنِ یزدانی
وہی حسنِ خفی پھیلا تو اک بحرِ حقیقت تھا
جو سمٹا بن گیا مہرِ نبوت کی درخشانی
وہی جس نے فروغ و زینتِ بزمِ ازل ہو کر
پئے تخلیق گرمایا مزاجِ شوقِ یزدانی
جھکے تھے جس کے سجدے کو ملایک صف بصف ہو کر
شہادت دے رہی ہے حضرتِ آدم کی پیشانی
میسر جس کو مازاغ البصر کی دیدہ افروزی
جسے حاصل ہوئی ہے بزمِ اوادنیٰ کی مہمانی
ہے تکمیلِ نبوت کے لئے خود حجتِ قاطع
رموزِ مقصدِ تورات و رمزِ نصِ قرآنی

قلم برداشتہ اک مطلع رنگیں الم لکھو
کرو ساقی سے باتیں گر ہے شوقِ نطقِ ریحانی

وہ دے لہرا رہی ہے جس میں برقِ طورِ عرفانی
مزاجِ دل کو گرماتی ہے جس کی شعلہ سامانی
یقیں ہو جائے دل کو اتصالِ آب و آتش کا
نظر آجائے بے پردہ شفق کی شعلہ سامانی
میں بادہ کش ہوں پیاسا آج دریا ہو تو پی لونگا
کہیں بجھتی ہے اک ساغر سے میری تشنہ سامانی
چلے دور ایک ایسا بزمِ رندانِ حقیقت میں
کہ مٹ جائے دلوں سے سوزشِ غم کی فراوانی

لکھو پھر مدح حاضر میں اک ایسا مطلعِ روشن
جسے سنکر کہیں احسنت عرفی اور خاقانی

وجودِ پاک تیرا احسنِ تقویمِ انسانی
ترا قلبِ مطہر مرکزِ اسرارِ ربانی
تجھی کو یہ شرف حاصل ہے ای محبوب یزدانی
فلک آٹھوں پہر کرتا ہے تیرے در کی دربانی
فروغِ باطل افگن تیرے جلووں کی درخشانی
مٹایا جس نے عالم سے خیالِ شرکِ ظلمانی
زہے شانِ طلوعِ آفتابِ برجِ عرفانی
دو عالم سر جھکا کر بول اٹھے ما اعظمَ شانی

عنایت کا تری پرتو بہارِ باغِ رضوانی | ترے جلوے کی ضو زینت فروزِ عرشِ رحمانی
ذنب تیری سعادت سے نہیں اب نحس و ظلمانی | قمر کو برجِ عقرب ہو گیا ہے برجِ سرطانی
اثر افگن ہے برجبینِ فلک اوجِ نبوت سے | زحل کی قوتیں مسلوب ہیں ہم شکلِ زندانی
ازل سے تا ابد ثانی نہ ہو گا آپ کا ہرگز | ہے خود صنعت پر اپنی ذہنِ فطرت وقفِ حیرانی
تحرک ہے اگر دل میں تری گرمیٔ الفت سے | لہو کی موج پر غالب ہو کیونکر روحِ شریانی
نسیمِ فیض سے تیری ہے تازہ گلشنِ ہستی | خوشی سے ہیں نجومِ آسماں محوِ گل افشانی
ہے سنبل طعنہ زن گیسوئے محبوبانِ عالم پر | نگاہِ نرگسِ شہلا ہے شمشیرِ صفاہانی
زمیں خوش آسماں خوش بحر و بر خوش آب و آتش خوش | مگر مسلم ہے وقفِ کاہشِ غمہائے پنہانی

الم خاموش! می آید صدا از جانبِ طیبہ
رسول اللہ می گوید کہ بشنو رمزِ ایمانی

بہوش آور دلِ مدہوش رامستِ غزلخوانی | بدہ اندیشۂ اوراک را ذوقِ خدا دانی
نمیدانی ز افعالش خجل شد نفسِ شیطانی | گرفتہ مسلمِ نادان طریقِ نامسلمانی
تشتت در گمانش مقصدِ دینی و ایمانی | تفرق در خیالش مقصدِ تعلیمِ قرآنی
یکے بیتاب و مضطر از پئے تقلید افرنگی | یکے سوئے کلیسا می دود در ذوقِ رہبانی
بہم مثلِ سگاں در جنگ بہرِ اقتدار خود | شدہ نذرِ تخلف مقصدِ احکامِ قرآنی
نمی دانم کہ ایشاں در پے دینِ کسے پویند | کہ می دارند از منشائے من بُعدِ فراوانی

مآلِ سوءِ اعمالیست ایں غوغا کہ می بینی
"چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

اسلام اور مسیحیت از مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری کتابت طباعت متوسط ضخامت ۲۲۰ صفحات قیمت ۸/ پتہ:۔ دفتر اہلحدیث امرتسر

مولانا ثناء اللہ صاحب ہندوستان کے نامور عالم اور مشہور مناظرِ اسلام ہیں آپ نے یہ کتاب پادری برکت اللہ کی تین کتابوں کے جواب میں لکھی ہے اور اپنے مخصوص انداز میں بدلائل ثابت کیا ہے کہ عالمگیر مذہب بننے کی صلاحیت صرف اسلام میں ہے عیسائیت میں نہیں۔ نیز یہ کہ دینِ فطرت اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ اثنار بحث میں پادری صاحب نے قرآن مجید اور اسلامی عبادات۔ معاملات اور نکاح و طلاق وغیرہ پر جو اعتراضات کیے تھے۔ مولانا نے ان کے بھی جوابات نہایت کافی و شافی طور پر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے یہ کتاب لکھکر اسلام کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ زبان کی لطافت اور اندازِ بیان کی حلاوت و دلچسپی کیلئے مولانا کا نام کافی ضمانت ہے۔

حقیقتِ سجاد از عروج صاحب قادری تقطیع خورد۔ ضخامت ۴۸ صفحات کتابت وطباعت متوسط قیمت ۵/ پتہ:۔ ادبستان مراد پور، بانکی پور، پٹنہ۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کی یادگار میں ایک کتاب "محاسنِ سجاد" کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں ایک مضمون راغب احسن صاحب کا بھی تھا۔ اس مقالہ میں راغب صاحب نے اذکروا موتاکم بخیر پر عمل اس طرح کیا تھا کہ مولانا مرحوم پر بیجا اعتراضات اور دلخراش طعن و تشنیع کی بھرمار کردی تھی۔ زیر تبصرہ رسالہ اسی مضمون کا تشفی بخش جواب ہے۔ جنھوں نے محاسن سجاد کا مطالعہ کیا ہے انھیں یہ رسالہ بھی پڑھنا چاہیے۔ اس کا دیباچہ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے لکھا ہے۔

دنیائے آرزو | از جناب مرزا ادیب صاحب بی۔ اے (آنرز) تقطیع متوسط کتابت طباعت اور کاغذ بہتر۔ ضخامت ۲۲۸ صفحات قیمت عمر پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

اس کتاب میں روزنامچہ کے انداز میں سوسائٹی کے موجودہ نظام پر بڑی سخت تنقید کر کے اس کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ پہلے اور دوسرے مضمون میں آجکل کے بے روزگار تعلیمیافتہ نوجوانوں کی حسرتناک زندگی کا قلمی مرقع پیش کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح عظیم الشان منصوبوں کو لئے ہوئے بی۔ اے پاس کرتے ہیں۔ دورانِ تعلیم میں ہی ان کو رشتہ کی کسی بہن سے عشق ہوجاتا ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے والدین آپس میں دونوں کی شادی کر دینا منظور کر لیتے ہیں۔ مگر محبوبہ کے والدین کئی سال تک انتظار کرتے ہیں کہ ہونیوالے داماد کو کوئی اچھی ملازمت ملجائے تو شادی رچائیں۔ غریب نوجوان ملازمت کے حصول میں ایک ایک در کی خاک چھانتا ہے۔ لیکن جب ہر جگہ سے مایوسی ہوتی ہے تو لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی جاتی ہے۔ اور اس طرح نوجوانی میں ہی نخلِ آرزو خشک ہو کر رہجاتا ہے۔ محبوبہ کی شادی کے بعد نوجوان کو ایک معمولی سی ملازمت ملجاتی ہے۔ مگر چند در چند مایوسیوں سے دوچار ہونے کا اور قلیل تنخواہ کی محنت طلب ملازمت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حوصلہ مند گریجویٹ دق اور سل کا شکار ہوجاتا ہے اور آخرکار ناکام و نامراد ہی دنیا سے چل بستا ہے۔ تیسرے مضمون "نالۂ دل" میں سرمایہ داری کی لعنت، مزدور کی حسرت نصیب زندگی، قانون کی ناانصافیاں، اور مذہب کے نام پر ظلم و ستم۔ ان تمام چیزوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ مگر زبان کی غلطیاں کئی جگہ نظر آئیں مثلاً ص ۳۳ پر "انھوں نے غسل بھی کرنا ہے" صحیح "انھیں غسل کرنا ہے"۔ اسی طرح ص ۹۶ پر "انھیں" کے بجائے "انھوں نے" ہی لکھا ہے۔ پھر ص ۱۰۳ و ۱۰۶ پر "شکار پر" لکھا ہے حالانکہ "شکار کے لئے" ہونا چاہئے۔ ص ۱۰۸ پر "برا نہ منانا" بھی صحیح نہیں ہے "برا نہ ماننا" ہونا چاہئے۔ ص ۱۲۳ پر ہے "ایک خط ماموں جی کو بھی آیا ہے" اس کے بجائے "ماموں جی کے پاس" ہونا چاہئے۔ ص ۱۳۴ پر "کہ میری طرف خط

لکھئے" غلط ہے" مجھکو خط لکھئے" ہونا چاہئے" وغیر ذالک۔ تاہم مرزا ادیب صاحب کا طرز تحریر بہت دلکش، موثر اور پر زور ہے۔ اور کتاب اسقدر دلچسپ ہے کہ شروع کر دینے کے بعد ختم کئے بغیر اسی چھوڑ دینے کو جی نہیں چاہتا۔

گل و مل تقطیع خورد ضخامت ۲۸۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ قیمت عہ شائع کردہ "انجمن ترقی ادب" شیدی پورہ نئی دہلی۔

سید علی عباس صاحب بی۔ اے ال ال بی (علیگ) فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے خوش فکر و خوش بیان شاعر گرامی نشان ہیں اگرچہ خود اپنے قول کے مطابق عباس صاحب نے غالب کی پیروی کی بہت کچھ کوشش کی ہے۔ لیکن آخر امران کا اپنا ایک مستقل رنگ قائم ہوگیا جس میں حافظ وخیام کی سرستی و رندی۔ نظیری و عرفی کی تصوف آمیزی۔ امیر خسرو اور جامی کا جوش بیان۔ اور مرزا غالب کی فلسفیت، ان سب کی ملی جلی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس مجموعہ میں آپ کا تمام اردو اور فارسی کا کلام شامل ہے۔ جس میں دو تین سہروں، ایک دو قطعوں اور ایک مرثیہ کے علاوہ سب غزلیں ہی ہیں۔ شروع میں ہدایت الرحمٰن صاحب محسنی ایم اے نے ۶۲ صفحات کا طویل فاضلانہ مقدمہ لکھکر اس مجموعہ کے حسنِ معنوی کے نکھارنے میں ایک چابکدست مشاطہ کا کام کیا ہے کتاب ہر صاحبِ ذوق کے مطالعہ کی چیز ہے۔

مشرق و مغرب از حمیدہ سلطان صاحبہ دہلوی تقطیع خورد ضخامت ۱۰۴ صفحات کتابت وطباعت عمدہ اور روشن۔ قیمت عہ پتہ :۔ دفتر انیس نسواں دہلی۔

یہ ایک مفید و دلچسپ اخلاقی و معاشرتی افسانہ ہے جس میں ایسی دو لڑکیوں کا موازنہ کیا گیا ہے جن میں سے ایک کو مغربی طریقہ پر تعلیم و تربیت دی گئی تھی اور دوسری کو اسلامی و مشرقی طرز کی تعلیم ملی تھی۔ انگریزی تربیت کے زیر اثر حسن و شباب کی غلط کرداریاں، پھر جسمانی اور مادی تکالیف

میں مبتلا ہو کر عالم بیکسی و کس مپرسی میں "لذتِ خوابِ سحر" کی سوگواریاں۔ اور دوسری جانب عفت و عصمت، معتدل شرم و حیا۔ خانہ داری کا سلیقہ وغیرہ، ان سب کو بہت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ محترمہ حمیدہ سلطان کی تحریر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عصمت چغتائی اور حجاب امتیاز علی کی تحریروں کی طرح "مردانہ پن" نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک لطیف قسم کی "نسائیت" ہوتی ہے جو اُن کے حسنِ تحریر کو چار چاند لگا دیتی ہے۔۔۔ عشوۂ فرنگ کے دل دادہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپ اور مفید ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ اس آئینہ میں انھیں اپنی صورتِ زیبا کے بعض ایسے بدنما داغ نظر آجائیں جنھیں غازۂ و کریم کی افراط سے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر وہ بقول غالب غرور جمال کے علی الرغم "اپنا سا منہ لیکر رہ جائیں"۔

روح مکاتیب حصہ اول۔ مرتبہ ساغر صاحب نظامی تقطیع متوسط ضخامت ۲۸۴ صفحات۔ طباعت و کتابت عمدہ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ایشیا، ادبی مرکز میرٹھ

جناب ساغر نظامی نے ایک عجیب جدت یہ کی ہے کہ آپ نے اپنے ماہانہ رسالہ ایشیا کا جون نمبر مکاتیب نمبر کے نام سے شائع کیا ہے، اس نمبر میں وہ خطوط ہیں جو ساغر صاحب کو اکابرِ علم و ادب، یارانِ سرپل، اور ہمعصر احباب کی طرف سے وقتاً فوقتاً وصول ہوتے رہے ہیں۔ ان خطوط کی مجموعی تعداد ۲۲۳ ہے شروع میں راجندر ناتھ شیدا ایم اے کے قلم سے "ادب میں مکاتیب کا درجہ" کے زیرِ عنوان دس صفحات کا ایک لائق قدر دیباچہ ہے۔

اس میں شبہ نہیں خطوط کو کسی زبان کی ادبیات میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے۔ پھر وہ خطوط جو کسی شاعر و ادیب کے قلم سے کسی زندہ دل، رنگین مزاج اور تمثال شعریت و موسیقی شاعر و ادیب کے نام ہوں اور بھی زیادہ دلچسپ، اور ادبی لحاظ سے ایک مجموعۂ رنگ و بو ہوتے ہیں، چنانچہ ان خطوط میں بھی عالمانہ متانت تحریر و سنجیدگی، دوستانہ چھیڑ چھاڑ۔ ادبی و شعری لطائف و ظرائف، محبت و شوق کا والہانہ اظہار،

شعر نوازی و قدر دانی کا مظاہرہ، شوخ نگاری و ظرافت، غرض یہ کہ سب ہی کچھ موجود ہے۔ اور اس لئے یہ مجموعہ بہت دلچسپ اور اوقاتِ فرصت میں مطالعہ کے لائق ہے البتہ اس مجموعہ میں اگر ساغر صاحب صنف نازک کے خطوط بھی شامل کر دیتے تو یہ اور زیادہ دلچسپ ہو جاتا۔ رہا یہ کہ "میرے پتہ سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے؟" تو واضح رہنا چاہئے کہ جس کا پتہ ساغر کو مل گیا غیر کب تک اس سے بے خبر رہ سکتا ہے نسیم صبح اور بوئے گل کی رازداری! یہ کس طرح ممکن ہے؟

مکتوبات شاد عظیم آبادی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ تقطیع خورد ضخامت ۲۹۹ صفحات کتابت و طباعت خاصی کاغذ معمولی قیمت ۸/ ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن

حضرت شادؔ اردو کے نامور استاذ سخن اور شاعر شیوا بیان تھے۔ شاعری کے علاوہ بعض اور مشرقی علوم و فنون میں بھی کمال رکھتے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب آپ کے ہی مکاتیب کا مجموعہ ہے، خطوط زیادہ تر محترمہ صغریٰ بیگم اور ان کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب کے نام ہیں۔ اسلوبِ نگارش پرانا ہے۔ عربی و فارسی کے الفاظ کی بہتات کے ساتھ القاب و آداب پیام و سلام۔ تعریف و توصیف اور تشکر و امتنان میں وہ ہی قدیم مبالغہ آمیز رنگ پایا جاتا ہے۔ تاہم اس حیثیت سے یہ مجموعہ ضرور قابل قدر ہے کہ وہ اردو کے ایک نامور شاعر و فاضل کی یادگار ہے۔ بعض بعض خطوط میں ادبی نکات و مسائل پر بھی گفتگو ہے جو بجائے خود مفید ہے۔ شروع میں ڈاکٹر زور صاحب کے قلم سے شادؔ کی زندگی اور اس سے متعلق دوسری باتوں پر ایک فاضلانہ مقدمہ ہے۔

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب

"وحی الٰہی"

"وحی الٰہی" ہماری زبان میں پہلی بے مثل محققانہ کتاب ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے سنجیدہ اور دلپذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اسکی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سماجاتا ہے۔ اس کتاب میں وحی کی لغوی اور شرعی حقیقت، وحی کے اقسام، وحی کے متعلقہ مباحث مثلاً صفاتِ الٰہی خصوصاً صفتِ کلام۔ ملکۂ نبوت اور استعدادِ وحی۔ وحی اولاً کس طرح نازل ہوئی اور آخر تک کن کن طریقوں سے نازل ہوتی رہی۔ قرآن نے اپنے وحی ہونے کے کیا کیا دلائل بیان کئے۔ وحی کی حقیقت جدید فلاسفۂ مغرب کے نزدیک ان سب عنوانوں پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں اعجاز قرآن پر بالکل جدید طرز سے گفتگو کی گئی ہے جس میں وجوہ اعجاز کی تنقیح کرکے ہر وجہِ اعجاز پر بصیرت کی پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ وحیِ الٰہی کے سلسلہ میں جسقدر عقلی اور نقلی شکوک و شبہات کئے گئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اُن کا کلی طور پر ازالہ ہوسکتا ہے اور طالبِ حق کیلئے ہدایت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ترتیب کی دلنشینی اور اندازِ بیان کی شگفتگی کے لئے مولانا سعید احمد مدیر برہان کا نامِ نامی کافی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ فرمائیں۔ وحی جیسے نازک اور الجھے ہوئے مسئلہ کا حل اس سے بہتر انھیں کہیں نہیں ملیگا۔

کتابت طباعت نہایت اعلیٰ۔ اصلی قیمت غیر مجلد عہ ۱۲ رعایتی قیمت بسلسلہ رمضان المبارک عہ

ملنے کا پتہ

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی

فہمِ قرآن

اُردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں فہم قرآن سے متعلق تمام قدیم وجدید نظریوں پر نہایت مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت کیا ہے، اور یہ کہ "وحی الٰہی" کا صحیح منشاء معلوم کرنے کے لیے شارع علیہ السلام کے اقوال وافعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں بعض تعلیمیافتہ اصحاب کی طرف سے جو شکوک وشبہات کیے جاتے ہیں اُن کا بھی نہایت سنجیدہ اور تشفی بخش جواب دیا گیا ہے، نیز تدوینِ حدیث، فتنۂ وضع حدیث، اس فتنہ کا انسداد، احادیث کا پایۂ اعتبار، صحابہ کی عدالت، کثرت سے روایت کرنے والے بعض صحابہ کے سوانح حیات اور دور تابعین کی خصوصیات، اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد عہ مجلد سنہری عکر

نبیِ عربی صلعم

تالیف مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی (رفیق ندوۃ المصنفین دہلی)

تاریخ اسلام کے ایک مختصر اور جامع نصاب کی ترتیب "ندوۃ المصنفین" دہلی کے مقاصد میں ایک ضروری مقصد ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ جس میں متوسط استعداد کے بچوں کے لیے سیرتِ سرورِ کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

اسکول کے لڑکوں کے علاوہ جو اصحاب تھوڑے وقت میں سیرت طیبہ کی اَن گنت برکتوں سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں، اُن کو اس کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیے، یہ کہنا مبالغہ سے پاک ہے کہ "نبیِ عربی" اپنے طرز کی بالکل جدید اور بے مثل کتاب ہے۔ کتابت، طباعت نہایت اعلیٰ، ولایتی سفید چکنا کاغذ، صفحات ۱۶۰ قیمت مجلد سنہری ایک روپیہ (عہ) غیر مجلد بارہ آنے (۱۲ر)

Registered No. L 4305

قواعد

۱۔ برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اُتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

۳۔ باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں، ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

۴۔ جواب طلب امور کے لیے ۲ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵۔ "برہان" کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۶۔ قیمت سالانہ پانچ روپے، ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

۷۔ منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرولباغ نئی دہلی سے شائع کیا۔

ندوة المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

مُرتّبہ

سعید احمد اکبر آبادی

ایم اے۔ فاضل دیوبند

برہان

جلد ہفتم — شمارہ (۵)

شوال المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق نومبر ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

کوئی شخص اگر کسی جماعت کا ممبر ہو تو اُسے سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس جماعت کے مقاصد اور اصولِ کار کیا ہیں پھر اگر وہ اس جماعت میں شامل ہوتا ہے تو گویا وہ دل سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ اُسے اس جماعت کے مقاصد اور اصولِ کار سے پورا اتفاق ہے۔ اور اسے یہ دونوں اتنے عزیز ہیں کہ ان کی حفاظت کیلئے وہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کیلئے آمادہ ہے۔

پس ہم میں سے ہر شخص کو سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ مسلمان کیوں ہے؟ کیا وہ اسلئے مسلمان ہے کہ ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ اور اس بنا پر اُسے مردم شماری میں مسلمان لکھا جاتا ہے اگر مسلمان ہونے کی وجہ صرف اتنی ہی ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو نہ اسلام سے کچھ واسطہ ہے اور نہ اسلام کو اُن سے کوئی غرض! اور اگر مسلمان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف مذہبِ اسلام کو حق سمجھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس مذہب کو اختیار کئے بغیر اسے سعادتِ دینی و اخروی حاصل نہیں ہو سکتی تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ شخص حقیقی معنی میں مسلمان ہے اور اس بنا پر اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کے اصولِ عمل سے پوری طرح باخبر ہو، ان کو حق مانے، اور اس کی زندگی کا مقصد انھیں مقاصد و اصول کی حیات و بقا کیلئے جد و جہد کرنا ہو۔ علم اور لاعلمی کی بنا پر عمل کے اصول اور ان کی جزئیات کی تفصیلی و تحقیقی معلومات کے اعتبار سے مسلمانوں میں باہمی فرق ہو سکتا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ یہ فرق و امتیاز ناگزیر ہے لیکن جہانتک مقاصد اور اصول کے اجمالی علم کا تعلق ہے وہ ہر مسلمان کو حاصل ہونا چاہیے۔ جس طرح فیشسٹ پارٹی

کا ایک ایک ممبر، برطانوی فوج کا ایک ایک سپاہی۔ اور نازی جماعت کا ایک ایک جرمن فرد۔ خواہ عالم ہو یا جاہل خواندہ یا ناخواندہ اس بات کو جانتا ہے کہ وہ کیوں اپنی جماعت کا ممبر ہے۔ اور اس حقیقت کو جاننے کے ساتھ اپنے دل میں یہ عزم اور ولولہ بھی رکھتا ہے کہ وہ اپنی جماعت کے مقاصد کیلئے اپنی عزیز ترین سے عزیز ترین متاع بھی قربان کردے۔ ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کو بلا امتیاز عالم وجاہل یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہکر جس سوسائٹی (امت) کا ایک فرد قرار دے رہا ہے اُسکا مقصد کیا ہے پھر اس مقصد کیلئے امادگیٔ عمل کے جذبہ اور ولولہ کا دل میں پایا جانا بھی مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے۔ غور کیجئے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ تصدیق بالجنان۔ اقرار باللسان اور عمل بالجوارح۔ تو پھر کیا کوئی مسلمان حقیقۃً مسلمان ہوسکتا ہے اگر وہ دل سے اسلام کے مقاصد کی تصدیق اور عمل کے ذریعہ اس تصدیق کا اثبات و اظہار نہیں کرتا۔

اسلام کا مقصد کیا ہے؟ دنیا بھر کے تمام اختلافات کے باوجود اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ اسلام کا مقصد خدا کے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا۔ اور اس کی خدائی کو منوانا ہے اب اس راہ میں جتنی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اسلام ان سب کا دشمن ہے اور وہ حکم کرتا ہے کہ ان کو جس طرح بھی ہو دور کردیا جائے، شرک۔ فساد فی الارض، معصیت کوشی، ظلم وجور، بغی وعدوان، اور قانونِ الٰہی سے سرتابی وسرکشی۔ یہ تمام چیزیں وہ ہیں جن کا استیصال کرکے تمام انسانی افراد کی ایک پُرامن سوسائٹی اور ایک صالح جماعت بنا دینا اسلام کا مقصد ہے۔ اس جماعت کا واحد نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ وہ جہاں کہیں خدائی قانون سے انحراف دیکھے اسے اگر قوت سے روک سکتی ہے تو قوت سے ورنہ کسی اور حسنِ تدبیر سے روک دے۔ اس جماعت کے ہر ہر فرد کے دل میں ایک مسلسل تڑپ اور لازوال بےچینی ہونی چاہئے ہر اُس بغی وعدوان کے قلع وقمع کردینے کی جو انسانوں کو اللہ سے بغاوت اختیار کرنے کا راستہ دکھائے۔ کتابِ الٰہی نے مسلمانوں کے مقصد زندگی کی وضاحت ان صاف الفاظ میں کی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون جو امتیں بھیجی گئی ہیں تم ان سب میں بہتر امت ہو تم اچھی

بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو"

دیکھئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم خود برے کاموں سے رُکتے ہو اور اچھے کام کرتے ہو، بلکہ مسلمانوں کے خیرامت (صالح ترین سوسائٹی) ہونے کی بنیاد اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ وہ خود تو اچھے عمل کرینگے اور برے کاموں سے رُکینگے ہی۔ اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی اچھے کاموں کا حکم دینگے اور برے کاموں سے روکینگے پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ محض نصیحتہً اور بہ طورِ وعظ کسی بات کا کہدینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسلام اپنے پیرووں کے ہاتھ میں وہ زبردست طاقت وقوت دیکھنا چاہتا ہے جس کے ذریعہ وہ معروف کا امر اور منکر سے نہی کر سکیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر مسلمانوں میں یہ طاقتِ امر ونہی موجود ہے تو انھیں اس کا استعمال موقع ومحل کے مناسب کرنا چاہئے۔ اور اگر بدقسمتی سے ان میں یہ طاقت نہیں ہے تو انھیں اس طاقت کے حصول کیلئے جدوجہد کرنی چاہئے۔ یہ یاد رہے کہ اسلام کسی ایک مخصوص قوم یا کسی خاص ملک کا نہیں بلکہ وہ پوری انسانیت کا سچا ہمدرد وغمگسار ہے۔ وہ ہر ظالم کی سرکوبی کرکے مظلوم کا حق دلانا، اور ہر جابر وقاہر قوم یا فرد کی اکڑی ہوئی گردن کو حق کے سامنے جھکا دینا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے۔ اس میں ایشیائی یا یورپین اور کالے اور گورے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ باطل اور خدا کے تمام باغیوں کا سر کچل کر خدا کی سرزمین کو فتنہ وفساد اور شر وسبعیت سے پاک و صاف کر دینا چاہتا ہے۔ پس یہ ہے اسلام کا مقصد اولین جس کو حاصل کرنے کی پیہم تڑپ ہر ہر مسلمان کے دل میں ہونی چاہئے۔ اور اسے اپنے اسلام کے اعلان واظہار کے پہلے دن ہی یہ اذعان قائم کر لینا چاہئے کہ وہ آج سے ایسی جماعت میں شامل ہو رہا ہے جو زندگی کے بستر پر اطمینان وسکون کی کوئی کروٹ اس وقت تک نہیں لیگی جب تک کہ اللہ کا قانون اور اس کا بتایا ہوا نظام زندگی دنیا کے سب قانونوں اور نظاموں پر غالب نہیں آجائیگا۔ خوب اچھی طرح یاد رکھئے نماز، روزہ اور زکوٰۃ وحج ادا کرکے چین سے زندگی بسر کرنا اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے جذبہ سے غافل وبے خبر رہنا اسلام کے مفہوم کو بالکل غلط سمجھنا ہے۔

ذوالقرنین اور سدِ سکندری

جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(۴)

سب سے پہلے ہم اُس "سد" پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دربند (حصار) میں واقع ہے۔ اس "سد" کے حالات ساتویں صدی کے ایک چینی سیاح نے ہی نہیں بیان کئے بلکہ (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) شاہِ رُخ کے جرمنی مصاحب سیلد برجر[1] اور ہسپانوی سفیر کلافیجو[2] نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کا مشاہدہ کیا ہے اور انھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ یہاں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں مگر مورخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ سدّ (دیوار) پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ دیوار کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے۔ اور لوہے کے پھاٹکوں کی وجہ سے اس کو بھی اسی طرح "درۂ آہنی" کہتے ہیں جس طرح دربند (بحرِ قزوین) کو درۂ آہنی کہتے ہیں نیز یہ دیوار جس طرح پہاڑوں کے درمیان میں چلی گئی ہے اُسی طرح اس کا ایک حصہ سطح زمین پر بھی بنایا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ صرف دو پہاڑوں کی پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان ہی میں قائم کی گئی ہو۔

پس اس دیوار کو "سدِ ذوالقرنین" کہنا قرآنی تصریحات کے قطعاً خلاف ہے اور غالباً اسی وجہ سے کسی ایک مورخ نے بھی (جو کہ دربند (حصار) اور دربند (بحرِ قزوین) کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں) اس دیوار (سد) کو سدِ ذوالقرنین یا "سدِ سکندری" نہیں کہا۔

---

[1] و [2] الجواہر طنطاوی جلد ۹ صہ ۱۹۸

مگر تعجب ہے محترم مدیر صاحب صدق سے کہ انھوں نے قرآنی تصریحات کو سامنے رکھے بغیر تمام مورخین کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ دربند (حصار) کی دیوار (سد) ہی "سدِ سکندری" یعنی سدِ ذوالقرنین ہے۔ شاید وہ اس جدت کے لئے اس لئے مجبور ہوئے ہیں کہ ایک تو اُن کا مسلک یہ ہے کہ سکندر ہی ذوالقرنین ہے اور دوسرے اس جانب میں سکندر کی فتوحات کی آخری حد اسی علاقہ تک ہے جیسا کہ ۱۸؍ اگست کے صدق کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"سکندر اعظم اپنی تیسری فوج کشی میں اسی علاقہ تک گیا تھا"

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی صراحت کے بعد وہ مجبور ہیں کہ دربند (حصار) کی سد ہی کو سدِ ذوالقرنین تسلیم کریں مگر اس سے زیادہ یہ ظاہر ہے کہ اس سد پر نہ قرآنِ عزیز کی بیان کردہ صفات ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ کوئی مورخ ہی اس کو "سدِ سکندری" یا سدِ ذوالقرنین کہتا ہے اور بالفرض اگر اس کو سکندر کی تعمیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ سدِ ذوالقرنین کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ قرآنی صفات کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا نمبر دربند (بحرِ قزوین) کی دیوار (سد) کو زیرِ بحث لانے کا ہے۔ اس کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کو عرب باب الابواب اور الباب کہتے ہیں اور اہلِ فارس دربند اور درۂ آہنی نام رکھتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کثرت سے مورخین اس دربند کی دیوار (سد) کو "سدِ سکندری" کہتے چلے آئے ہیں مگر محققین یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہے البتہ اس کو "سدِ سکندری" بھی کہدیتے ہیں اور کاکیشین وال (کاکیشیا کی دیوار) بھی اور دیوارِ نوشیرواں بھی۔

لیکن ہم اس بحث کو موخر کرتے ہوئے کہ اس کے متعلق یہ اضطراب بیانی کیوں ہے اس "سد" کو سدِ ذوالقرنین جب ہی مان سکتے ہیں کہ یہ قرآنِ عزیز کے بیان کردہ ہر دو صفات کے

مطابق پوری اترے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اسلئے کہ اس دیوار کے عرض وطول اور اس کے حجم کی تفصیلات دیتے ہوئے تمام مورخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دیوار کا بھی بہت بڑا حصہ سطح زمین پر تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ملتے ہیں کہ اگرچہ یہ دیوار بعض جگہ دوہری بھی ہے اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک بھی ہیں جن میں سے بعض بعض پہاڑوں کے درمیان قائم ہیں اور پہاڑوں پر اس کے استحکامات بھی بہت ہیں تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونہ ہی سے بنائی گئی ہے۔ پس اس کا بانی کوئی شخص بھی ہو اس دیوار کو "سد ذوالقرنین" کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اب رہا اس کو "سدِ سکندری" کہنا سو ہمیں اس کے انکار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر تاریخی حقائق اس دعوے کا ساتھ دیتے مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مورخین جب سکندرِ مقدونی کا ذکر کرتے اور اس کی وسعتِ فتوحات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ سکندرِ اعظم کاکیشیا تک پہنچا ہے اور بقول مولانا ابوالکلام

> لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دیئے ہیں اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کی لڑائی یا کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کر لی جائیں۔[1] یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سکندرِ اعظم کی جانب یہ انتساب صحیح ہے؟

امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ دان کریم (Cram) نے اپنے جغرافیہ کریمس یونیورسل[2] اٹیلس (Crame's Universal Atlas) میں سکندرِ اعظم کی سلطنت ۳۰۱-۳۳۱ق م کا جو مکمل نقشہ تیار کیا ہے اس میں بھی کاکیشیا کا علاقہ اس کی فتوحات سے سینکڑوں میل دور نظر آتا ہے۔

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۲۸ ۔ [2] ص ۲۰۵

بہرحال اکثر مسلمان مورخین تو اس کا بانی نوشیرواں کو بتاتے ہیں اور جوزلفیس سکندر کو اس کا بانی قرار دیتا ہے اور بیان کردہ تاریخی حقایق کے پیشِ نظر نہ انوشیرواں کی نسبت صحیح ہے اور نہ سکندرِ اعظم کی اور اگر ان دونوں میں سے کسی کی نسبت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کو "سدِ ذوالقرنین" کہنا حقائقِ قرآنی سے آنکھیں بند کر لینا ہوگا۔ پس دربند (حصار) ہو یا دربند (بحر خزر) دونوں کی "سد" سدِ ذوالقرنین نہیں ہے۔

تیسری قابلِ ذکر وہ "سد" ہے جو دربند (قزوین) یا کاکیشین وال کے مغرب جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے یہ درہ دربند سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا ہے اور درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے یہ درۂ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے ہو کر گذرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں "درۂ آہنی" اور ترکی میں دامرکپو کہتے ہیں۔

اس درہ کے متعلق گذشتہ صفحات میں امام رازیؒ کی تفسیر سے "اس تشریح کے بعد کہ یہ دو پہاڑ جن کے درمیان سد واقع ہے قفقاز میں ہے" ہم ابن خرداد کی کتاب المسالک والممالک کا یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں کہ واثق باللہ نے جب اپنے خواب کی تعبیر کے پیشِ نظر "سدِ ذوالقرنین" کی تحقیق کیلئے تحقیقاتی وفد (ریسرچ کمیشن) مقرر کیا تو انھوں نے باب الابواب (دربند) سے آگے چل کر جب اس کا مشاہدہ کیا ہے تو تصریح کی ہے کہ یہ دیوار تمام کی تمام لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنائی گئی ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں "ان الواثق باللہ رائی فی المنام کانہ فتح ھذا الردم فبعث بعض الخدم الیہ لیعاینوہ فخرجوا من باب الابواب حتی وصلوا الیہ وشاھدوہ فوصفوا انہ بناء من لبن من حدید مشدود بالنحاس المذاب وعلیہ باب مقفل" [۱]

---

[۱] دربند نامہ کاظم بک صد ۲۱

پس جبکہ آج کے مشاہدہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ داریال کا یہ درہ پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کو تسلیم کرتے اور واضح کرتے ہیں۔ نیز واثق باللہ کے کمیشن نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے تو بلا شبہ یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہی دیوار وہ "سدِ ذوالقرنین" ہے جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے سورۂ کہف میں کیا ہے کیونکہ قرآنِ عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف صرف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہب، ابو حیان، ابن خرداد، علامہ انور شاہ اور مولانا آزاد جیسے محققین کی یہی رائے ہے کہ سدِ ذوالقرنین قفقاز کے اسی درہ کی سد کا نام ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم کو کہنے دیجیے کہ درۂ داریال کی یہ "سد" سائرس (گورش یا کیخسرو) کی تعمیر کردہ ہے اور "جیسا کہ ہم یاجوج و ماجوج کی بحث میں بیان کر چکے ہیں" یہ ان وحشی قبائل کے لئے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آکر اور اس درہ میں سے گذر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے اور یہ وہی سیتھین قبائل تھے جو سائرس کے زمانہ میں حملہ آور ہو رہے تھے اور اس وقت کے یاجوج و ماجوج کا مصداق یہی قبائل تھے اور ان ہی کی روک تھام کی ضرورت سے سائرس نے ایک قوم کی شکایت پر یہ "سد" تیار کی اور ارمنی نوشتوں میں اس سد کا جو قدیم نام "بھاک گورائی" (گور کا درہ) لکھا چلا آتا ہے اس گور سے مراد غالباً "گورش" ہے جو سائرس ہی کا دوسرا نام ہے۔

اور اس کے قریب دربند (بحر خزر) کی دیوار اس کے بعد اسی غرض سے کسی دوسرے بادشاہ نے بنوائی ہے اور نوشیرواں نے اپنے زمانہ میں اس کو دوبارہ صاف اور درست کرایا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور ان تینوں دیواروں (سد) میں سے سکندر کی بنائی ہوئی کوئی ایک سد بھی نہیں ہے

اس لئے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لئے کسی سد قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کی حکومت کے سارے دور میں یاجوج ماجوج قبائل کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ دربند (حصار) تک پہنچ کر کسی قوم کا اس قسم کے وحشی قبائل سے دوچار ہونا اور سکندر سے اس کی شکایت کرنا تاریخی حقائق میں کہیں نظر آتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور قابلِ غور ہے کہ آخر دربند (بحر قزوین یا بحر خزر) کی دیوار کے متعلق "سدِ سکندری" کیوں مشہور ہوا سو اس مسئلہ کے تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد بآسانی اس کا یہ حل سمجھ میں آجاتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق یہود کی مذہبی روایات سے بہت زیادہ وابستہ ہے اور اسی لئے یہود کے سوال پر قرآنِ عزیز نے بھی اس کا ذکر کیا ہے تو اس بدعت اور غلط انتساب کی ابتدا بھی وہیں سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے جوزیفس نے اس کے متعلق یہ بلا دلیل بیان کیا کہ یہ سد "سدِ سکندری" ہے اور وہیں سے یہ روایت چل گئی۔ اور مورخینِ اسلام میں سے محمد بن اسحٰق نے بھی چونکہ سکندر یونانی کو ذوالقرنین بتایا اس لئے مسلمانوں نے بھی اس سد کو سد سکندری کہنا شروع کر دیا اور آخر کار اس انتساب نے شہرت حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا سد کے متعلق اگرچہ اکثر عرب مورخین یہی کہتے جاتے ہیں کہ وہ انوشیرواں کی بنائی ہوئی ہے مگر "محققین" کی رائے یہ ہے کہ اس کے بانی کا صحیح علم نہیں حاصل ہو سکا البتہ تاریخی قیاسات سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شائد اس کی مرمت و درستی انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں کرائی ہو اور اسی وجہ سے وہ انوشیرواں کی جانب منسوب کر دی گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سد کو "سدِ سکندری" کہنا ایک افواہی انتساب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، نیز سکندرِ مقدونی جو انگریزی تاریخوں میں "گریٹ الیگزنڈر" کہا جاتا ہے کسی طرح "ذوالقرنین" نہیں

ہوسکتا اور نہ "سدِ ذوالقرنین" سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یاجوج وماجوج کا خروج

ذوالقرنین، یاجوج وماجوج اور سدّ کی بحث کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ یاجوج وماجوج کے اس خروج کا ہے جس کا ذکر قرآنِ عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علاماتِ قیامت سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "خروجِ یاجوج وماجوج" کا مسئلہ کہ جس کی خبر قرآنِ عزیز نے بطور پیشین گوئی کے دی ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو محض ظنی قیاسات سے حل کر لیا جائے اور جبکہ اس مسئلہ کا تعلق قرآنِ عزیز کے "اخبار مغیبات" سے ہے تو پھر اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی قرآنِ عزیز ہی کو پہنچتا ہے نہ کہ ظن وتخمین کو۔ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ صرف ان دو ہی سورتوں میں مذکور ہے۔

سورہ کہف میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے۔

فما اسطاعوا ان یظهروه و ما استطاعوا له نقبا۔ قال هذا رحمة من ربي فاذا جاء وعد ربي جعله دكاء وكان وعد ربي حقاه (کہف)	پس نہیں طاقت رکھتے وہ (یاجوج وماجوج) اس سدّ پر چڑھنے کی اور نہ وہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں (ذوالقرنین) نے کہا! یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آئیگا تو اسکو گرا کر ریزہ ریزہ کر دیگا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔

اور سورۂ انبیا میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

حتى اذا فتحت ياجوج و ماجوج وهم من كل حدب	یہانتک کہ جب کھول دیئے جائینگے یاجوج اور ماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئینگے

ینسلون۔ واقترب الوعد الحق — اور خدا کا سچا وعدہ قریب آجائے تو اسوقت اچانک
فاذاھی شاخصۃ ابصار الذین — ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کی آنکھیں کھلی
کفروا یٰویلنا قد کنا فی غفلۃ — کی کھلی رہ جائینگی (اور پکار اٹھینگے) ہائے کمبختی ہماری
من ھذا بل کنا ظلمین۔ — کہ ہم بے خبر رہے۔

ان دونوں مقامات میں قرآن عزیز نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ جس زمانہ میں "ذوالقرنین" نے "یاجوج وماجوج" پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آسکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ پیدا کرکے اس کو عبور کرسکتی تھیں اور سد کی اس مضبوطی اور پائیداری کو دیکھکر ذوالقرنین نے خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ سب کچھ خدا کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نیک خدمت کرادی۔

اور دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو یاجوج وماجوج، بے شمار فوج در فوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوٹ مار اور تباہی و بربادی مچادینگے۔

ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یاجوج وماجوج "سدِ ذوالقرنین" میں اس طرح محصور ہوگئے ہیں کہ یہ "سد" قیامت تک اسی طرح صحیح وسالم کھڑی رہیگی اور جب یاجوج وماجوج کے خروج کا وقت آیگا" اور وہ قیامت کے قریب اور علاماتِ قیامت میں سے ہوگا" تو اس وقت یکبارگی "سد" گر کر ریزہ ریزہ ہوجائیگی اور اسلئے انھوں نے دونوں مقامات میں اسی فہم کے مطابق آیات کی تفسیر کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے سورۂ انبیا کی اس آیت کا حتیٰ اذا فتحت یاجوج وماجوج کا یہ ترجمہ کرکے "یہانتک کہ جب یاجوج وماجوج سد توڑ کر کھول دیئے جائیں گے"۔ اس ارشادِ الٰہی کو ذوالقرنین کے اس مقولہ کے ساتھ جوڑ دیا جو کہف میں مذکور ہے۔ فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکآء "پھر میرے رب کا وعدہ آیگا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کردیگا"۔

مگر آیات کے سیاق وسباق اور ان کے مفہوم پر غائر نظر ڈالنے سے یہ تفسیر آیاتِ قرآنی کا حق ادا نہیں کرتی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے سورہ کہف میں تو صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج پر جب ذوالقرنین نے سد تعمیر کردی تو اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہدیا کہ جب میرے خدا کا وعدہ آجائیگا تو یہ سد ریزہ ریزہ ہوجائیگی اور خدا کا وعدہ برحق ہے اور اس کا خلاف ہونا محال و ممتنع۔

مگر اس جگہ یاجوج وماجوج کے اس خروج کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قیامت کے قریب وقوع میں آئیگا اور ہوتا بھی کیسے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا اپنا مقولہ ہے جو سد کے مستحکم اور مضبوط ہونے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اور خروجِ یاجوج وماجوج ان اخبارِ مغیبات میں سے ہے جو علاماتِ ساعت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کیا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اقوامِ عالم کیلئے ایک تنبیہ ہے کہ خدا کی یہ زمین اپنے آخری لمحات میں ایک سخت اور ہولناک عالمگیر حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔

اور سورۂ انبیا میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور وہ بہت سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد بپا کرنے کیلئے امنڈ پڑینگے۔ اور اس جگہ سد کا اور سد کے ریزہ ریزہ ہوکر اس سے یاجوج وماجوج کے نکلنے کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے اور لفظ "فتحت" سے ایسا سمجھنا محض قیاس وتخمینی ہے جیسا کہ عنقریب واضح ہوگا۔

پس سورہ کہف اور سورہ انبیا دونوں میں اس واقعہ سے متعلق آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سورۂ کہف میں تو پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سنائی گئی ہیں جن کے متعلق یہود نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خود یا مشرکین مکہ کے واسطہ سے سوال کیا تھا کہ ذوالقرنین

کی شخصیت کے متعلق اگر کوئی علم رکھتے ہو تو اس کو ظاہر کرو؟ قرآنِ عزیز یعنی وحی الٰہی نے اُن کو بتایا
کہ ذوالقرنین ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا، اس نے تین مہیں قابلِ ذکر سرکیں ایک مشرقِ اقصیٰ کی،
اور دوسری مغربِ اقصیٰ کی اور تیسری شمال کی جانب اور اس تیسری مہم میں اس کو ایک ایسی قوم سے
سابقہ ہوا جس نے یاجوج و ماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے اور اُن کے درمیان سدّ
قائم کردینے کا مطالبہ کیا۔ ذوالقرنین نے اُن کے مطالبہ کو اس طرح پورا کیا کہ اس جانب وہ جس درہ سے
نکل کر حملہ آور ہوا کرتے تھے اس کو لوہے کی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بند کردیا اور دو پہاڑوں کے
درمیان درہ پر ایک بہترین سد قائم کردی۔ اور ساتھ شکرِ خدا بجالاتے ہوئے اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ
یہ سد اسقدر مستحکم اور مضبوط ہے کہ اب یاجوج و ماجوج نہ اس میں سوراخ کرسکیں گے اور نہ اس پر
چڑھ کر ادھر آسکیں گے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی طرح رہیگی
بلکہ خدا کو جب تک منظور ہے یہ اسی طرح قائم ہے اور جب وہ چاہیگا کہ یہ روک باقی نہ رہے
تو یہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور خدا کا وعدہ "یعنی ہر شے کی طرح سدّ کا بھی فنا ہو جانا" پورا ہو کر رہیگا۔

یہود نے چونکہ صرف ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا اسلئے سورۂ کہف میں اسی کے
متعلق تفصیل سے بتایا گیا اور یاجوج و ماجوج کا محض ضمنی تذکرہ آگیا۔ اور سورۂ انبیا میں اللہ تعالیٰ
مشرکین کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بستیاں ہلاک کردی گئیں اب ان کے باشندے دنیا میں زندہ
نہیں واپس آئیں گے ہاں جب قیامت آجائیگی" اور وہ جب آئے گی کہ اس سے پہلے یاجوج و
ماجوج کا فتنہ پیش آئیگا تب البتہ میدانِ حشر میں سب دوبارہ زندہ کرکے رب العالمین کے سامنے
جوابدہ ہونے کے لئے جمع کئے جائیں گے۔

پھر چونکہ اس جگہ یاجوج و ماجوج کے خروج کو قیامت کی علامت بیان کرکے اہمیت
دی گئی ہے اس لئے ان کے نکلنے کو سدّ کے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کے ساتھ مقید نہیں کیا

بلکہ سرے سے سد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ جب ان کے خروجِ موعود کا وقت آجائیگا تو سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب امنڈ پڑیں گے اور تمام اقطاع و امصار میں پھیل جائینگے۔

پس ان مجموعۂ آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ "سدِ ذوالقرنین" یاجوج و ماجوج کے خروج سے پہلے ضرور ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ یاجوج و ماجوج کے موعود خروج کا وہ وقت ہوگا کہ قیامت کا وقت بالکل قریب ہوجائے اور اس کے بعد "نفخِ صور" ہی کا مرحلہ باقی رہ جائے اس وقت یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑینگے اور تمام کائنات میں فسادِ عظیم برپا کریں گے۔

بہر حال ذوالقرنین کے مقولہ "اذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء" میں "وعد" سے یاجوج و ماجوج کا خروج موعود مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ بلاشبہ "سد" کا اندکاک ہوجائیگا اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائیگی اور سورۂ انبیاء میں خدائے تعالیٰ کے ارشاد "فتحت یاجوج وماجوج" میں فتح سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سد توڑ کر نکل آئیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کثرت سے فوج در فوج نکل پڑینگے گویا کہیں بند تھے اور آج کھول دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ اہل عرب لفظ "فتح" کو جب جاندار اشیاء کیلئے استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی اور اب اچانک نکل پڑی۔ اسلئے جب کوئی شخص کہتا ہے کہ "فتح الجراد" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ٹڈیاں کسی جگہ بند تھیں اور اب ان کو کھول دیا گیا بلکہ یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ٹڈی دل کسی پہاڑی گوشہ میں الگ پڑا ہوا تھا کہ اب اچانک فوج در فوج باہر نکل پڑا۔

پس یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج و ماجوج جیسے عظیم الشان قبائل جو عرصہ سے باین کثرت واژدہام دنیا کے ایک الگ گوشہ میں پڑے ہوئے تھے اُس دن اس طرح امنڈ آئینگے گویا بند تھے اور اب

اچانک کھول دیئے گئے۔

سورہ کہف اور سورہ انبیاء کی زیر بحث آیات کی تفسیر رأس المحدثین حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے بھی عقیدۃ الاسلام میں یہی فرمائی ہے اور بلاشبہ یہ تفسیر بغیر کسی تاویل کے صحیح اور درست ہے اور اس سلسلہ کے بہت سے خدشات کو دور کرنے کے لئے مفید۔

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

وینبغی ان یعلم ان قول ذی القرنین ھذا رحمۃ من ربی فاذا جاء وعد ربی جعلہ دکاء وکان وعد ربی حقا۔ قول من جانبہ لا قرینۃ علیٰ جعلہ من اشراط الساعۃ ولعلہ لا علم لہ بذلك وانما اراد وعد اللہ بکا کہ فاذن قولہ تعالیٰ بعد ذلك وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض للاستمرار التجددی نعم قولہ تعالےٰ حتی اذا فتحت یاجوج وماجوج وھم من کل حدب ینسلون۔ ھو من اشراط

اور یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول "ھذا رحمۃ من ربی الآیۃ" اس کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ سیاق وسباق میں ایسا موجود نہیں ہے جس سے سد کے ریزہ ریزہ ہونے کے واقعہ کو علامات قیامت میں سے شمار کیا جائے اور شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ ہو کہ اشراط ساعت میں سے خروجِ یاجوج وماجوج بھی ہے اور اس نے "وعد ربی" سے صرف اسکا کسی وقت میں ٹوٹ پھوٹ جانا مراد لیا ہو۔ پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "ہم نے کر چھوڑا اُن کو اس دن سے اس حالت میں کہ بعض بعض پر اُمنڈ رہے ہیں" استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر ایسا ہوتا رہیگا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوتے رہیں گے حتی کہ خروجِ موعود کا وقت آجائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو کہ سورۂ انبیاء میں ہے "حتی اذا فتحت" تو البتہ یہ بلاشبہ

الساعۃ لکن لیس فیہ للسد	علاماتِ قیامت میں سے ہے لیکن اس میں سد کا قطعاً
ذکر فاعلم الفرق الخ (ص۲۰۰)	کوئی ذکر نہیں ہے پس اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے؛

اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

واعلم انّ ما ذکرتہ لیس تاویلاً فی	اور یہ یاد رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ
القرآن بل زیادۃ شئ من التاریخ	کہا ہے وہ قرآن میں تاویل نہیں ہے بلکہ قرآنِ عزیز
والتجربۃ بدون اخراج لفظۃ	کے کسی لفظ کو اس کے اپنے موضوع سے نکالے بغیر تاریخ
من موضوعہ الخ (ص۲۰۴)	اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہارِ حال ہے۔

عام مفسرین نے بیان کردہ تفسیر سے الگ سورہ کہف اور انبیاء دونوں کی آیاتِ متعلقہ کے واقعات کو اشراطِ ساعت میں شمار کرتے ہوئے جو تفسیر فرمائی ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے سامنے ترمذی اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے جسکا ترجمہ یہ ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یاجوج و ماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد کو کھودتے رہتے ہیں۔ اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوجاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کرو اب یہ اس قابل ہوگئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے مگر جب وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اصلی حالت سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں، یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہوجائیگا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوگا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودینگے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہوگا تو کام لینے والے کام کرنیوالوں سے کہیں گے اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ تم اس کو کھود کر برابر کرسکو گے اور آج چونکہ انشاء اللہ کہدیا اسلئے کل جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت کو درست پائیں گے اور اسوقت وہ باقی محنت کرکے سد کو گرادینگے اور لوگوں پر نکل پڑینگے اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ

ان کے خوف سے قلعوں اور پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے پھر وہ دنیا کو مغلوب سمجھکر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالم بالا سے جنگ کر کے اسکو مغلوب کریں اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کریگا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالم بالا پر بھی غالب آگئے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں گلٹیاں پیدا کر دیگا جس سے وہ سب خود بخود مر جائیں گے"۔

(ترمذی سورہ کہف)

مگر ترمذیؒ نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ

هذا حديث حسن غريب انما نعرف من هذا الوجه مثل هذا۔ — یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اس طریقہ سند سے ایسی ہی اچھنبی باتیں جانا کرتے ہیں۔

یعنی ان کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اچھنبی روایت ہے۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں۔

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اچھنبا) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرنا غلط ہے، اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبارؒ سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے "جو کہ اکثر کعب احبارؒ سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے" اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر بیان کیا ہوگا جس کو نیچے کے راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امام حدیث احمد بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص۱۰۵)

ترمذیؒ ابن کثیر اور امام احمدؒ کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی

قصہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی لہٰذا مفسرین کا محض اس اس روایت کی بنا پر سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کرنا کہ "سدِ ذوالقرنین" ٹھیک اس وقت ریزہ ریزہ ہوگی جبکہ اشراطِ ساعت میں سے موعود خروجِ یاجوج و ماجوج پیش آئیگا صحیح نہیں ہے۔

اور اگر ان کی تفسیر کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو پھر بھی وہ مذکورہ بالا روایت کے تسلیم کر لینے کے بعد قرآنِ عزیز کی آیت کے تعارض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے اس لئے کہ قرآنِ عزیز (کہف) میں سد کے متعلق ذوالقرنین کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے "فما اسطاعوا ان یظھروہ وما استطاعوا لہٗ نقبا" اور اس کا مطلب تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ بیان کیا ہے کہ یاجوج ماجوج اس سد میں کسی قسم کے ردوبدل پر قادر نہیں ہیں۔ چنانچہ امام احمدؒ اور ابنِ کثیر اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

انھم لم یتمکنوا من نقبہ ولا نقب شیٔ منہ۔	بلاشبہ اب یعنی بنا رسد کے وقت یاجوج و ماجوج اس میں سوراخ کرنے یا کسی حصہ کو بھی کھودنے پر قادر نہیں رہے۔

تو اب مفسرین اس روایت کے ان جملوں کے تعارض کو کس طرح دور فرمائیں گے جن میں یہ صراحت ہے کہ وہ اُس کو کھود کر یا چاٹ کر گرنے کے قریب کر دیتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اس صحیح حدیث کے تعارض کو کس طرح دور کریں گے جس کو امام بخاریؒ نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوابِ راحت سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرۂ مبارک سرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے لا الٰہ الا اللہ ویل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم من ردم یاجوج و ماجوج مثل ھذا وحلق قلت یارسول اللہ انھلک و فینا الصالحون؟ قال نعم اذا کثر الخبث۔

لا الٰہ الا اللہ عرب کیلئے ہلاکت ہے اس شر سے جو قریب آرہا ہے آج یاجوج و ماجوج پر قائم شدہ "سد" اسقدر کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھکر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا۔ حضرت زینبؓ بنت

جحش فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے جبکہ ہم میں صالحینِ امت بھی موجود ہوں گے ارشاد فرمایا بیشک ایسا ہوگا اگر امت میں خبائث کی کثرت ہو جائیگی۔ (بخاری و مسلم عن الزہری باب الفتن)

اس روایت میں تو یہ تصریح ہے کہ آپنے ارشاد فرمایا کہ "سدّ" میں حلقۂ انگشت کی مقدار میں سوراخ ہو گیا ہے اور مفسرین کی تفسیر کے مطابق قیامت کے موعود وقت سے قبل یہ ناممکن ہے۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ اس صحیح بلکہ اصح روایتِ حدیثی میں "فتح" سے مراد شر اور فتنوں کا شیوع مراد ہے اور اس کو استعارہ کے طور پر "فتح روم" کہدیا گیا تو سورۂ انبیا کی آیت میں "فتحت" کے معنی میں یہ اصرار کیوں ہے کہ اس سے سدّ ٹوٹ کر کھلنا مراد ہے حالانکہ اس جگہ روم یا سدّ کا تذکرہ تک نہیں ہے۔ کیوں نہ اس سے بھی استعارہ مراد لیا جائے۔

اور اگر حدیث میں حقیقی نقب کا ذکر ہے تو یہ سورۂ کہف کی اُس تفسیر کے خلاف اور معارض ہے جو مفسرین نے عام طور پر بیان کی ہے کہ سدّ کا یہ استحکام قیامت کے موعود وقت تک یونہی رہیگا اور سدّ کا اس سے قبل ٹوٹنا پھوٹنا ناممکن ہے۔ (باقی آئندہ)
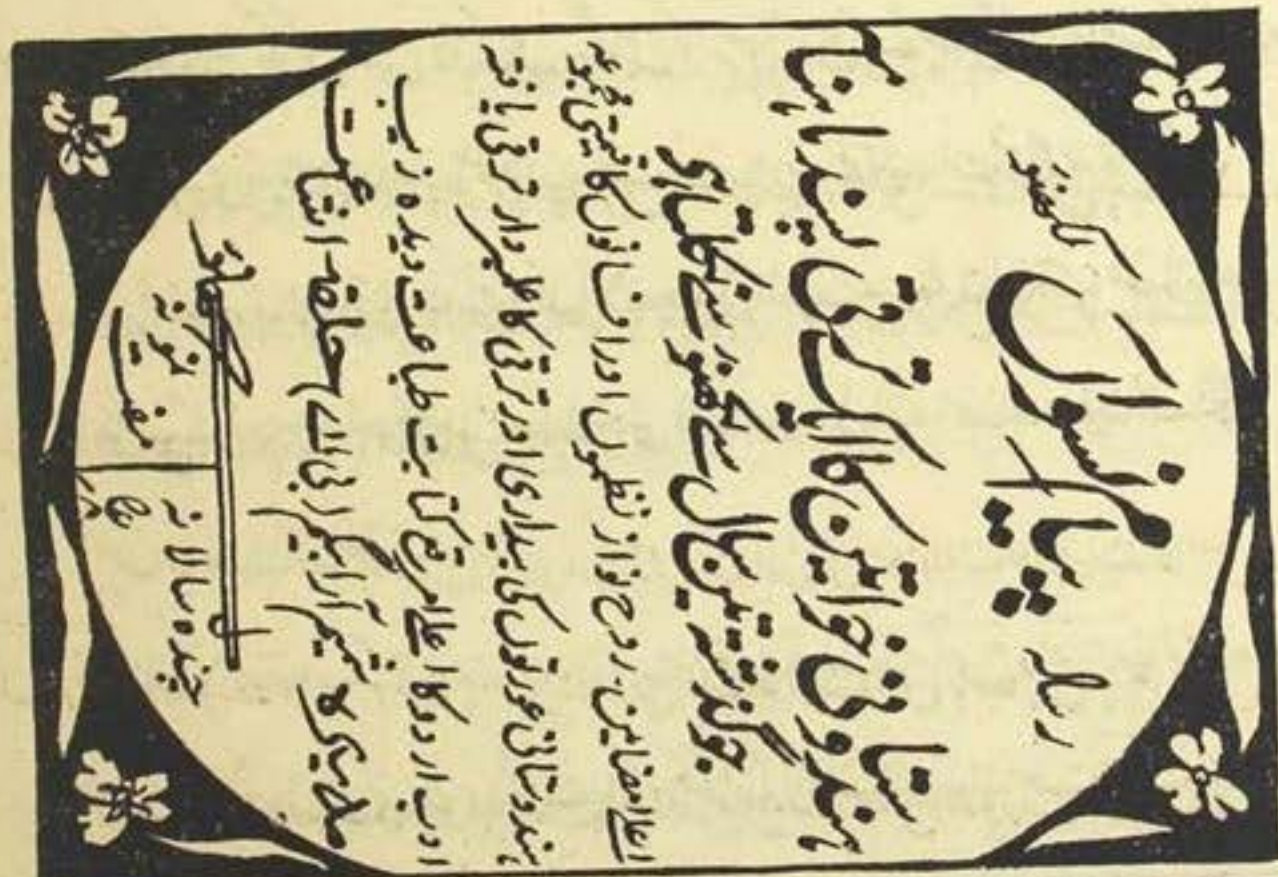
پہلا انسان اور قرآن

(از جناب مولوی سید حسین صاحب شور ایم۔ اے (عثمانیہ)

ذیل کا تحقیقی مقالہ جناب مولوی سید حسین صاحب نے اسوقت مرتب کیا تھا جبکہ آپ ایم۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہو کر جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے زیرِ نگرانی شعبۂ دینیات میں ریسرچ کا کام کر رہے تھے اس مقالہ میں قرآنِ مجید میں قصۂ آدم سے متعلق متفرق مقامات پر جو آیات آئی ہیں ان میں سے اکثر کو پیشِ نظر رکھکر نظریۂ "انسانِ اول" پر ایک خاص نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔ ہم جناب مولانا گیلانی کے بدل سپاس گذار ہیں کہ آپ نے ازراہِ اخوتِ علمی و مہربانی یہ مقالہ برہان میں اشاعت کیلئے عنایت فرمایا ہے۔ (برہان)

علماءِ مغرب کے اس اختراعی فرضیہ نے کہ "ہر فرد اپنی نوع کا ایک مختصر نمونہ ہے" "انسانِ اول" کے متعلق بھی وہی سوالات پیدا کر دیئے ہیں جو کسی عام آدمی کے متعلق پیدا ہوتے ہیں یعنی ہم جب کسی عام آدمی کے حالات لکھنا چاہتے ہیں تو ابتداءً ان امور کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ شخص کب پیدا ہوا؟ کہاں پیدا ہوا؟

سمجھا جاتا ہے کہ پہلے آدمی کی زندگی میں بھی ان ہی سوالات کو اہمیت حاصل ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جاوے تو "عام آدمی اور پہلے آدمی" کے حالات اس باب میں باہم بالکل مختلف ہیں مختلف تاریخی اسباب و وجوہ کی بنا پر عام انسانوں کے متعلق ضرورت ہوتی ہے کہ دریافت

کیا جاوے کہ وہ کن لوگوں میں پیدا ہوا! کس ملک میں پیدا ہوا؟ کس زمانہ میں پیدا ہوا؟ ان ہی سوالوں کے جوابات ہمارے سامنے ان گوناگوں تعلقات کو روشنی میں لاتے ہیں جن کا جاننا کسی عام آدمی کے حالات کے علم کے لئے لابدی ہے لیکن وہ آدمی جو آدمی نہیں بلکہ ابھی صرف آدم تھا اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں تھا ابھی اس کی زندگی میں اتنی بساطت و وحدت تھی کہ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے تاریخی اور جغرافیائی تعینوں کی اسکے متعلق نہ ضرورت تھی اور نہ اسکا کسی واقعہ کی تشریح پر اثر پڑتا ہے ہم ایک معمولی شخص کے متعلق جب یہ جانتے ہیں کہ وہ دہلی میں مثلاً ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہمارے سامنے معلومات کا عظیم الشان ذخیرہ بے نقاب ہو جاتا ہے مثلاً یہ کہ اس شخص کے زمانہ میں کون بادشاہ تھا؟ اس کی حکومت کیسی تھی؟ اس کے امراء کیسے تھے؟ اس عہد میں علوم و صناعات کے کون کون ماہرین دہلی میں رہتے تھے؟ دیکھنے میں تو سنِ ولادت اور مقام ولادت ایک معمولی سی بات ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام انسانوں کے حالات کی دراصل یہی دو کنجیاں ہوتی ہیں کہ اگر کسی شخص کے متعلق ہمارے پاس یہ دو کنجیاں نہ ہوں تو گویا ایسے آدمی کے اکثر حالات پر پردہ پڑا رہ جائیگا۔

اس کے مقابلہ میں عام آدمیوں کے متعلق یہ سوالات کہ وہ کس طرح پیدا ہوا؟ نہ صرف غیر ضروری بلکہ ایسا سوال ہے جس کا جواب سوال سے پہلے ہر شخص کو معلوم ہے۔ ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ کسی قسم کا بھی آدمی ہو کسی میدان کا مرد ہو عالم ہو یا صوفی۔ بطل ہو یا سپہ سالار۔ بادشاہ ہو یا وزیر۔ صناع ہو یا کوئی اور پیشہ ور، سب کی پیدائش کا طریقہ واحد ہے ان میں سے ہر ایک ماں باپ کے عام طبعی تعلقات کی بناء پر وجود پذیر ہوتے ہیں۔

مگر اب اس سوال کو "انسانِ اول" کے متعلق اٹھاؤ اور دیکھو کہ فکری گردشوں کا کیا حال ہوتا ہے۔ وساوس و اوہام احتمالات و شقوق کے لکد کوب سے دل و دماغ میں کتنی ہل چل

پیدا ہوتی ہے اور پھر بھی یقین کی کوئی صحیح راہ متعین ہوتی نظر نہیں آتی۔

کوئی نہ تھا۔ نہ مرد تھے، نہ عورت، ایسی صورت میں کس طرح کیونکر یکایک یہ عجیب و غریب شخصیت رکھنے والی ہستی جس کا نام انسان ہے کائنات میں نمودار ہوئی اور نہ صرف انسان بلکہ کائناتی تکوّنات و موجودات کی ہر نوع کے متعلق یہی سوال پیدا ہوتا ہے اور ہر ایک میں تقریباً وہی "انڈا پہلے ہے یا مرغی" کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

اور جیسے کس طرح پیدا ہوا؟ کا سوال عام انسانوں کے متعلق بے قیمت اور غیر اہم ہے انسانِ اول کے متعلق سب سے زیادہ قابلِ بحث و تفتیش غور و فکر یہی ہے۔ اسی طرح کب پیدا ہوا؟ کہاں پیدا ہوا؟ کے سوالات عام انسانوں کے متعلق جتنی اہمیت رکھتے ہیں عجیب بات ہے کہ انسانِ اول کے متعلق اسی درجہ وہ غیر اہم ہیں۔

ایسے وقت میں جب دنیا میں کوئی نہ تھا ظاہر ہے کہ اس وقت انسان کی تاریخ کا کوئی باب ہی نہ کھلا تھا نہ سیاسی نہ مذہبی نہ علمی نہ کچھ اور۔ سنِ ولادت مقامِ ولادت کے جاننے کی ضرورت جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ ان ہی ابواب کے ساتھ اس شخص کے تعلقات کی تشریح کے لئے ضرورت ہوتی ہے جس پر ہم بحث کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن جب کوئی نہ تھا۔ صرف پہلا آدمی پیدا ہوا۔ کسی وقت بھی پیدا ہوا صبح میں پیدا ہوا یا دوپہر میں۔ جنوری میں اس کی ولادت ہوئی یا مئی میں۔ آج سے دو ہزار برس پیشتر پیدا ہوا ہو یا دو لاکھ سال پیشتر۔ انسانِ اول کے متعلق یہ سارے سوالات غیر ضروری اور دور از کار ہیں۔ اس سے کسی تاریخی مسئلہ کے سلجھانے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ یہی حال مقامِ ولادت کا ہے۔ پہلا آدمی ایشیا میں پیدا ہوا یا یورپ میں ہند میں پیدا ہوا، یا سندھ میں بجز اس کے کہ اس سوال کے فرضی جواب کو ایک جھوٹے وطنی افتخار کا ذریعہ بنایا جائے اس کے سوا اس کا کیا حاصل؟ انسانیت کا ظہور

کسی خطہ میں ہوا ہو۔ کسی زمانہ میں ہوا ہو۔ اس کے فرائض وحقوق پر ان سوالات کے حل سے کیا اثر مرتب ہوتا ہے۔ کہ آدمی بہرحال آدمی رہتا ہے خواہ وہ الہ آباد میں پیدا ہوا یا کلکتہ میں اور خواہ اس کی ولادت مارچ میں ہوئی ہو یا اگست میں۔ رات کو پیدا ہوا ہو یا دن کو، واقعات تو یہ ہیں۔

مگر کیا کیجئے اسی غلط فرضیہ نے جس کا ذکر میں نے ناصیۂ مضمون میں کیا ہے تقریباً ہر زمانہ میں ہر قوم نے بلکہ شاید ہر مذہب کے پیروؤں نے اور اگر زیادہ تفحص سے کام لیا جائے تو تقریباً ہر علم والوں نے چاہا ہے کہ باوجود غیر ضروری ہونے کے انسانِ اول کے متعلق کب اور کہاں پیدا ہوا؟ کا سوال اٹھایا جائے اور باوجود اس یقین کے کہ جس راہ سے وہ ان سوالوں کے جوابات حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کا صحیح جواب قطعی طور پر نہیں مل سکتا۔ لیکن رائیگاں کوششوں کا ایک سلسلہ ہے جو طوفان کی طرح ہر زمانہ میں اُٹھتا رہتا ہے اور اترتا رہتا ہے ابتدا میں ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں اور آخر میں پھر مایوسی کا اعلان اس پرندے کی طرح کر دیا جاتا ہے جو وسیع سمندر کی فضا میں اُڑتے اڑتے بالکل تھک کر ڈوبنے کے لئے اپنے بازو پھیلا دیتا ہے یہ لوگ بھی اعتراف جہل کے گرداب میں غرق ہونے کیلئے اپنے آپ کو خود پیش کر دیتے ہیں۔

اساطیر الاولین (میتھالوجیون) میں کب اور کہاں؟ کے سوالات کے جتنے جوابات دیئے گئے ہیں اگر مختلف اقوام اور امتوں کے پارینہ قصوں سے ان کا انتخاب کیا جائے تو اس سے دفتر تیار کئے جا سکتے ہیں۔ مسٹر ڈیانہ نے اپنی مشہور کتاب "یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ "دنیا میں کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق کسی نہ کسی نے انسانیت کی ابتداء وظہور کا دعویٰ نہ کیا ہو۔"[1]

---

[1] کتاب مذکور صفحہ ۳۶۔

علماء یہود و نصاریٰ نے توریت کے باغ عدن ہی کی تشریح میں جو خیال آرائیاں کی ہیں اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جب اس مسئلہ کے متعلق ایک دعوے کی تشریح نے یہ گوناگونی اختیار کی ہے تو پھر مختلف قوموں اور ملکوں کے مختلف دعووں کی موشگافیوں نے کیا رنگ اختیار کیا ہوگا۔ مسٹر رڈپاتھ نے علماء یہود و نصاریٰ کی تشریحات عدن کے متعلق لکھا ہے

"بعضوں نے کہا ہے کہ یہ (باغ عدن) چوتھے آسمان پر ہے بعضوں نے کہا کہ طارق القمر یا مدار القمر میں ہے بعضوں کا خیال تھا کہ چاند ہی میں ہے۔ کچھ لوگوں کی کوشش تھی کہ اس کو طبقۂ اعلیٰ میں ثابت کر دکھائیں۔ بعض محقق عدن کی جگہ اسی زمین میں بتلاتے تھے کچھ لوگ خطِ استوا کے نیچے۔ کبھی یہ جنت تاتار اور چین میں تجویز کی گئی۔ کبھی وادی گنگا میں کبھی لنکا میں سمجھی گئی لیکن اکثر فاضل ارض آرمینیہ ہی میں سرگرداں رہے۔"

لفظ فرات کی تصحیح کے لئے بعض اس کی تلاش میں صحرائے افریقہ پہنچے۔ عراق، عجم شام، پارس، عرب، بابل، عراق عرب، فلسطین بھی اسی اعزاز کے مستحق قرار دیئے گئے حال ہی میں بعض لوگ یورپ کی حمایت میں اٹھے ہیں۔" [1]

"مقام ظہور" کی چہ میگوئیوں کا ایک طرف یہ حال ہے اور بجنسہٖ بلکہ کچھ اس سے زیادہ ہی انسانِ اول کے "عہدِ ظہور" کے متعلق کچھ کم بوقلمونیاں نہیں ہیں۔

ایک طرف "مشرق" خصوصاً ہندوستان کے ریاضیاتی مزاج والے بزرگوں نے اپنی ساری مکانی تنگ نظریوں کے ساتھ اس مسئلہ میں جس وسیع المشربی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ صفروں اور نقطوں کے ان طویل پلٹنوں اور لمبی قطاروں سے ہوسکتا ہے۔ جن کا پڑھنے والا جب آخر میں پہنچتا ہے تو حافظہ سے ابتدائی عدد کا خیال ہی نکل جاتا ہے۔

---

[1] رڈپاتھ صفحہ ۱۰۳

دوسری طرف انتہائی سادگی کے ساتھ مغرب ایمان لاتا ہے کہ

"کائنات ۲۳؍اکتوبر ۴۰۰۴ء قبل مسیح اتوار کے دن پیدا کی گئی اور آدمؑ وحوا اس کے پانچ دن بعد ۲۸؍اکتوبر ۴۰۰۴ء جمعہ کے دن قبل مسیح پیدا کئے گئے"۔ [۱]

تاریک عہد میں نہیں بلکہ بیسویں صدی سے پیشتر یورپ کا ہر عیسائی باشندہ اس تاریخی حقیقت پر یقین کرنے کے بغیر "جنت" کا مستحق نہیں ہو سکتا تھا اگرچہ حال میں غیر دینی جماعت کے محققین نے تورات و انجیل کی اس تاریخی یقین کے راز کو طشت ازبام کرتے ہوئے علماء یہودِ و نصاریٰ کی اس تحریفی فطرت کی زبردست شہادت پیش کی ہے جس کا اعلان سب سے پہلے عرب کی وادی میں "امتِ امیہ" کے "نبی امی" (فداہ ابی وامی) صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا پروفیسر رڈپاتھ اپنی مشہور تاریخ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ میں بائبل کے اس سنینی عقیدہ کی حقیقت یوں درج کرتے ہیں۔ پہلے انھوں نے علماء یہود کے متعلق لکھا ہے۔

"آٹھویں صدی قبل مسیح میں یہودیوں کو تعینِ سنین کا خبط ہوا لیکن تورات کے تینوں نسخے یعنی عبرانی، کلدانی، یونانی میں بڑا اختلاف تھا۔ بہرحال ان تمام نسخوں کے اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے جو فیصلہ کیا اس کا حاصل یہ ہے کہ "آغازِ عالم کا قریب سے قریب وقت تین ہزار چار سو تراسی سال اور بعید سے بعید وقت چھ ہزار نو سو چون قبل مسیح ہے"

یہ تو علماءِ یہود کے تحریفی خبط کا نتیجہ ہے علماءِ نصاریٰ اپنی آواز کو خدا کی آواز بتانے میں جس درجہ چابک دست ہیں اس کے متعلق پروفیسر موصوف ہی کا بیان ہے کہ

"سترہویں صدی کے وسط میں اسقف اعظم جیمس اشر نے ان ہی اعداد سے ایک متفق علیہ سن نکالنے کا عزم کیا اور نہایت عجیب بات ہے کہ اس کا نتیجہ مغربی قوموں کے اعلیٰ و ادنیٰ

---

[۱] یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ صفحہ ۲۳۴۔

سب لوگوں میں مستند مانا گیا۔"

حال ہی میں علمی تحقیقات جیمس سن کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہے مگر اب تک یورپ اور امریکہ کے عوام الناس پر اس کا بے انتہا اثر ہے کیونکہ یہ انجیلِ مقدس کے تعین اوقات سے ماخوذ ہونے کا مدعی ہے۔

خدا جانے کیوں کر اور کس طرح وہ تاریخیں جو جیمس صاحب نے تیار کی تھیں نئے اور پرانے عہد نامے کے تمام نسخوں کے حاشیوں پر لکھ دی گئیں اور جب ایک دفعہ ان کو وہاں جگہ مل گئی تو سیدھے سادے کم علم آدمیوں کے لئے ان کا نکالنا آسان نہ تھا بالآخر اس کا رواج عالمگیر ہوگیا۔ اٹھارہویں صدی اور نصف انیسویں صدی تک تمام مورخین ابتداءِ عالم کے واقعات کو اسی سن سے شمار کرتے ہیں۔

انجیل کے تمام نسخوں کے حاشیوں پر اب تک یہ تاریخیں بدستور لکھی جاتی ہیں اور عوام یہی جانتے ہیں کہ یہ تاریخیں بھی اسی کی لکھی ہوئی ہیں جس نے خود کتاب انجیل لکھی ہے۔"[1]

اس کے بعد ان مسلمات سے کہ انسانوں کی دستی تحریریں اس زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار ڈھائی ہزار برس پیشتر تک کی ملتی ہیں جیسا کہ رڈیانہ ہی لکھتا ہے۔

"یہ مسلم ہے کہ اس قسم کی تحریریں چینیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پندرہ سو برس پیشتر اور آریاؤں میں دو ہزار برس پیشتر اور وادیٔ فرات کے رہنے والوں میں اکیس سو برس پہلے موجود تھیں اور مصر کی یادگاریں اب تک کھڑی کہہ رہی ہیں کہ ہمارے بنانے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ڈھائی ہزار برس پہلے فن تحریر اور انشاء پردازی میں یگانۂ آفاق اور استاذِ زمانہ تھے بنی اسرائیل کے پیغمبروں اور شاعروں نے بھی آٹھ سو برس پہلے اپنی باتوں کو شاعرانہ اور نیم تاریخانہ رنگ دیا تھا

[1] یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ صفحہ ۱۰۴ مصنفہ پروفیسر رڈیانہ۔

اور یونانیوں میں پانچسو برس پہلے ہیرڈوٹس نے فنِ تاریخ نویسی کی ابتدا کی اور اسکے بعد
ہنیوس ڈاڈہر نے اس کو مکمل کیا جو حسنِ ادا اور طرزِ بیان کے لحاظ سے اب تک بے نظیر ہیں" [۱]

اور صرف یہی نہیں کہ قدیم عہد کی یہ تحریری یادگاریں آثارِ قدیمہ کی تلاش کرنے والوں کو مل رہی ہیں بلکہ بقول رڈپاتھ

"دور دراز ملکوں میں قومیت کے لحاظ سے بالکل الگ الگ لوگوں میں اور زبانوں کی حیثیت سے
سرتاپا مختلف زبانوں میں ڈھائی ہزار سال سے چار ہزار برس تک کی پرانی تاریخی تحریریں پائی جاتی ہیں"

ظاہر ہے کہ پہلے فنِ کتابت سے انسان کا آشنا ہونا پھر اس کا تدریجی ارتقار کے مراتب طے کرکے انشائی نزاکتوں کی منزلوں تک پہنچتے پہنچتے انسان کو کتنی دیر لگی ہوگی پھر ایک قوم کے علوم وفنون کا دوسری قوموں تک پہنچنا اس کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی اور یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ" اگر ہم تمام نوعِ انسانی کو متحد الاصل اور ایک ماں باپ کی اولاد سمجھتے ہیں تو ہر شخص خیال کرسکتا ہے کہ اس کے تمام افراد روئے زمین کے مختلف براعظموں میں پھیل جائیں اور براعظم بھی ایسے جن کے بیچ میں اکثر ناپید اکنار سمندر اور فلک فرسا پہاڑ ہیں۔ جب ہم ان دور دراز ملکوں اور ان کے راستوں اور دشوار گذار ناہمواری اور ابتدائی قوموں کی پیادہ پائی اور آہستہ روی پر نظر ڈالکر ان مختلف باشندوں کی عادات واطوار کی مشابہت اور ان کے مدارج ترقی کی یکسانیت کو دیکھتے ہیں۔

تو ابتدار انسانیت کی بے انتہا قدامت ہم کو حیران کر دیتی ہے اور ہم اس طول طویل زمانے کے تصور سے عاجز رہ جاتے ہیں جو ابتدائی آدمیوں کو اپنے مشترکہ مکان سے چل کر ان تمام ملکوں میں پھیل جانے کے لئے ضروری ہوگا جہاں آج ان کے مٹے ہوئے نشانات بوسیدہ

---

[۱] دیکھو رڈپاتھ کی تاریخ ابوالبشر صفحہ ۶۶ مترجمہ مولوی انوار الحق بھوپالی۔

ہڈیاں طبقات الارض کے گود سے نکل نکل کر دنیا کو اپنی قدامت اور بزرگی کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔[۵۱]

الغرض دلائل و براہین کی زد میں اکثر علمار یہود و نصاریٰ کی وہ ساری تحریفی کارروائی جو خواہ مخواہ تعینِ سن کے متعلق عمل میں آئی تھی خود ان ہی مذاہب کے محققین کے ہاتھوں برباد ہوگئی اور بالآخران لوگوں کو بائبل کی سنین کے متعلق لکھنا پڑا کہ "یہ ساری باتیں پرانے زمانوں کی تاریکی اور جہالت کا خیال تھا"۔[۵۲]

لیکن جن کے بزرگوں نے مذہب و دین کے نام سے صدیوں انسان کو اپنے اختراعی تحریفات کے جال میں پھنسائے رکھا تھا ان کے وارثوں اور جانشینوں نے آغازِ انسانیت کے متعلق کہاں؟ اور کب؟ کے دوراز کار ممنوع الادراک سوالوں کے من مانے خود تراشیدہ جوابات سے کیا انسانی دل و دماغ کو آزادی بخشی؟

یورپ کے یہی مدعیانِ تحقیق ایک طرف تو ببانگِ توپ وطبل اسکا اعلان کرتے ہیں کہ

"ان لاانجل ناممکن التحقیق سوالوں کے جوابات کے متعلق تاریخ طبعاً خاموش ہے کہ کسی آدمی نے انسان کو دنیا میں آتے ہوئے نہیں دیکھا ابتدائی آدمی نے خود اپنے حالات کسی کاغذ یا پتھر پر نقش نہیں کئے۔ کوئی یادگار بھی ایسی نہیں ملتی جس سے ابتدارِ ظہور انسان کا پتہ چلے اس لئے کسی کی کوشش اس زمانہ کی تاریخ لکھنے میں مفید اور بارآور نہیں ہوسکتی"۔[۵۳]

لیکن "کسی کی کوشش" جس مسئلہ میں بارآور نہیں ہوسکتی بے ثمری کے اس انتہائی یقین کے باوجود پھر ان ہی دینی تحریف کے چابک دستوں کے وارثوں کو دیکھا جاتا ہے کہ مذہب و دین کی عبا اتار کر علم و تحقیق کے سوٹ میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ جس

---

۵۱ کتاب مذکور ص ۵۹ ۵۲ کتاب مذکور ص ۳۴

۵۳ ہسٹری آف دی ورلڈ رٹیانیہ ص ۱۰۳

چیز کے جاننے کیلئے انھوں نے قدم اٹھایا ہے علم کے معمولی ذرائع یعنی عقل وحواس سے ان کو نہیں جان سکتے۔ پھر بھی دینی نہیں تو علمی تحریفات کا ایک طویل وعریض جال بچھا دیتے ہیں۔ وہی یورپ جو آج سے سو برس پیشتر دین کے نام سے آغازِ انسانیت کی تاریخ ومقام کے جاننے کا مدعی تھا اب علم کے نام سے پھر اسی کے جاننے کا مدعی ہے جس کے متعلق یہ بھی جانتا ہے کہ علم کی کسی راہ سے اُسے کسی طرح وہ جان نہیں سکتا۔

ان کے پیشرو تو صرف ایک فرضِ کاذب کے مدعی بن کر اپنے خیال میں صادق نتائج پیدا کرتے تھے یعنی جو بات خدا نے نہیں بتائی تھی کسی ترکیب سے انھوں نے اپنے عوام کو باور کرا دیا تھا کہ یہ خدا ہی کی بات ہے اس جھوٹ پر انھوں نے اپنے نتائج کی بنیاد قائم کی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان کا پہلا فرضی مقدمہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد ان کے نتائج کے متعلق شک کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ خود انسان اپنی ابتدار کی تاریخ نہیں بتا سکتا جیسا کہ رڈپاتہ نے لکھا ہے۔

> "کوئی شخص اپنی پیدائش کا حال خود نہیں جانتا کوئی بچہ اپنے دنیا میں آنے کے حالات آیندہ لوگوں کی اطلاع اور دلچسپی کے لئے قلم بند نہیں کرتا۔ یہ خیال محال ہے بے خبر آدمی اپنی بے خبری کا حال کیا لکھے گا۔" [1]

اس باب میں یقیناً انسانِ اول کا بھی یہی حال ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ مگر جن باتوں کو خود انسان نہیں بتا سکتا تو کیا انسان کا بتانے والا بھی نہیں بتا سکتا بلکہ سچ یہ ہے کہ انسان کے صحیح حالات وہی ہو سکتے ہیں جو خود اس کا پیدا کرنے والا بتائے پس اگر ان کے اسلاف کا یہ بیان صحیح ہوتا کہ انجیل کے حاشیہ پر جیمس اشر نے جو کچھ درج کر دیا ہے وہ انجیل کے باہر کی نہیں بلکہ

[1] کتاب مذکور صفحہ ۸۵

اندر ہی کی چیز ہے اور محشیِ انجیل کی نہیں بلکہ مصنفِ انجیل کی ہے تو کم از کم ایک عیسائی کیلئے اس میں شک کرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ بہرکیف ان کے بزرگوں نے تو ایک جھوٹ سے سچے نتائج پیدا کرنے چاہیئے تھے مگر ان بزرگوں کے اخلاف اسی چیز کو "جو نہیں جانی جا سکتی" اس کے جاننے کیلئے جب اٹھے تو ایک فرض نہیں بلکہ مفروضات کا ایک انبار قائم کر دیا وہی لوگ جو ابھی کہہ رہے تھے کہ اس مسئلہ کے حل میں کسی کی کوشش بارآور نہیں ہو سکتی لہجہ بدل کر یکایک بولنے لگے کہ صرف مورخ ہی نہیں جس کے فن اور پیشہ کا یہ مسئلہ براہِ راست موضوع ہے بلکہ ایک ہیئت دان ایک جغرافیہ دان آثارِ قدیمہ کا عالم طبقات الارض کا ماہر، علم الاقوام کا طالب العلم گویا ہر فن اور ہر پیشہ کے آدمی اپنے اپنے فن اور اپنے اپنے پیشہ کے ذریعہ سے اس "انجانی حقیقت" کو بآسانی جان سکتے ہیں۔ دینی محرفین کے وارثوں کی علمی تحریف کی یہ پہلی قسط ہے، ان کے اگلے "دین" کے نام سے جھوٹ بولے، اور اب پچھلے علم و سائنس کے نام سے اسی جھوٹ کا اعادہ دوسرے پیرایہ میں کر رہے ہیں اس اعتراف کے بعد پھر وہی لوگ جو ہستی کے اس لامحدود جنگل کے ایک خاص وجود یعنی نوعِ انسانی کے آغاز و ابتدار کے جاننے سے اپنے کو بلکہ سارے بنی آدم کو مایوس کر چکے تھے۔ پوری کائنات کے طریقۂ آغاز وقتِ آغاز کے جاننے کے مدعی بن کر سامنے آگئے جن کے سامنے سے پہلا انسان موجودہ کائنات کا ابتدائی مادہ یا اسکی ابتدائی شکل اس طرح آگئی کہ گویا یہی اس عالم کے بنانے والے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہستی کا یہ سارا کارخانہ ان کی آنکھوں کے سامنے بنا ہے۔ اس سلسلہ میں نہ جاننے والوں نے جاننے کے متعلق کیا کیا دعوے کئے ہیں۔ اس کی تفصیل کہاں تک کر سکتا ہوں۔ بطورِ مثال کے صرف ان مفروضات کا ایک سلسلہ پیش کرتا ہوں۔ جو پروفیسر رڈپاتھ نے آغازِ انسانیت کی تاریخ علم و تحقیق کی رو سے معین کی ہے وہ کہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے۔

ابتدا میں کچھ نہ تھا صرف ایک سیال مادہ اور اس سیال مادہ میں حرکت تھی حرکت سے حرارت پیدا ہوئی اس گردش و حرکت کی وجہ سے اس سیال مادہ سے اجزا ٹوٹ ٹوٹ کر فضا میں پھیلے بالآخر بیچ میں ایک مرکز قائم ہو گیا اسی کا نام آفتاب ہے اور جو ٹوٹ ٹوٹ کر اجزا ادھر ادھر بکھرے تھے انھوں نے ستاروں اور مختلف کروں کی ہیئت اختیار کی اور ان ہی کروں میں ایک زمین بھی تھی۔ زمین ابتدا ہی سے آفتاب کے گرد بیضوی مدار پر گھوم رہی ہے جس کی وجہ سے زمین کبھی آفتاب کے قریب ہو جاتی ہے اور کبھی بعید۔ ابتدا میں زمین اور آفتاب کی کم سے کم دوری آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل تھی اور زیادہ سے زیادہ دوری یا نقطۂ تباعد نو کروڑ نوے لاکھ میل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابتدا میں زمین صرف برف سے ڈھکی ہوئی تھی پھر جیسے جیسے زمین کو آفتاب سے نزدیکی حاصل ہوتی رہی۔ اس کے برفانی پہاڑ پگھل پگھل کر دریاؤں ندیوں کی شکل میں بہنے لگے۔ بالآخر یہ دریا بھی خشک ہونے لگے پانی اترنے لگا اور یوں زمین کا حصہ ربع مسکوں ہویدا ہوا۔ اور بتدریج اس قابل ہوا کہ اس میں انسان بود و باش اختیار کر سکے پھر دوسرے علماء ہیئت کے حوالہ سے پروفیسر مذکور نے نقل کیا ہے کہ زمین کے ان سارے انقلابات کی تاریخ اگر معین طور پر معلوم کرنا چاہتے ہو تو حسب ذیل نقشہ پر ایمان لانا چاہیے۔

"زمین پر پہلا انقلابی واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے نو لاکھ پچاس ہزار برس پیشتر، دوسرا آٹھ لاکھ پچاس ہزار، تیسرا سات لاکھ پچاس ہزار، چوتھا چھ لاکھ، پانچواں پانچ لاکھ، چھٹا دو لاکھ پچاس ہزار اور تین لاکھ کے درمیان اور آخری انقلاب ایک لاکھ سال پہلے ہوا اس کے بعد جب وہ جاندار جو انسان کہلاتا ہے عالم یخ کے بعد اس وقت زمین پر آیا جبکہ اس کی سطح تودھائے برف سے صاف ہو کر قابل رہائش ہو گئی تھی۔ جبکہ برفانی دریا اپنی طغیانی کے بعد اتر چکے تھے اور بر اعظموں کی موجودہ صورت اور تقسیم قائم ہو چکی تھی"۔ [1]

[1] یونیورسل ہسٹری صفحہ ۳۲ مولفہ رڈپاتھ

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم ہیئت کی تحقیقات کے لحاظ سے طریق الارض کے تغیر و تبدل کو دیکھتے ہوئے آفرینشِ انسان کی ابتدا حضرت عیسیٰؑ سے تیس یا چالیس ہزار پہلے تک واقع ہوئی ہوگی۔[1]

اگرچہ "ہوئی ہوگی" کے احتمالی صیغہ نے بجائے علم کے اس دعوے کو صرف ایک عقلی احتمالی کی سرحد تک دھکیل دیا لیکن جیسا کہ وہ بات جو بائبل کے حاشیہ پر چڑھ گئی پھر اس کا وہاں سے اتارنا آسان نہیں ہے۔ آج بھی جو بات کسی علم کے ذخیرے میں کسی نہ کسی طرح سان دی جائے تو عوام الناس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ بجائے یقین و ایمان کے، اس کے ساتھ صرف گمان غالب کا تعلق رکھیں گویا وہ فریب جو پہلے مذہب کے نام سے دیا جاتا تھا آج سائنس اور علم کے نام سے وہی شعبدہ بازیاں کھیلی جارہی ہیں۔ اور جب تک جھوٹے علم کا راز واضح نہ ہوگا۔ جس طرح جھوٹے مذاہب کی حقیقت لوگوں پر کھل چکی ہے یہ حال یوں ہی باقی رہیگا۔ کسقدر عجیب بات ہے جب یہ مسلمہ ہے کہ "کسی آدمی نے انسان کو دنیا میں آتے ہوئے نہیں دیکھا اور اس لئے کوئی صحیح بات انسانی آغاز کے متعلق نہیں کہی جاسکتی لیکن جس آدمی نے انسان کو دنیا میں آتے نہیں دیکھا کیا اس نے پوری کائنات کو عدم سے دائرہ وجود میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ اگر کوئی یادگار ایسی نہیں ملتی جس سے ابتدار ظہورِ انسان کا پتہ چلے تو جسکو عالم کے ایک معمولی جزو (انسان) کے ابتدارِ ظہور کا پتہ نہیں چلتا اسی جاہل کو تمام دنیا کے ابتدارِ ظہور کے متعلق کیا کوئی ایسی یادگار مل گئی ہے جس سے اس کے ابتدارِ ظہور کا پتہ چلتا ہو، اس نظریاتی تناقض کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ جزء کی ابتدار سے بے خبر رہنے والے کسقدر اطمینان سے کل کی ابتدار کی خبر کسقدر تفصیل سے دے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب کائنات کا وہ سیال "بخاری وجود یا ضبابی ہستی جس کے یہ لوگ مدعی ہیں اپنی اصل شکل میں تھی اسوقت

[1] یونیورسل ہسٹری صفحہ ۳۸ مولفہ رٹپاتہ۔

ان دعوؤں کے مدعی اپنے ہاتھ میں کاغذ و قلم لیکر موجود تھے اور ابتدائی حالات سے لیکر موجودہ وقت تک کے انقلابات کی مفصل تاریخ مرتب کر رہے تھے ابتدا میں یوں تھا پھر اتنے سال بعد یہ ہوا وہ ہوا تا ایں کہ دنیا موجودہ براعظموں کی شکل تک پہنچ گئی۔ شیخ چلّی کے خیالی مالیخولیا کے سوا اپنے اندر کوئی اور وقعت بھی رکھتی ہے؟ بے جانے ہوئے قدرتی قوانین کی تشریح جو ان مدعیانہ لہجوں میں کرتے ہیں اُن کے متعلق قرآن ان کو خدا پر جھوٹ باندھنے والا قرار دیتے ہوئے یہ پوچھتا ہے۔

ام کنتم شھداء اذ وصّاکم اللہ بھذا۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت خدا ان علوم کی تم کو وصیت کر رہا تھا۔

کہ اس بنیاد پر ابتدا سے لیکر اس وقت تک کی آپ نے ایک طویل فہرست بنالی ہے اور ہر انقلاب کا زمانہ معین کر لیا۔

صرف ایک علمِ ہیئت اور نجوم ہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں جن جن چیزوں کا نام علم ہے سب میں اس سوال کو اٹھایا گیا ہے اور جیسا کہ علمِ ہیئت والوں کے خیالات کی رو سے انسانیت کی ابتدا آج سے پینتیس ہزار سال پہلے معلوم ہوتی ہے اسی طرح طبقات الارض والوں کی تحقیقات سے پچیس ہزار سال پہلے معلوم ہوتی ہے اور تقریباً اسی قسم کے نتائج ارکیالوجی پلینٹولوجی انتھولوجی، انتھاگرافس۔ ہسٹری۔ الغرض عہد حاضر کے تمام لوجیات اور گرافیات کے بڑے بڑے پر رعب ناموں سے بنی آدم کو مرعوب بنا رہے ہیں۔ ہر ایک کے مقدمات کی ترتیب سے اس قسم کے تعینی نتائج پیدا کئے جا رہے ہیں جس طرح ان کے اسلاف نے۔ دین۔ مذہب مسیح، کلیسا۔ بائبل، خدا وغیرہ کے ناموں سے انسانی ذہنیت کو ایک مدت تک دبا رکھا تھا۔ کہنے والوں نے جس طرح پہلے بغیر کسی دغدغہ کے کہا تھا کہ ٹھیک تیس اکتوبر ۴۰۰۴ قبل مسیح

دنیا کی ابتدا ہوئی اسی طرح آج بھی کچھ لفظی ایرپھیر کے بعد گمان کے الفاظ سے یہ یقین دلایا جارہا ہے کہ فلاں مہینہ کے فلاں سن میں زمین آفتاب سے جدا ہوئی۔ فلاں مہینے میں فلاں سنہ تک اس کی حرارت بجھی پھر فلاں مہینے کے فلاں سنہ میں برف کے تودے قائم ہوئے اور یہ تودے فلاں سنہ میں دریا بن کر بہنے لگے پھر یہ دریا فلاں سنہ میں اترے اور اس کے بعد یہاں نسل انسانی کی نمود فلاں سنہ میں شروع ہوئی دین والوں پر علم کے مدعیوں نے قہقہہ لگایا لیکن ان قہقہوں کو آج کون روک سکتا ہے جو علم والوں پر تحقیق والے آج لگانا چاہتے ہیں، یا آئندہ یقیناً لگا کر رہیں گے۔

اذا انکشف الغبار فسوف یبدی افرس تحت فخذک ام حمار

جب غبار ہٹے گا تب کھلے گا کہ تمہارے زانو کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

حالانکہ ان مباحث کے چھیڑنے سے پہلے ان مسکینوں کو یہ سوچنا تھا کہ "انسانِ اول" کے متعلق ان سوالات کی اہمیت وقیمت کیا ہے۔ اگر ابتدا ہی میں اس "کاہ" کی حقیقت ان پر واشگاف ہوجاتی تو واقعہ یہ ہے کہ پھر اس "کوہ کندن" کی حاجت بھی نہ ہوتی لیکن موروثی عادتیں بدل سکتی ہیں مٹ نہیں سکتیں۔ تحریف وافترا جن کے بزرگوں کا قومی شیوہ ایک مدت تک رہا ہے ان کے اخلاف زیادہ سے زیادہ روک ٹوک سے الفاظ بدل سکتے تھے، لیکن معنی کی تبدیلی کی امید ان سے بیجا ہے اور انھوں نے یہی کیا ان کے بزرگ دین کے نام سے جھوٹ بولے مذہب کے نام سے انھوں نے اس جھوٹ کا پروپگنڈا کیا اور پچھلوں نے صرف دین کے لفظ کو کاٹ کر علم کا لفظ تراشا، پھر اس جھوٹ کو "سچ" کے نام سے وسوسہ کو فلسفہ کے عنوان سے، خرافات کو حقائق کی تعبیر سے دنیا میں پھیلا رہے ہیں جس طرح پہلوں کے لئے کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ بائبل کے متن اور حاشیہ میں تمیز کرتا اسی طرح پچھلوں کیلئے

کس کے پاس اتنا وقت ہے جو نتائج کی تنقیح مقدمات کو سامنے رکھکر کرے اور مقدمات کے متعلق یہ سوال اٹھائے کہ ان کا تعلق صرف تخمینہ اور عقلی دلائل اور فرض سے ہے یا مشاہدہ اور تحقیق سے کچھ دنوں تک پہلوں کا جھوٹ دنیا میں مذہب کی قوت لیکر پھیلتا رہا اور اب پچھلوں کا جھوٹ علم و سائنس کے وزندار الفاظ کی پشت پناہی میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے یہی لوگ ہیں جن کے ذریعہ سے تشابهت قلوبهم (یعنی ان کے قلوب باہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں) کی تفسیر ہمیشہ ہوتی رہیگی اور اتواصوا به بل هم قوم طاغون ۰ (یعنی ان باتوں کی (ان کے پہلوں نے پچھلوں کو) وصیت کی یا یہ سرکش قومیں ہیں) کا مصداق ان کی ہستیوں میں ملتا رہیگا۔

(باقی آئندہ)

مسئلۂ زبان اور ہندوستان

شرعی نقطۂ نظر سے

جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند

(۲)

اردو میں ہندی الفاظ و محاورات کے عمل دخل کی کوشش

آج سعی کی جارہی ہے کہ اس میں ہندی کے الفاظ و محاورات بھر کر موجودہ اردو کا جون بھی بدلدیا جائے اور ساتھ ہی لقب بھی اردو کے بجائے ہندوستانی کردیا جائے تاکہ آج کی اردو باقی نہ رہے بلکہ ایک نئی اردو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ آج کی اردو کی روح اسلامیت ہے اور نئی اردو کی روح ہندیت ہوگی جس کا نام ہندوستانی ہوگا۔ یعنی ہندوستانی کے پردہ میں سنسکرت محاورہ کا غلبہ اور ہندی کلچر کی ترقی ہوگا۔ چنانچہ ہندوستانی جس کلمہ کی تفسیر ہے وہ بقول مسٹر گاندھی کے "ہندی" ہے۔ انھوں نے اس نئی زبان کا نام ہی رکھا ہے "ہندی اتوا ہندوستانی" (ہندی یعنی ہندوستانی) اتوا کے معنی یعنی کے ہیں گویا ہندی کی تفسیر ہے ہندوستانی پس ہندوستانی کا مفسر اور متن ان کے اقرار سے ہندی نکلتا ہے جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اردو کو ہندی بنانے کی علانیہ سعی کی جارہی ہے چنانچہ گاندھی جی ہریجن اخبار میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"صرف ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی اس کا رسم الخط ہونا چاہئے۔"

(علیگڈھ میگزین ص ۳۲۸ بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۹ء)

مسٹر سمپورنانند سابق وزیر تعلیم یوپی جیسے ذمہ دار ایک جلسہ میں کہتے ہیں۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی جسکو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے ہمارے جنوبی ہندوستان کے رہنے والے آسانی سے سیکھ سکیں تو ضروری ہے کہ ہندی زبان میں ہم کافی تعداد میں سنسکرت الفاظ کا استعمال کریں۔" (علیگڈھ میگزین مذکور ص۳۲۸)

ہندوستانی کے چند دلچسپ نمونے

یہ ہندوستانی جو ملک کی مشترک زبان بنائی جارہی ہے اس نئے جون کے بعد کس روپ میں آئے گی؟ اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

"ہمارے پرستاؤ کی کھلی اوڑائی گئی پر نواب سمے آگیا ہے کہ ہندوستان اپنے بھاگیہ کا نرنے کرے" (مسٹر جے پرکاش نرائن جنرل سکریٹری کانگریس سوشلسٹ پارٹی)

"بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاری کے پرکھ سے تھا کانگریس کارشمی کے بھوت پوروسدے" (مہادیو نرائن ٹنڈن پردہان منتری کانگریس سوشلسٹ پارٹی آگرہ)

اس سبھا کا نیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو وہ بھی پر تیت ہوتے ہیں ایک میرا سلیقہ کار نہ ہونا اور اسلئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم (مسٹر گاندھی) (علیگڈھ میگزین مذکورہ ص۳۲۹ منقولہ از کتاب "ہندوستانی" مصنفہ دین محمد)

یہ وہی اردو ہے جو ہندی کے نام سے ملک کی قومی زبان بنائی جارہی ہے اور بمصلحت جس کی تفسیر سرِ دست ہندوستانی سے کی جارہی ہے. گویا اردو کی نوک پلک کاٹ کر اسے ایسے حقائق کا حامل بنایا جارہا ہے جن کا چولہ پھنکر یہ بد قسمت ملک آگے بڑھنے کے بجائے تین چار ہزار سال پھر پیچھے لوٹ جائے۔

اگر یہی اردو جس میں سے وہ عربی محاورے اور عربیت شعار کلمات نکالکر جن کے نمونے پہلے عرض کئے جاچکے ہیں اس میں یہ ہندی محاورے اور ہندی وضع قطع کے الفاظ داخل کرکے مسلم قومیت کے لئے تیار کی جارہی ہے تو کیا یہ فطری نتیجہ مسلمانوں کے سامنے بہت جلد نہ آجائیگا

کہ ان کے ذہنوں میں سے وہ اسلامی روح تو مضمحل ہو جائے جسے یہ عربی الفاظ سنبھالے ہوئے تھے اور وہ ہندی روح سرایت کر جائے جو ان نئے الفاظ کے راستے ان میں داخل ہو گی. اس کا حاصل وہی دورخی اور نفاق ہو گا کہ مسلمان نہ پورے اِدھر ہی کے رہیں نہ اُدھر ہی کے ہوں اور ثانیاً یہ ہو گا کہ وہ آخر کار انہی جدید الفاظ کے معانی کے ہمراز اور ہمنوا ہو کر اپنے اس مسلم لقب تک سے بیزار ہو جائیں۔

مسلم قومیت پر اس اردو نما ہندی کا کیا اثر ہو گا

پس اگر مسلم فتح ایران سے قبل فارسی کو مورثِ نفاق کہکر حضورؐ نے اسی نفاق اور پھر کلیتہً مدغم ہو جانے کی علت کی بنا پر عربی میں اس کے اختلاط اور اس کے تکلم کو ممنوع ٹھیرایا تھا جیسا کہ ابن عمرؓ کی حدیث سے واضح ہو چکا ہے تو آج بعینہ اسی علتہ کی بنار پر حدیث مذکور سے اردو جیسی اسلامی زبان میں ہندی کا اختلاط یا اس کے کلمات کا عمومی تکلم شرعاً کیوں ممنوع نہ ہو گا؟ اور جبکہ یہی قطع اختلاط معنیً حفاظتِ اردو ہے تو اسی حدیث کی رو سے اردو کی حفاظت بھی واجب ٹھیر جاتی ہے۔

نیز اگر سمار۔ عتمہ۔ راعنا۔ یثربہ وغیرہ کلمات کا تکلم اور داخل زبان رکھنا سابقہ آیات و احادیث میں محض اسلئے ممنوع قرار دیا گیا کہ ان کی نسبت اغیار کی طرف ہے اور وہ انہی کے مرکوزِ خاطر حقائق کے ترجمان ہیں تو اردو کے ذیل میں ہندی کلمات کا تکلم عام یا انھیں داخلِ زبان کرنا جبکہ ان کی نسبت بھی غیر مسلموں کی طرف ہے اور جبکہ وہ انہی کے مخصوص حقائق کے ترجمان ہیں کس طرح جائز ہو گا؟۔

نیز جبکہ کسی قوم کے لٹریچر قبول کرنے کا نتیجہ اس قوم کے حالات و خیالات کو علماً قبول کرنا ہوتا ہے تو ہندی محاورات و عنوانات کو اردو میں قبول کرنے والوں کے لئے ہندی والوں کے عام کیریکٹر سے راضی ہونے اور ان کے شریک عمل ہو جانے کا خطرہ کیا قریب نہ ہو جائیگا؟ اور اگر یہ

حالت شرعاً مذموم اور ممنوع ہے اور ضرور ہے تو یہ قبولِ محاورات کیوں ممنوع و ناجائز نہ ہوگا؟

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک قوم کو عجمی زبان یعنی فارسی میں قبل از فتح ایران گفتگو کرتے دیکھا تو فرمایا۔

مابال المجوسیۃ بعد الحنیفیۃ (اقتضاء الصراط المستقیم) یہ حنیفیت کے بعد مجوسیۃ کیسی؟

اسی سے واضح ہے کہ ایک لغت کو مستقل قومیت سے تعبیر کیا گیا ہے فارسی لغت کو مجوسیت کہا گیا ہے جو ایرانی ملت کا لقب ہے اور عربی زبان کو حنیفیت کہا گیا ہے جو اسلامی شریعت کا لقب ہے اِس سے نمایاں ہے کہ لغت ایک پوری زندگی ہے جس میں ملت ہونے اور ملت بنانے کی شان موجود ہے پس اس اثرِ فاروقی کی روشنی میں ہندی محاورات و لغات کا اردو میں اضافہ کیا ملّت ہندویت کا فروغ اور ملّتِ حنیفیت کا اضمحلال نہ ہوگا؟ اور کیا ایک اردو داں مسلمان کو ہندی کے محاورے استعمال کرتے دیکھکر بعینہٖ نہیں کہا جائیگا کہ مابال الھندیۃ بعد الحنیفۃ؟ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ فاروقِ اعظم کے اس ارشاد صریح کے ماتحت ہندی اردو کے اس اختلاط اور اردو کے اس ضیاع و فنا کو شرعاً ناجائز اور ناقابل قبول نہ کہا جائے؟

نیز لغت جیسے اہم قومی شعار میں اغیار سے توافق کر کے قطع نظر اس سے کہ اس توافق کے ذاتی اثرات وہ ہوں گے جو اوپر عرض کئے گئے ایک اہم مفسدہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے اس عظیم شعاری توافق کو سامنے رکھکر اغیار کو دوسرے ہندی شعائر میں بھی ان سے توافق کی طمع پیدا ہو گئی اور اس طمع کیلئے بھی لسانی توافق ان کے ہاتھ میں ایک بھاری حجت ہوگا پس اس حجت کو قطع کر دیا جانا خود اس کے ذاتی مفاسد کے علاوہ دوسرے مفاسد کی پیش بندی کے لئے بھی ایک شرعی فریضہ ہے چنانچہ تبدیلِ قبلہ کی بحث میں جبکہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ قبلہ بنایا گیا منجملہ اور مصالح کے قرآن نے یہ مصلحت بھی نصاً بیان فرمائی ہے کہ۔

لئلا یکون للناس علیکم   تم مسجد حرام کی طرف رخ کرو (تاکہ لوگوں (اہل کتاب)

حجۃ   کے ہاتھ میں تمہارے اوپر کوئی حجۃ باقی نہ رہے۔

کیونکہ مسلمانوں اور یہود میں اس قبلہ کے توافق و اشتراک سے اہل کتاب دوسرے امور میں بھی مسلمانوں سے توافق کی طمع باندھتے اور اسی قبلہ کے اشتراک کو حجّت میں پیش کرتے ہیں۔

اس دلیل سے زبان کے اس توافق کو جو ہندی اردو اختلاط سے پیدا ہو گا اس لئے بھی ممنوع و ناجائز قرار دیا جائے گا کہ کل کو یہی توافق دوسرے امور میں توافق کی طمع کیلئے حجت نہ بن جائے اور پھر مسلمان دوسرے اشتراکات میں بھی غیروں سے کوئی حیل حجت نہ کر سکیں جس کا انجام پوری اسلامی معاشرت کا خلط ملط ہو جانا اور انجام کار ختم ہو جاتا ہے۔

بہرحال ان نصوصِ مذکورہ اور وجوہات بالا کی رو سے اردو کا تحفظ جو آج ایک اسلامی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ہندی کے اختلاط سے بچاؤ کیا جانا جو ایک غیر مسلم قوم کی مخصوص زبان ہی قطعاً واجب و لازم ہوگا اور اس کی طرف سے تساہل بر تنافی الحقیقت ایک شرعی واجب میں تساہل کرنا ہوگا

ہمیں اس وقت ان مناقب و مثالب سے بحث نہیں کہ اردو خفیف اور ملکی زبان ہے اور ہندی ثقیل اور سخت۔ بلکہ نقطۂ بحث صرف یہ ہے کہ اردو اسلامیت و عربیت کی حامل ہے اور ہندی نہیں ہے اس لئے قبل اس کے کہ ہندی مفتوح ہو کر اسلامیت کی حامل بنے نہ ہم اُردو میں اس کا اختلاط ہی گوارا کر سکتے ہیں اور نہ خود مستقلاً اس کی ترویج و اشاعت ہی کو اپنے حق میں قبول کر سکتے ہیں اور اس لئے مسلمانوں پر بہر غیر اختلاط سے بچاتے ہوئے بہیئت کذائی ہی باقی رکھنا واجب ہو گا۔

ہمیں شکر گذار ہونا چاہئے ان انجمنوں کا جو آج سے بہت پہلے سے اردو کی حفاظت کیلئے کمربستہ ہوئیں اور اپنے مقدور بھر انھوں نے زبان اردو کو نہ صرف باقی ہی رکھا بلکہ اسکو اور زیادہ

معراج ترقی پر پہنچا دیا۔ جیسے انجمن ترقی اردو جسنے دولت ابد مدت حیدر آباد دکن حرسہا اللہ تعالیٰ کی زیر سرپرستی اردو کے تحفظ کی ساعی کو منظم طریق پر قائم کیا اس کی حد بندی کے لئے بہت سے مضبوط بند لگا دیئے۔ اور خصوصًا اعلیحضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بہادر فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ کی قدردانی، ادب نوازی اور علم دوستی کی بدولت اردو اور ادب اردو کو متمدن زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ عن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔

مسلمانانِ عالم کی مشترکہ زبان

ہاں مگر اسی کے ساتھ میں اس نقطہ کی طرف بھی توجہات منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ اردو کے بقاء و تحفظ کی یہ شرعی اور سیاسی ضرورت کتنی ہی اہم سہی مگر بہرحال ایک مقامی ضرورت ہے اردو کی حیثیت ہندوستان کیلئے وہی ہے جو ایران کیلئے فارسی کی افغانستان کے لئے پشتو کی، ٹرکی کے لئے ترکی کی، اور دوسرے اسلامی ممالک میں مقامی زبانوں کی ہے۔

اسلئے اردو سے ہندوستان کی تفہیمی ضروریات تو پوری ہو سکتی ہیں لیکن عالمِ اسلامی کی اجتماعی اور اشتراکی ضروریات کی تکمیل سے یہ زبان بھی اسی طرح عاجز رہ جائیگی جس طرح اوپر کی ذکر کردہ زبانیں اس لئے اردو کی مقامی ضرورت کو شرعی اور سیاسی مانتے ہوئے بھی عالمِ اسلامی کی وحدتِ زبان کا مسئلہ کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس ضرورت سے کسی حالت میں صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا کہ تمام عالمِ اسلامی کے لئے ایک مشترک اور جامع زبان درکار ہے جو ان کی مقامی زبانوں میں رُوح کی طرح سرایت کئے ہوئے ہو اور مسلمانوں کی ہر ایک زبان پر اس کا پورا پورا قبضہ ہو اور مقامی زبانیں اگر مسلمانوں کی جماعتوں کو مقامی بنا کر ٹکڑے ٹکڑے کردیں تو یہ مشترک زبان ان اوراقِ پریشان کی شیرازہ بندی کا ذریعہ ثابت ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صفت و شان کی ہمہ گیر زبان مسلمانوں کے لئے بجز عربی زبان کے دوسری نہیں ہو سکتی جو اللہ کی زبان ہے، قرآن کی زبان، فرشتوں کی زبان، اہلِ جنت کی زبان، اور مسلمانوں کے آقا و مولیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اوران کے مقدس صحابہ کی زبان ہے۔ اسلامی قانون اسی زبان میں ہے۔ اسلامی روایات اور اسلامی ذہنیت اسی کے فقروں میں اس طرح مستور ہے جیسے برگِ گل میں بوئے گل۔ اوراس لئے یہ زبان مسلمانوں کے لئے اسلامی نظامِ عالم کیلئے اوران کی پوری اجتماعی زندگی کیلئے ایک سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے کہ ان کا قانونِ حیات ہی اسی میں نازل ہوا ہے۔

وانہ لتنزیل من رب العالمین	یہ اللہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ جبرئیل
نزل بہ الروح الامین علی قلبک	امین اس کو لیکر آپ کے قلب پر اس لئے نازل
لتکون من المنذرین بلسان عربی	ہوئے ہیں کہ آپ واضح عربی زبان میں (اللہ کے
مبین ۰	عذاب سے) ڈرانیوالے ہوں۔

اوراسی لئے جس کو عربی بولنے پر قدرت ہے اس کیلئے بلاضرورت عجمی بولنا شریعت نے پسند نہیں کیا جیساکہ حدیث ابن عمرؓ اس بارہ میں گذر چکی ہے۔

اسی لئے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سرکاری فرمان میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو تحریر فرمایا تھا۔

امابعد تفقھوا فی العربیۃ واعربوا	امابعد عربی زبان میں سمجھ پیدا کرو اور قرآن کی
القرآن فانہ عربی (وفی روایۃ)	عربیت کو باقی رکھو کہ وہ عربی ہے (دوسری
تعلموا العربیۃ فانھا من دینکم	روایت میں ہے) عربی سیکھو اس لئے کہ وہ
(اقتضاء)	تمہارے دین کا جزو اعظم ہے۔

اس بارہ میں روایاتِ شرعیہ کا ایک عظیم ذخیرہ ہے جس میں عربیت کی اشاعت اور تعلیم عام کی تاکیدات وارد ہوئی ہیں کہ دین اور نظامِ دین کی حقیقی کیفیات کا بقا اسی زبان کے بقا میں مضمر ہے چنانچہ قرنِ اول کے پاکباز گروہ نے زبان کی تفریقوں کے مٹانے اور اختلافِ لغت سے

فرقہ وارانہ ذہنیتوں کی پیداوار کی روک تھام کیلئے دوسری زبان نہ تھی۔ یہ مقدس گروہ جب ایک خدا ایک رسولؐ اور ایک اسلام کی خاطر ساری دنیا کو فتح کرنے کیلئے فاران کے دامنوں سے نکلا تو جس طرح کتاب اللہ ان کے سینوں پر تھی اسی طرح کتاب اللہ کی زبان ان کی جانوں کے ساتھ تھی۔ اگر یہ حضرات صحابہ ملکوں کے فاتح تھے تو عربی زبان زبانوں کی فاتح تھی۔ چنانچہ جب یہ مذہب واخلاق اور تہذیب و تمدن کا گرم رو قافلہ شمال کی طرف پہنچا تو ایشیائے کوچک کے دامن تک تمام علاقہ کی زبان عربی کر دی۔ پھر جب اس نے مغرب کی طرف کمر ہمت باندھی تو آبنائے جبل الطارق تک مصر، طرابلس۔ الجزائر، اور مراکو وغیرہ کو زبان کے لحاظ سے عرب بنا دیا۔

ہاں بدقسمتی سے اسلام کے اس قافلہ نے جب عجم کی طرف فاتحانہ اقدام کیا تو عجمی فطرت عربی زبان کے اس بہتے ہوئے دھارے کیلئے بند اور سدِ راہ ثابت ہوئی اور عراقِ عرب تک ہی اس چشمۂ عربیت کے سوت پہنچنے پائے تھے کہ عجمیت نے درمیان میں اپنی زبان کی دیوار حائل کر دی جو درحقیقت عربی قومیت اور عربی مذاقِ فطرت کے مقابلہ کی ایک اساسی کوشش تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران، افغانستان، بلوچستان، سندھ، ہندوستان اور چین عربی زبان کے اس چشمۂ شیریں سے سیراب نہ ہو سکے اور اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ ان ممالک کو باوجود گہوارۂ اسلام بنجانے کے اپنے اسلامی ذخیرے بچانے کیلئے بہت سی نامانوس زبانوں کے سمندر میں بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنا پڑا اور غیر معمولی زور آزمائیوں کے ساتھ عربیت اور عربی زبان کے بچانے کی مساعی کسی حد تک ہی کامیاب ہو سکیں یعنی عربی زبان ملکی اور سرکاری حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک علمی اور فنی حیثیت سے بمشکل باقی رہ سکی اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کی مقامی زبانوں کی پیشرو ہوتی۔ مقامی زبانیں خود اسی پر غالب رہیں جس کا کھلا انجام زبان کی تفریق ہی تک محدود نہ رہا بلکہ لغت و زبان کی طبعی خاصیتوں کے زیر اثر تمدن، تہذیب، کلچر، معاشرت، اور عام طریقِ

زندگی کو بھی اسلامی حیثیت سے منتشر اور متفرق کر دیا جس سے جذبات واحساسات میں بھی باہمی تفاوت قائم ہو گیا اور وہ عربی یکسانیت عجم کی گھاٹیوں میں آکر اکدم رک گئی۔ ان ممالک اور خصوصاً ہمارے ملک (ہندوستان) میں آکر پھر بھی عربی زبان یا عربیت کی کوئی جھلک نظر آتی ہے تو وہ برگزیدہ علمائے ربانی اور صلحائے وقت کے آثار صالحہ کی برکات ہیں جنھوں نے مدارسِ عربیہ کے سلسلہ سے بحیثیت علم وفن عربی زبان کو ہزارہا موانع اور مشکلات کے ہجوم میں قائم رکھا۔ اور دینی تعلیم کے لئے عربی زبان کو لازم کئے رکھا۔ ورنہ اگر اسلامی تعلیم محض مقامی اور ملکی زبانوں میں دیئے جانے کا رواج جگہ پالیتا جس کی بارہا کوششیں کی گئیں تو آج ان ممالک میں شاید عربی کے نام سے بھی کوئی واقف نہ نکلتا۔

ہندوستان کے طول وعرض میں چند برگزیدہ علمائے ربانی اور مجاہد اہل اللہ نے اسلامی شوکت واقتدار ختم ہو جانے کے بعد عربی زبان اور عربیت کے بقاؤ تحفظ کی طرف جو سب سے پہلے مجاہدانہ اقدام کیا وہ آج دارالعلوم دیوبند کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جس کے نقشِ قدم پر پھر سینکڑوں قومی مدارس دینیہ قائم ہوئے اور ان کے ذریعہ عربی زبان اگر سرکاری حیثیت اختیار نہ کر سکی تو کم از کم فن کی حیثیت سے قائم رہی۔

غور کیا جائے تو دارالعلوم اور اس کے جیسے مدارس کی بنیاد واشاعت دین وتعلیم مذہب کے ساتھ فی الحقیقت اس عجمیت کے ابھرتے ہوئے سیلاب کیلئے ایک بند ثابت ہوئی جس نے صحیح راہِ عربیت کو روشن کر دیا اور عملاً سمجھا دیا کہ مسلمانوں کی عالمگیر قومیت اور مذہبی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے عربی زبان لابدکا درجہ رکھتی ہے۔

لیکن ساتھ ہی ان روشن ضمیر بزرگوں کی دانائی اور دوربینی کا یہ بھی کسقدر عظیم کارنامہ تھا کہ انھوں نے ان مدارس عربیہ میں اگر تعلیم عربی میں رکھی تو تفہیم اردو میں جاری کی تاکہ اگر ایک

طرف تمام عالم اسلامی کی اجتماعیت کی روح عربی زبان سے تازہ رہے تو دوسری طرف مقامی اور ملکی ضروریات کے مجبور کن تقاضے اردو سے پورے ہوتے رہیں۔ اور اس طرح عربی کے ساتھ انھوں نے اردو کو نہ صرف زندہ ہی رکھا بلکہ اردو میں عالمگیری پیدا کر کے اُسے ہندوستانی کیا۔ ایک حد تک ایشیائی زبان بنا دیا یعنی اپنے مدارس کے فضلاء کے ذریعہ جو تمام ایشیائی ممالک سے جوق درجوق ان درسگاہوں کی طرف اکتسابِ علم کے لئے آتے ہیں اور اردو کی تفہیم سے عربی علوم حاصل کرتے ہیں اردو زبان کو سارے ہی ایشیائی ممالک سے روشناس کر دیا۔ اور آج ان ممالک میں کوئی شہر ایسا نہیں ہے جس میں اردو بولنے اور سمجھنے والے نظر نہ پڑتے ہوں۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو کی بنیادوں کا یہ غیر معمولی استحکام اور اس کی یہ فوق العادت ترویج محض سیاسی میلانات یا ملکی اتار چڑھاؤ کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اس میں بہت حد تک ان عرض کردہ مذہبی سرگرمیوں اور ان مجاہدین اسلام کی غیر نمائشی مساعی کا حصہ بھی شامل ہے جسے مسٹر گاندھی کا سیاسی خاندان اور مسٹر جناح کی سیاسی نظر پوری طرح محسوس نہیں کر سکتی۔

بہرحال ان بزرگوں کے عملی اسوہ سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے ملک و مقام کے ساتھ عام اجتماعیت و وحدت کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس لئے عربی کی خدمت اُردو سے اور اردو کی خدمت عربی سے بے فکر نہیں کر سکی مگر یہ ضرور کہا جائیگا کہ عربی ان کا اولین مقصد تھا اور اردو ثانوی درجہ رکھتی تھی اس لئے اردو کی واجبی خدمت و حمایت کے ساتھ جو شرعی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے ضروری ہے عربی کی اساسی خدمت سے بے فکر ہو جانا اپنے عام اجتماعی شیرازہ کو اور زیادہ پراگندہ کر دینا ہے۔

نہیں بلکہ خود ہندوستان کے موجودہ ماحول کے لحاظ سے بھی عربی زبان سے بے التفاتی ایک مہلک ترین غلطی ہوگی کیونکہ آج ملک کے غیر مسلم اردو کو ہندی بنا کر اس میں سنسکرت کی رُوح

پھونکنا چاہتے ہیں تو اس کا حقیقی جواب ہمہ تن اردو پر جھک پڑنا نہیں بلکہ اردو کو سامنے رکھکر عربیت کا احیا رہے پس اگر وہ ہندی اور سنسکرت محاورات کی بھرتی سے اردو کی حقیقی حیثیت اس طرح ختم کر دیں کہ اس میں سے محض سنسکرت بھرتی ہوئی نظر آئے تو اس خاتمہ سے اردو کا یہ خاتمہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اس میں عربی محاورات کی زیادہ سے زیادہ بھرتی اس انداز سے ہو کہ اردو کا قالب پھٹ جائے اور خالص عربیت ہی کی نمود باقی رہ جائے۔ آخر آج بھی تو ہمیں اردو اس عربیت و اسلامیت ہی کی خاطر عزیز ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ عربی جوہروں کی نمائش کا ایک آئینہ اور وسیلہ ہے تو پھر اگر مقصود کے حصول پر وسیلہ ختم بھی ہو جائے تو یہ خاتمہ کچھ بھی محلِ تاسف نہ ہونا چاہیے۔ بہر حال چونکہ عربی کی اس اساسی ضرورت کی راہ میں اردو کے اس شغف کے حائل ہو جانے کا خطرہ محتمل تھا اس لئے اس پہلو کی طرف بھی درمیان میں توجہ دلا دیا جانا ضروری خیال کیا گیا ورنہ بحالت موجودہ ہندوستان میں اردو کا بقا و تحفظ ہمارا شرعی اور سیاسی فریضہ ہے اور ضرورت ہے کہ ہم اردو زبان کی حمایت کے جذبے کو زیادہ سے زیادہ حقیقت کے قریب لے آئیں۔

اردو مشترک زبان ہے

منشار کلام کی یہ نوعیت ملک کی موجودہ حالت کے پیش نظر ہے۔ جبکہ اردو کے مٹانے اور اس کا اسم و رسم بدلنے کی ذمہ دارانہ مساعی جاری ہیں ورنہ اگر گرد و پیش کے حالات سے قطع نظر کر کے اصل حقیقت سامنے رکھی جائے تو موجودہ ترقی یافتہ اردو کی حفاظت کا بارِ گراں صرف مسلمانوں ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ ان کی طرح ہندوستان کی تمام ہمسایہ اقوام کا فریضہ ہے۔ کیونکہ اردو کو باوجود اس کی عربی آمیزی اور عربیت خیزی کے ملک کی تمام ہمسایہ اقوام عرصہ دراز سے نہ صرف قبول کئے ہوئے ہیں بلکہ استعمال کر رہی ہیں۔ بہت ہی مخصوص کلمات و محاورات چھوڑ کر اردو کے تمام جملے اور تعبیرات خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی خود ان اقوام کا تلفظ بن چکے ہیں۔ اس لئے اردو میں اگر ایک حیثیت اسلامیت کی تھی تو دوسری حیثیت اس اشتراکِ تکلم سے ہندوستان کی مشترک زبان ہونے

کی بھی ہے جیسا کہ وہ اپنی ابتدا ہی سے اقوام کے اشتراک سے پیدا بھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ایک صوبہ کی زبان دوسرے صوبہ میں نہیں سمجھی جاتی مگر اردو ہر صوبہ میں سمجھی جاتی ہے۔ ایک صوبہ کا خطیب یا مقرر کسی صوبہ میں پہنچکر اپنے مافی الضمیر کو خود اپنے صوبہ کی زبان میں خواہ نہ سمجھا سکے مگر اردو میں بلا کسی مقامی ترجمان کے ضرور سمجھا جا سکتا ہے اور کسی صوبہ کا فرد بھی اردو سنکر یہ نہیں کہتا کہ یہ اس کی زبان استعمال نہیں ہو رہی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ مسلمانوں نے چونکہ ہر قوم سے بڑھکر اردو کی غیر معمولی خدمت کی اور اسے معراج ترقی پر پہنچایا اس لئے اس میں عربیت کا عنصر کچھ زیادہ نمایاں ہو گیا اور پھر مسلمانوں ہی نے جبکہ اپنی مخصوص علمی ذہنیت اور روایتی مذاقِ علمی کے ماتحت اس میں اپنے علوم منتقل کئے تو اس میں اسلامیت کا عنصر بھی نمایاں ہو گیا لیکن نہ کسی قوم نے ان کی اس معقول جدّ و جہد اور ادبی ترقی کو بری نگاہ سے دیکھا نہ اردو کی اس بڑھتی ہوئی لطافت کے سبب اس کا استعمال ترک کیا۔ اور نہ ان کے دلوں میں یہ وسوسے ہی پیدا ہوئے کہ اس عربی آمیزش سے اب یہ زبان ہماری یا ہندوستان کی نہیں رہی۔ کیونکہ جہاں اس میں عربیت کا عنصر موجود تھا دوسری زبانوں کے الفاظ بھی بکثرت اس میں مستعمل ہو رہے تھے۔ اور اس کی مشترک حیثیت کسی عنصر کے غلبہ و مغلوبیت سے کبھی ختم شدہ اور پامال نہیں سمجھی گئی۔ اس لئے موجودہ اردو کو اگر مسلمان اسلئے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں ان کا بہت سا سرمایہ لگا ہوا ہے تو ہمسایہ اقوام کو اس کی حفاظت اس لئے کرنی چاہئے کہ اس میں ان کا قول و عمل بھی شامل ہے اور کم و بیش سرمایہ بھی لگا ہوا ہے اور اس لئے نفع کے سب شریک ہیں۔ اندریں صورت کون کہہ سکتا ہے کہ اس اشتراک متاع کی حفاظت محض رب المال ہی کے ذمہ فرض ہے اور عامل کا اس میں ۔ ۔ ۔ کوئی بھی حصہ نہیں؟ اگر کوئی عامل اس متاع کو محض اس لئے گنوانے کی کوشش کرے کہ اس میں زیادہ پونجی دوسرے کی لگی ہوئی ہے تو کیا شرکت منافع کی ہوتی ہوئے

اس کا نقصان دوسرے ہی کو پہنچکر رہ جائے گا۔

اردو کی حفاظت ہندو اور مسلمان سب کا فرض ہے

اگر آج یورپ کی تمام تمدنی ایجادات جنھیں ہندوستانی اقوام نے بلاتفریق مذہب وملت نافع سمجھکر قبول کرلیا ہے یہ کہکر مٹایا جانے لگے کہ ان میں تو یورپینوں کا دماغی اور مادی سرمایہ لگا ہوا ہے تو کیا اس سے محض یورپ ہی کا نقصان ہو کر رہ جائیگا یا ان اقوام کی تمدنی ترقیات کو بھی کافی ٹھیس لگے گی جنھوں نے ان چیزوں کو بطوع ورغبت قبول کر کے اپنا بھی مالی سرمایہ ان پر صرف کیا اور اپنے تمدن کا قوام بنا کر انھیں اپنے بازاروں اور درباروں کی زینت بنالیا۔ پس یہ صحیح کہ خصوصی طور پر مسلمانوں نے اپنا علمی اور دماغی سرمایہ لگا کر اردو کو ایک ایسی حد پر پہنچایا کہ وہ تمام ہندوستانی اقوام کی محفلوں اور انجمنوں کی زینت بن گئی۔ لیکن اس کے حسن وجمال کو محض اسوجہ سے پامال کرنا کہ وہ فلاں قوم کی پروردہ یا رہین منت ہی۔ نہ کچھ زبان ہی کی خدمت ہے نہ خود اپنی ہی کوئی خدمت ہے بلکہ سرمایہ کی خوبی مسلّم ہو جانے کے باوجود کسی سرمایہ دار کے علی الرغم اُسے مٹانے کی کوشش کرنا کیا عصبیت اور حمیتِ جاہلیت اور جوشِ رقابت کا پردہ فاش کرنا نہیں ہے؟ اور کیا دنیا کی کوئی معقول پسند قوم اس جذبہ کی تائید وتحسین کریگی؟ اس لئے میرے خیال میں اردو کی حفاظت کا ذمہ مسلمانوں کی طرح ہندوؤں اور ہندوستان کی تمام ہی اقوام پر مساویانہ طریق پر عائد ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے تمام معاملات چونکہ مذہبی اصول کے تحت میں ہیں اس لئے ان پر اس زبان کا تحفظ شرعی حیثیت سے واجب ٹھیرتا ہے اور دوسری اقوام میں عموماً تمدنی اور قومی مصالح کو سامنے رکھا گیا ہے، اسلئے ان پر یہ تحفظ سیاسۃً واجب ہے۔

ہاں اگر مسلمانوں کی طرف سے یہ تحریک اٹھائی جاتی کہ اردو میں سے تمام وہ الفاظ نکالدیئے جائیں جو ہندی، انگریزی، ترکی، فارسی اور دوسری زبانوں کے شامل ہیں اور ان کی جگہ صرف عربی الفاظ بھردیئے جائیں یا اس زبان کا نام اردو سے کسی عربی لغت میں ڈھال دیا جائے اور

وہ بھی یہ مصلحت ظاہر کر کے کہ شمالی ہند کے خطے اسلامی دولتوں سے قریب ہونے اور اپنے اندر عربیت کی روح رکھنے کی وجہ سے اس نئی اردو کو زیادہ سہولت سے استعمال کریں گے تو اس صورت میں ہندوؤں کو حق تھا کہ وہ جنوبی ہند کی رعایت سے اردو کو ہندی بنانے یا اس میں بکثرت سنسکرت الفاظ بھر دیئے جانے کی تحریک مسٹر سمپورنا نند وزیر تعلیم یوپی کے قلم وزبان سے کرلتے اور موجودہ اردو کا رنگ روپ بدلنے کی پوری سعی کرتے لیکن مسلمانوں نے آجتک نہ ایسی تحریک اٹھائی اور نہ وہ اسے بحالت موجودہ پسند ہی کرتے ہیں کیونکہ اس صورت حال کے بعد اردو خالص عربیت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا سمجھنا سمجھانا دوسری قوموں ہی کیلئے نہیں خود عامۂ مسلمین کیلئے بھی دشوار اور تکلفِ محض ہو جائیگا۔ چنانچہ آج ہندوؤں کی طرف سے اردو میں جن سنسکرت الفاظ کا مواد بھرا جا رہا ہے وہ مسلمانوں ہی کیلئے نہیں عام ہندوؤں کیلئے بھی اجنبی ہے۔ ہاں جو الفاظ بے تکلف زبان زد ہو کر شاملِ لغت ہو جائیں وہ کسی زبان کے ہوں کسی قوم پر شاق نہیں گذرتے لیکن جو الفاظ ٹھونس کر بھرتی کئے جائیں وہ بھرتی کرنیوالوں پر بھی گراں ہوتے ہیں گو کسی مخفی غرض کے ماتحت اس گرانی کو سبکساری ظاہر کیا جائے مسلمانوں نے زبان کے مسئلہ میں اس پہلو کی کافی رعایت کی ہے کہ اردو میں نہ تو بتکلف عربی الفاظ کی بھرتی کی جائے اور نہ بتکلف دوسری زبانوں کے داخل شدہ الفاظ اس سے خارج کئے جائیں۔ گویا جن الفاظ کا داخلہ یا خارجہ بلا کسی اہتمام کے اقوام کی عام ذہنی رو کے ماتحت خود بخود ہو گیا اسی کو اصل زبان کی رُوح سمجھکر قبول کر لیا اور اس طرح باقی رکھا کہ نہ اس میں کسی تحریک کا دخل تھا نہ کسی قومی سلسلہ جنبانی کا۔ بخلاف ہندوؤں کے کہ ان کی طرف سے عربی دینی الفاظ کا اخراج اور سنسکرت الفاظ کا داخلہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ ایک خالص قومی تحریک اور مخصوص ملی نظام کے ماتحت ذمہ دارانہ طریق پر عمل میں لایا جا رہا ہے۔

مسلمان جس حیثیت سے موجودہ اردو کی حفاظت ضروری خیال کرتے ہیں اس میں رقابت کے

بجائے منافع عامہ کی رعایت اور مقاصد مشترکہ کی اہمیت کارفرما ہے وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ اُردو کے بچاؤ میں جو نفع ان کا ہے وہی بجنسہ دوسری اقوام کا بھی ہے۔ پس اگر اردو کے تحفظ کیلئے ان مشترک منافع کا بقاء و تحفظ کوئی معقول وجہ ہو سکتا ہے تو پھر حفاظتِ اردو کا ذمہ تنہا مسلمانوں ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ ان سے زیادہ دوسری اقوام کے مجموعہ پر بھی آتا ہے اور ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ جس طرح مسلمان اس داعیۂ تحفظ میں دوسری اقوام کے مفاد سے بے تعلق نہیں ہیں اسی طرح ان اقوام کو مسلمانوں کے بھی اسی قسم کے منافع سے بے پروانہ ہونا چاہیے۔ اور انھیں غور کرنا چاہیے کہ اگر زبان پوری عملی زندگی کا ایک قولی رُخ ہے تو مشترک عملی زندگی کا قولی پہلو بھی مشترک ہونا ناگزیر ہوگا جیسا کہ غیر مشترک عملی زندگی کا قولی پہلو بھی غیر مشترک ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلمان جب اس اردو کو اپنی خالص مذہبی اور خانگی زندگی میں استعمال کرتے ہیں تو اس وقت اس کے محاورات مخصوص اور ان کے خالص اپنے ہوتے ہیں اور جب وہ ملک کی مشترک زندگی ہمشترک پلیٹ فارم اور مشترک گفتگوؤں میں ایک دوسرے کے سامنے استعمال کرتے ہیں تو اردو کا وہی مشترک پہلو سامنے رکھتے ہیں جو عموماً تحریروں اور تقریروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو میں لغتِ عام ہونے کی وجہ سے یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہیں کہ وہ مشترک بھی ہے اور ہر قوم کی خالص بھی ہے خالص نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس میں ہر قوم کا لغت شامل نہ ہو اور مشترک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے لغات ایک دوسرے کو تسلیم نہ ہوں پھر اردو لغت زبانوں پر آکر اگر کسی انفرادی زندگی میں بولی جاتی ہے تو کتنے ہی مخصوص محاورات کے ساتھ بولی جائے پھر بھی وہ اردو ہی رہتی ہے عربی یا سنسکرت نہیں بن جاتی اور اگر ایسے ہی وہ کسی مشترک پلیٹ فارم یا مخلوط معاملات میں بولی جاتی ہے تو کتنے ہی عمومی الفاظ میں بولی جائے پھر بھی وہ اردو

ہی رہتی ہے اسلئے یہ باور کرلیا جانا کچھ مشکل نہیں کہ موجودہ اردو داں قوموں کی شخصی اور اجتماعی ساری ہی ضروریات کو اردو ہی رہ کر پورا کررہی ہے۔ پس جبکہ وہ ساری اقوام کی ترجمانی کی کفیل ہے اور اس کفالت میں آجتک کوئی رخنہ بھی نمایاں نہیں ہوا تو پھر اسے بدلدینے اور وہ بھی مسخ کرکے بدلڈالنے کا آخر وہ کونسا داعیہ ہے جسے معقولیت کے ساتھ سمجھایا جاسکیگا۔ (باقی آئندہ)

دِلّی کا آخری مغل تاجدار

جدید تاریخی تحقیق کی روشنی میں

از جناب ہدایت الرحمٰن صاحب محسنی ایم اے

(۴)

(۳۷) اگر مجوزہ انتظامات پر عمل درآمد کیا جائے تو پولٹیکل ایجنٹ کو چاہیے کہ جملہ سلاطین پر حکومت کے نقطۂ نگاہ کو صاف طور پر واضح کر دے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جو مالی امداد اسوقت بہم پہنچائی جا رہی ہے وہ ان کے حق میں حکومت کی طرف سے آخری کوشش ہے اس کے بعد حالات کے مزید بہتری کے لئے یا افزائشِ نسل کے سلسلہ میں مستقبل کی دشواریوں کا حل بہم پہنچانے کیلئے ان کو اپنی ہی کوششوں پر تکیہ کرنا چاہیے۔

مراسلہ شاہی منجانب مجلس ڈائرکٹران بنام گورنر جنرل بہادر و مجلس مشاورت مورخہ ۸ فروری ۱۸۴۶ء

(نذرانہ شاہی کے بارہ میں)

آپ کے محکمہ خارجیہ کے مراسلہ نمبر ۱۸ مورخہ ۵ نومبر ۱۸۴۷ء کے جواب میں رقم طراز ہیں کہ شاہِ دہلی کی خدمت میں نذرانہ نہ گذراننے کے سرکاری احکامات کا تعلق صرف ملازمینِ حکومت سے ہے دوسرے لوگ جو وقتاً فوقتاً بادشاہ کی حضور میں حاضری کا شرف حاصل کرتے ہیں انھیں نذر گذراننے کا حق حاصل ہے لیکن ایسے مواقع پر افسرانِ حکومت کو موجود نہ ہونا چاہیے۔ اور نہ برطانوی وکیل کو سرکاری طور پر اس قسم کی تقاریب کا بطورِ خود مشاہدہ کر کے سندِ جواز دینی چاہیے۔

مراسلہ منجانب مجلس ڈائرکٹران بنام گورنر جنرل بہادر و مجلس مشاورت مورخہ ۳۱ جنوری ۱۸۴۹ء

(سلاطین کی شکایت کے بارہ میں)

آپ کے محکمہ خارجیہ کے مراسلہ نمبر ۵۴ مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۴۸ء کے جواب میں رقمطراز ہیں اس میں قطعی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر کسی وقت شاہِ دہلی اپنے خاندان کے مستحق افراد کو ان کے وظائف دینے سے انکار کردیں تو ہماری حکومت کو یہ حق حاصل ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ سرکاری طور پر دخل اندازی کرے اور اگر ضروری سمجھے تو خود وظائف کا تعین کرکے اپنے وکیل کے ذریعہ سے تقسیم کرائے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت کے اس اختیار کی طرف بادشاہ کی توجہ مبذول کرادینے سے ہی مستحقین کے حقوق دلانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کیجاسکتی ہے۔

مراسلہ منجانب گورنر جنرل بہادر و مجلس مشاورت بنام مجلس ڈائرکٹران مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۵۰ء

("بادشاہ" کا خطاب ترک کرانے اور شاہی خاندان کو قلعہ سے علیحدہ کرنیکے بارہ میں)

مجلس ڈائرکٹران کا مراسلہ مورخہ ۱۶ جنوری موصول ہوا جس میں گورنر جنرل کی سفارشات مورخہ ۱۶ فروری ۱۸۴۹ء کے جواب میں شاہی خاندان کے سلسلہ میں عام تجویزات پر عمل پیرا ہونے کے پورے اختیارات ودیعت کیے گئے ہیں۔

ہمرشتہ ہذا ہم جملہ تجویزات ارسال کرنے کا اعزاز حاصل کررہے ہیں جن کے ذریعہ سے مجلس ڈائرکٹران پر اُن تمام اسباب وعلل کا واضح کردینا ضروری سمجھتے ہیں جو بحالت موجودہ "بادشاہ" کا خطاب ترک کرانے اور شاہی خاندان کو قلعہ سے علیحدہ کردینے میں حائل ہیں۔ تاوقتیکہ ہمیں ایسی واضح اور فیصلہ کن ہدایات موصول نہ ہوں گی جن کی بنا پر یہ یقین کیا جاسکے کہ مجلس ڈائرکٹران کو اُن تجویزات کا من وعن زیرِ عمل لانا منظور ہے۔ ہم ہر اقدام سے عاجز ہیں۔

مندرجہ بالا مراسلہ کا جواب منجانب مجلس ڈائرکٹران مورخہ ۵ رجون ۱۸۵۰ء

محکمہ خارجہ کا مراسلہ نمبر ۱۲ مورخہ ۶ راپریل ۱۸۵۰ء موصول ہوا جس میں ہمارے مراسلہ نمبر ۲ مورخہ ۱۶ رجنوری ۱۸۵۰ء کی وصولیابی اطلاع مذکور ہے۔ گورنر جنرل کی تجویزات کے مطابق آپ نے طے کیا ہے کہ جہانتک خطاب شاہی اور شاہی خاندان کو قلعہ دہلی سے علیحدہ کرنے کا مسئلہ ہے مجوزہ سفارشات پر عمل درآمد کرنے کیلئے ہمارے مراسلہ کی ہدایات پر عمل کرنا قرین مصلحت ہے۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ خاص حکمت عملی کے ذریعہ بادشاہ کی وفات پر قلعہ چھوڑ دینے کا ولیعہد سے ازخود اقرار لے لیا جائے۔

ہمیں اس تجویز سے پورا اتفاق ہے۔ قلعہ میں رہنے والے "سلاطین" کے حق میں برطانوی قانون سے استثنا کو ختم کردینے کے مسئلہ میں بھی ہمیں آپ کی تجویزات سے کامل اتفاق ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس سوال پر زور دینا بہت ضروری ہے اور ہم آپ کی پیش کردہ جملہ تجاویز پر عمل درآمد کرنا منظور کرتے ہیں۔

مراسلہ منجانب مجلس ڈائرکٹران بنام گورنر جنرل بہادر و مجلس مشاورت مورخہ ۸ رجون ۱۸۵۱ء
(شاہی امور کے بارہ میں)

ذیل میں گورنر جنرل کے محکمہ خارجہ کے مراسلہ مورخہ ۵ اراکتوبر اور خفیہ مراسلہ مورخہ ۲۸ رستمبر ۱۸۵۰ء کا جواب تحریر کیا جاتا ہے جو خفیہ مجلس مشاورت کی وساطت سے موصول ہوا ہے۔

(۱) بادشاہ دہلی کے موجودہ بیٹوں میں سب سے بڑا شاہزادہ مرزا فخر الدین ہے۔ لیکن ملکہ معظم کی خواہش ہے کہ ان کے چھوٹے بیٹوں میں سے مرزا جواں بخت کو ان کا جانشین مقرر کیا جائے کیونکہ موخر الذکر جائز اور اول الذکر ناجائز اولاد ہے۔

(۲) یہ کچھ بھی ہو ہم دیکھتے ہیں کہ خاندان تیموریہ میں اس قسم کے امتیازات کو کبھی ملحوظ نہیں رکھا گیا

وراثت کا مسئلہ ہمیشہ بادشاہ کی نرینہ اولاد کی تاریخ ولادت سے طے کیا جاتا رہا ہے۔ ورنہ موجودہ بادشاہ بھی تخت وتاج کے حقدار قرار نہ دئے جاتے۔ بنابریں ہم گورنر جنرل کی رائے کی تائید کرتے ہیں کہ مرزا فخر الدین ہی ولیعہد مقرر کئے جائیں۔ لیکن جبکہ بادشاہ چھوٹے شہزادہ کی وراثت پر مُصر ہیں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے مرزا فخر الدین کی جانشینی کا بھی سرکاری طور پر اعتراف نہ ہونا چاہئے۔

(۳) گورنر جنرل کی تجویز ہے کہ موجودہ بادشاہ کی زندگی میں اقتدارِ شاہی میں کوئی ترمیم نہ ہونی چاہئے لیکن جانشینی کے موقع پر مناسب انتظامات پر غور و خوض ضروری ہے۔

(۴) قلعہ دہلی سے شاہی خاندان کو اس موقعہ پر علیحدہ کر دینے کے متعلق گورنر جنرل کا خیال ہے کہ شاہی وظیفہ میں تاحینِ حیات قدرِ قلیل اضافہ کر دینے سے نئے وارث کی رضامندی بسہولت خریدی جاسکتی ہے یہ مسئلہ بھی ہم حکومت ہند کی مرضی پر چھوڑتے ہیں۔

(۵) اس رائے سے ہمیں قطعی اتفاق ہے کہ جس طرح ممکن ہوسکے شاہی خاندان کے کثیر التعداد خویش واقارب کو قلعہ شاہی سے ضرور نکال دینا چاہئے۔ اُن پر برطانوی قوانین جاری کرنے کے مسئلہ پر بھی ہر ممکن زور صرف کرنا چاہئے۔ حسب تجویز گورنر جنرل بہادر فی الحال اس کلیہ سے صرف بادشاہ اور اس کے خاص خاندان کو مع پوتوں پڑوتوں کے مستثنیٰ کر دینا چاہئے۔ گورنر جنرل کا خیال ہے کہ اس ضمن میں کچھ تفصیلی معلومات کی فراہمی ضروری ہے۔ اس لئے استثنا کی مخصوص دفعات صحیح معلومات بہم پہنچ جانے پر ہی طے کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر ممکن ہو تو مذکورہ معلومات اسی وقت فراہم کرنی چاہئے۔ موجودہ بادشاہ کی حیات ہی میں حکومتِ ہند کو کسی خاص نتیجہ پر پہنچ جانا چاہئے تاکہ تخت نشینی کے وقت جانشینی کو فوراً اپنے قطعی فیصلہ سے روشناس کرایا جاسکے

(۶) گورنر جنرل کی ایک تجویز یہ ہے کہ نئے بادشاہ کو یہ بھی بتلا دینا چاہئے کہ جب کبھی گورنر جنرل دہلی

آئیں گے تو بادشاہ کیلئے مساویانہ طور پر ان کا خیر مقدم کرنا ضروری ہو گا۔ بادشاہ کے مرتبۂ تفوق کو تسلیم نہ کرنے کی بنا پر ایک عرصہ دراز سے گورنر جنرل اور شاہِ دہلی کے درمیان مراسلت قطعی بند ہے چنانچہ آئندہ بادشاہ کی وراثت ہم صرف اسی شرط پر جائز تسلیم کرینگے کہ وہ کسی ایسے اقتدار اور فوقیت کا داعی نہ ہو گا جسے ہم منظور نہ کریں۔

(۷) گورنر جنرل کی یہ بھی رائے ہے کہ آراضیاتِ تعیل (شاہی جاگیر) درو بست برطانوی افسران کے اختیار میں آجانی چاہیے۔ انتظامی اخراجات کے بعد جو آمدنی بچیگی وہ بادشاہ کو دیدی جائیگی۔ لیکن اگر بادشاہ کے خلاف قابلِ تسلیم قرضوں کا دعویٰ پیش کیا جائے گا تو اس صورت میں قرضوں کی ادائیگی کو فوقیت ہو گی۔ ہم یہ بات قرینِ مصلحت نہیں سمجھتے ہیں کہ بادشاہِ دہلی کے خلاف مالی مطالبات کی سماعت اور فیصلہ کی ذمہ داری حکومتِ ہند اپنے سر لے۔ اس میں یہ خطرہ ہے کہ اگر حکومت نے بادشاہ کے قرضوں کی ذمہ داری خود لے لی اور مطالبات کی ادائیگی اپنے طور پر کی تو بادشاہ کیلئے حصولِ قرضہ کے وسائل زیادہ وسیع ہو جائیں گے اور فضول خرچیوں میں بہت زیادتی ہو جائیگی۔ ہمارے نزدیک یہ زیادہ بہتر ہے کہ دوسرے وظیفہ خوار رؤسا کی طرح ملک معظم سے روپیہ کا لین دین کرنے والے بھی بالعموم اپنی ہی ذمہ داری پر معاملہ کریں اور خود ہی مکافات کے ضامن ہوں۔

(۸) ایک مسئلہ ابھی یہ باقی ہے کہ وظیفہ میں ۳ لاکھ روپیہ سالانہ کی تجویز پر عمل کیا جائے یا نہیں؟ اس کی تفصیلات مختلف موقعوں پر سابق اور موجودہ بادشاہ کے سامنے پیش کی جا چکی ہیں۔

(۹) گورنر جنرل کی رائے ہے کہ وظیفہ میں اضافہ نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہماری پیش کردہ شرائط کو مسترد کر دینے کے معنی صاف یہی ہو سکتے ہیں کہ بادشاہ کو اس رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔

(۱۰) ہماری شرائط یہ تھیں کہ ملک معظم توسیع وظیفہ کے عوض حکومتِ برطانیہ کے مقابلہ میں اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو جائیں گے و نیز اضافہ شدہ رقم کو خاندانِ شاہی میں تقسیم کرنے کا مجاز

گورنر جنرل کو ہو گا۔ ۴ دسمبر ۱۸۴۴ء کے مراسلہ میں ہم نے دوسری شرط میں اس حد تک ترمیم بھی کر دی تھی کہ اضافہ شدہ رقم کا کچھ حصہ بادشاہ کے ذاتی مصارف کے لئے بھی مقرر کر دیا جائے گا۔ اور ایک واجبی رقم قلعہ کی مرمت اور بادشاہ کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے بھی مخصوص ہو گی۔ لیکن یہ مراعات صرف اسی صورت میں قابل عمل ہونگی۔ جب بادشاہ گورنر جنرل کی مرضی کے مطابق معقول رقوم خاندانِ شاہی کے افراد کیلئے مقرر کر دیں گے۔ اور اس کا بھی اقرار کر لیں گے کہ مقرر شدہ وظائف میں برطانوی نمائندوں کے منشا کے بغیر کوئی قطع و برید نہ کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو یہ بھی منظور کرنا ہو گا کہ ان کے دور دراز کے اعزا کو قلعہ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ تاکہ وہ برطانوی قانون کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ اس امر کا فیصلہ کہ کن کن لوگوں کو قلعہ سے علیحدہ کیا جائے گورنر جنرل کریں گے۔

(۱۱) ملک معظم نے ان شرائط کو ناپسند کیا اور گورنر جنرل نے لفٹنٹ گورنر آگرہ کی تجویز کے مطابق توسیعِ وظیفہ پر عمل درآمد کرنا اس وقت تک ملتوی کر دیا تا وقتیکہ باضابطہ اقرار نامہ کے ذریعہ حکومت کے مطالبات کو منظور نہ کیا جائے۔ لیکن یہ طے کر دیا گیا کہ کیونکہ بادشاہ کے قرضوں کو آخر کار حکومت ہی کو چکانا پڑے گا اسلئے شاہی جاگیر بادشاہ کے موجودہ اور آئندہ قرضوں کی ضمانت کے طور پر ہمارے قبضہ میں آجانا چاہیئے۔

(۱۲) اس سوال کی پیچیدگیوں میں پڑنا ضروری نہیں ہے کہ آیا اپنے رویہ سے بادشاہ نے توسیعِ وظیفہ کا مسئلہ خود نامنظور کر دیا ہے یا نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بادشاہ اور حکومتِ ہند کے مابین شرائط طے نہیں ہو سکی ہیں۔

(۱۳) شاہی خاندان کے وظائف کا گوشوارہ جو بادشاہ نے پیش کیا ہے اور جس سے وہ سرِ مو تجاوز کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں یقیناً اس قابل نہیں ہے جسکو گورنر جنرل معقولیت کے ساتھ منظور کر سکیں۔

سلاطین کی قلعہ سے علیحدگی کے بارہ میں بادشاہ نے صرف ان لوگوں کو منتخب کیا ہے جو شاہِ عالم کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ ایسے لوگ ۱۲۵۶ میں سے صرف ۲، بتلائے جاتے ہیں۔ بادشاہ کی پیش کردہ قرض کی تفصیل غیر معمولی طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا مراسلہ کا جواب منجانب گورنر جنرل بہادر مورخہ ۶ مارچ ۱۸۵۲ء

مجلس ڈائرکٹران کے مراسلہ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۸ جون ۱۸۵۱ء شرفِ صدور لایا اس سلسلہ میں زیر بحث موضوع پر ضروری کاغذات ارسال ہیں۔ و نیز شاہزادہ مرزا فخرالدین کی بڑھتی ہوئی مشکلات کے ضمن میں گذارش ہے کہ ان کی ولیعہدی کا فیصلہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ کارروائی اس طور پر ہونی چاہیئے کہ ملک معظم کی گرانی خاطر کا باعث نہ ہو اور شہزادہ موصوف کو مقررہ وظیفۂ ولیعہدی مع جمع شدہ رقوم کے مل جائے۔

مذکورہ بالا مراسلہ کا جواب منجانب مجلس ڈائرکٹران مورخہ ۲ جون ۱۸۵۲ء

ذیل میں گورنر جنرل کے محکمہ خارجیہ کے مراسلہ نمبر ۱۴ مورخہ ۶ مارچ کا جواب (جو نام نہاد تخت دہلی کی وراثت کے مسئلہ پر مشتمل تھا) تحریر کیا جاتا ہے۔

(ا) چونکہ آپ کے نزدیک یہ قرینِ مصلحت ہے کہ جو شرائطِ ولیعہدی ہم منوانا چاہتے ہیں وہ اسی وقت شاہزادہ فخرالدین کے علم میں لائی جائیں اور ان کا اقرار و منظوری حاصل کر لی جائے اس لئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے

(الف) یہ کہ ہر موقع پر ان کو گورنر جنرل سے مساویانہ انداز میں ملنا ہوگا۔

(ب) یہ کہ شاہی جاگیر کا انتظام مستقل طور پر حکومت برطانیہ کے سپرد ہوگا۔ انتظامی اخراجات کے بعد باقی منافع بادشاہ کو دیا جائے گا۔

(ت) یہ کہ اُن مستثنیات کے علاوہ جو طے کر دیئے جائیں گے "جملہ سلاطین" قلعہ سے علیحدہ کر دیئے

اور حکومتِ برطانیہ کے عام قوانین کے ماتحت شہریوں کی زندگی بسر کریں گے۔

(۲) گورنر جنرل نے ہمارے تفویض کردہ اختیارات کی رو سے ایک شرط کا اور اضافہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ قلعہ دہلی حکومتِ برطانیہ کے سپرد کر دیا جائیگا۔ اور بادشاہ مع ان خویش و اقارب کے جوان کے ساتھ رہیں گے قطب کے مقام پر سکونت اختیار کریں گے۔ اگرچہ اس آخری شرط کو گورنر جنرل نے بہت اہمیت دی ہے تاہم یہ اسقدر ضروری نہیں معلوم ہوتی کہ اس کی منظوری کے بغیر شاہزادہ کی بادشاہی کے حقوق نظر انداز کر دئیے جائیں۔

(۳) ہم گورنر جنرل کی حکمت عملی کو نظرِ استحسان سے دیکھتے ہیں اور ہمیں یہ معلوم کر کے انتہائی طمانیت خاطر حاصل ہوئی کہ شاہزادہ نے جملہ شرائط کو بغیر پس و پیش کے منظور کر لیا ہے۔ قلعہ سے دستبرداری بھی منظور کر لی ہے اور بادشاہ کے ساتھ رہنے والے اعزا کی تعداد موجودہ بادشاہ کی اولاد تک محدود کر دی گئی ہے۔

(۴) لفٹنٹ گورنر آگرہ کا خیال تھا کہ یہ رعایت شاہانِ سلف کے پوتوں اور پڑپوتوں تک جاری ہو۔ لیکن اس رائے سے گورنر جنرل کو اتفاق نہ تھا تاہم یہ طے ہو گیا تھا کہ اگر لفٹنٹ گورنر کی رائے پر عمل کیا گیا تو آخری فیصلہ سے پہلے ایسے سب سلاطین کے تعداد کے بارہ میں جو آئندہ بادشاہ کے ساتھ رہنے کے مجاز ہوں گے پوری معلومات فراہم کی جائیں گی۔

(۵) ہماری مجوزہ شرائط پر اظہار رضامندی کرتے ہوئے شاہزادہ فخر الدین نے بھی ذاتی طور پر حکومت ہند سے چند درخواستیں کی ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ جانشینی کے بعد شاہی وظیفہ کی تقسیم پر بلا تعین انھیں کلی اختیار ہونا چاہیے۔ اس درخواست کو حکومت ہند نے بجا طور پر ناقابلِ عمل ٹھیرایا ہے۔ دوسری درخواست یہ ہے کہ آئندہ ولیعہد کو مستحق وظیفہ قرار دینے سے پہلے سابق کی وفات سے تخت نشینی تک کی مدت ولیعہدی کا تمام وظیفہ بقایا ان کو ملجانا چاہیے۔ دنیز یہ کہ قلعہ کا محافظ دستہ

ابھی سے ان کو سلامی دیا کرے۔ اور وکیل برطانیہ ان کی اقامت گاہ پر ملاقات کیلئے حاضر ہو، شاہزادہ کی موخر الذکر خواہشات کی تعمیل کی گورنر جنرل نے سفارش کی ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ ایسا کرنا شاہزادہ کو کھلم کھلا ولیعہد سلطنت مان لینے کے مرادف ہے۔ حالانکہ ہم اسی امر سے ابتک عمداً احتراز کرتے رہے ہیں۔ تاہم بحالتِ موجودہ ان خواہشات کی تعمیل سے اجتناب کرنا بھی خلافِ مصلحت ہے۔ لفٹنٹ گورنر کی رائے کے مطابق ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ جبکہ شاہزادہ کو تختِ دہلی کا وارث تسلیم کرنا ہماری مصالح کے عین موافق ہے اور جب موصوف نے ہمارے تمام منصوبوں پر رضامندی کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ ان خواہشات کی تکمیل ہو جانی چاہئے لیکن ان "سلاطین" پر مجوزہ تبدیلیوں کا ابھی سے اظہار کر دینا جن کی ذات پر اہم اثرات مرتب ہوتے ہیں خلافِ مصلحت معلوم ہوتا ہے۔

(۶) گورنر جنرل اور مجلس مشاورت کو ہم پورا اختیار دیتے ہیں کہ مذکورہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے شاہزادہ فخرالدین کی ولیعہدی کا مسئلہ مناسب طور پر طے کر دیں۔ اور اُن ضروری اقدامات کی تکمیل کر دیں جو موجودہ بادشاہ کی وفات پر زیر غور انتظامات کو عملی صورت دینے کیلئے پیش خیمہ کے طور پر ضروری ہوں۔

گورنر جنرل کی طرف سے مندرجہ بالا مراسلہ کا جواب مورخہ ۷ اکتوبر ۱۸۵۲ء

عالیجناب

(۱) مجلس ڈائرکٹران کے مراسلہ نمبر ۱۹ مورخہ ۲ جون کا جواب دیتے ہوئے اطلاع رسانی کیلئے کچھ ضروری کاغذات منسلک کئے جاتے ہیں۔

(۲) آپ کی مجلس پر یہ روشن ہو جائے گا کہ شاہزادہ فخرالدین کی ولیعہدی کو باضابطہ طور پر تسلیم کرنے کے ضروری اقدامات مکمل کر لئے گئے ہیں۔

مراسلہ منجانب مجلس ڈائرکٹران بنام گورنر جنرل و مجلس مشاورت مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۲ء

(شاہی نذرانہ کی بقایا رقوم کی ادائیگی کے بارہ میں)

ذیل میں گورنر جنرل کے محکمہ خارجیہ کے مراسلہ نمبر ۴۴ مورخہ ۲ جولائی ۱۸۵۲ء (جسکے ہمراہ آگرہ رپورٹ ۱۸۵۱ء کا چوتھا حصہ منسلک تھا) کا جواب تحریر کیا جاتا ہے۔

(۱) رپورٹ میں مذکور ہے کہ بادشاہ دہلی نے ۸۳۳ روپیہ ماہانہ کا وظیفہ جو نذرانوں کی بجائے مقرر کیا گیا تھا لینا منظور کر لیا ہے اور باقیماندہ رقوم کی ادائیگی کے لئے درخواست کی ہے۔

(۲) چونکہ عرصہ دراز سے بادشاہ نے اس مد کا وظیفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لئے اس وظیفہ کا از سرِ نو اجرا ہمارے اوپر واجب نہ تھا چنانچہ لفٹنٹ گورنر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے نگارش ہے کہ بقایا نذر ہرگز ادا نہیں کرنی چاہیئے۔

مراسلہ منجانب مجلس ڈائرکٹران بنام گورنر جنرل و مجلس مشاورت مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۴ء

(بادشاہِ دہلی کی استدعا کے بارہ میں)

ذیل میں آپ کے محکمہ خارجہ کے مراسلہ نمبر ۱۵۶۰ مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۵۳ء کا جواب تحریر کیا جاتا ہے۔

(۱) گورنر جنرل نے بجا طور پر بادشاہ کی اس تجویز کو جس کے ذریعہ وہ کلکتہ میں ایک وکیل اپنے خاندان میں سے مقرر کرنا چاہتے تھے رد کر دیا ہے اور یہ بتلا دیا ہے کہ سرکاری وکیل مقیم دہلی ہی بادشاہ اور حکومتِ برطانیہ کے درمیان مراسلت کا صحیح ذریعہ ہے۔

(۲) جب ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلن برا نے برطانوی افسران کی طرف سے بادشاہ دہلی کو نذریں پیش کرنے کا مسئلہ ختم کر دیا تھا اور بادشاہ کا مالی نقصان پورا کرنے کیلئے ۸۳۳ روپیہ ماہانہ کی ایک رقم پیش کرنا چاہی تھی تو اس وقت بادشاہ نے اس پیشکش کو نامنظور کر دیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے

اب وہ اس انکار پر نادم ہیں اور زرِ بقایا کا مطالبہ پیش کرتے ہیں۔ آپ نے اس مطالبہ کو صحیح طور پر رد کردیا ہے۔ لیکن ہمارے پاس اب تک بادشاہ کی درخواست نہیں بھیجی گئی ہے۔

(۳) بادشاہ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ میرے بعد شاہزادہ جواں بخت اور ملکہ زینت محل کے مفاد اور حفظ وامان کو حکومتِ برطانیہ ملحوظ رکھے اسکا جواب آپ نے صحیح اور منصفانہ طور پر دیا ہے۔

مراسلہ منجانب مجلس ڈائرکٹران بنام گورنر جنرل بہادر ومجلس مشاورت مورخہ ۱۲ جولائی ۱۸۵۴ء

(شاہِ دہلی کی وراثت کے بارہ میں)

ذیل میں ہم گورنر جنرل کے محکمہ خارجیہ کے مراسلہ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۵۴ء کا جواب تحریر کرتے ہیں۔

(۱) آپ کے مراسلہ کے پیراگراف ۱ تا ۱۰ میں ذکر کیا گیا ہے کہ شاہِ دہلی کی شدید علالت کے زمانہ میں احکامات جاری کردئے گئے ہیں کہ بادشاہ کی وفات کے موقع پر کیا صورتِ عمل اختیار کی جائیگی۔

(۲) آئندہ کے لئے ہدایت کے طور پر ہم اس وقت یہ بتادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ لفٹنٹ گورنر کی تجویز کے مطابق ملکِ معظم کے ولیعہد کی تخت نشینی عمل میں نہ لائی جائے تاوقتیکہ وہ قلعہ چھوڑ کر قطب میں رہائش اختیار نہ کریں۔ دیگر امور میں بھی آگرہ گورنمنٹ کی ہدایات پر عمل کرنا چاہئے۔

مراسلہ منجانب گورنر جنرل ومجلس مشاورت بنام مجلس ڈائرکٹران مورخہ ۸ ستمبر ۱۸۵۶ء

(۱) گذشتہ مراسلات کے سلسلہ میں ہم سابق ولیعہد شاہزادہ مرزا فخرالدین کی وفات پر تختِ دہلی کی وراثت کے سلسلہ میں لفٹنٹ گورنر کے مراسلات اور اپنے جوابات کی نقول ارسال خدمت کرنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔

(۲) کاغذات سے یہ واضح ہوگا کہ لفٹنٹ گورنر اور برطانوی وزیر مقیم دہلی اس امر کے سخت مخالف ہیں کہ حکومت تختِ دہلی پر کسی کی جانشینی کو تسلیم کرے ہمیں اس رائے سے پورا اتفاق ہے۔

(۳) بادشاہ نے ایک بار پھر اپنے مقبولِ خاص بیٹے مرزا جواں بخت کی جانشینی پر زور دیا ہے لیکن چونکہ قانونِ شریعت کے اعتبار سے یہ امر ناقابلِ تسلیم ہے اور گورنمنٹ کی حکمت عملی کے بھی خلاف ہے اسلئے ہم نے احکام جاری کر دئے ہیں کہ بادشاہ کی اس خواہش کی تعمیل ناممکن ہے تاہم بادشاہ کی وفات پر شاہزادہ مرزا محمد قراش کو جو بادشاہ کے بیٹوں میں اسوقت سب سے بڑا ہے بزرگ خاندان کی حیثیت سے جانشین تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہماری شرائط من وعن وہی ہونگے جو شاہزادہ فخرالدین کے ساتھ تھے۔ فرق صرف اسقدر ہوگا کہ بادشاہ کے خطابات اور مروجہ شاہانہ اقتدار کے بجائے نئے جانشین کی حیثیت خاندانِ تیمور کے شہزادہ کی ہوگی۔ اور نمایندۂ خاندان کے طور پر اس کو پندرہ ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ یہ ہدایات جو لفٹنٹ گورنر کے نام جاری کردی گئی ہیں مجلس ڈائرکٹران کیلئے بھی قابلِ قبول ہونگی۔

(باقی آئندہ)

تلخیص و ترجمہ

بین الاقوامی مدوجزر

معاہدۂ ورسائی جنوری ۱۹۱۹ء سے آغاز جنگ ستمبر ۱۹۳۹ء تک

(۲)

ہٹلری اقتدار کے اہم واقعات

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جرمنی نے اپنا تعلق بے اسلحگی کانفرنس League of disarmament سے قطع کر لیا اور اس کا کفن ابھی میلا نہ ہوا تھا کہ مجلسِ اقوام کو بھی خیر باد کہدیا!

جون ۱۹۳۴ء میں صدر جمہوریہ پولینڈ مارشل پلسودکی Pilsudski سے ہٹلر کا ایک دوستانہ معاہدہ ہوا، اس میں یہ وعدہ کیا کہ پولینڈ کے ساتھ کسی قسم کی چیرہ دستی دس برس تک نہیں کی جائیگی۔

جنوری ۱۹۳۴ء میں جرمنی کے اس ڈکٹیٹر نے اپنا راستہ صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا اور صدہا اپنے ان پچھلے ساتھیوں اور مشہور لیڈروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جنھیں وہ اپنی راہ میں رکاوٹ خیال کرتا تھا!

مارچ ۱۹۳۵ء میں ہٹلر نے اپنی خواہشات کے مطابق جرمنوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا اور ان عسکری پابندیوں کو ٹھکرا دیا جو معاہدۂ ورسائی میں اس پر عائد کی گئیں تھیں۔

مارچ ۱۹۳۶ء میں ہر ہٹلر نے معاہدہ لوکارنو (Locarno) کے بے معنی ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کے اشارہ سے جرمن فوجوں نے رائن کے علاقہ Phine Land پر قبضہ کر لیا۔ شاید یہ بیان کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اس مقام پر معاہدۂ ورسائی کی رو سے نہ کوئی فوج رکھی جا سکتی تھی اور نہ چھاؤنیاں بنائی جا سکتی تھیں۔

ستمبر ۱۹۳۶ء میں اس ڈکٹیٹر نے نورمبرگ Nurmberg کے اندر نازی پارٹی کی ایک کانفرنس میں یہودیوں کے خلاف اپنا مشہور فرمان صادر کیا اور انھیں جرمن نسل سے خارج کر کے اُن پر نہایت سخت اور اہانت آمیز پابندیاں اور ٹیکس عائد کر دیئے۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں جاپان کے ساتھ جرمن کا ایک معاہدہ ہوا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک دوسرے کے لائحۂ عمل کو بروئے کار لانے میں سہارا دیا جائے کچھ مدت کے بعد اس میں اطالیہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

آسٹریا کا الحاق

فروری ۱۹۳۷ء میں ہٹلر نے ڈاکٹر شُشنگ Schusching. وزیر اعظم آسٹریا کو برخستجادن[1] کے اندر بلایا اور حسب خواہش آسٹریا کے بارے میں اس سے تحریر لے لی، آسٹریا پہنچ کر جب وزیر اعظم نے ان خواہشات پر عمل درآمد کرنے میں شش و پنج سے کام لیا تو جرمن فوجوں نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء کی صبح کو آسٹریا پر قبضہ کر لیا اور ہٹلر نے ریخ Reichstag کے ساتھ اس کے الحاق کا اعلان کر دیا۔

بلادِ سوڈیٹ پر قبضہ

۱۹۳۸ء کے آخر موسم گرما میں چیکوسلوویکیہ کے ان علاقوں کے قبضہ نے نازک صورت اختیار کر لی جو جرمنی کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، چنانچہ ستمبر ۱۹۳۸ء میں ہٹلر نے الٹی میٹم دیدیا کہ اگر اس علاقہ کا الحاق جرمنی سے نہ کیا گیا تو طاقت سے اس پر قبضہ کیا جائے گا اس موقعہ پر اطالیہ بیچ میں پڑا اور میونخ Munich میں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو جرمنی، اطالیہ، فرانس، اور برطانیہ کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کی حسب خواہش بلاد سوڈیٹ Sudetin land کا جرمنی کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا اور اس طرح اس کشمکش کو ختم کر دیا۔ صبح کو جرمنی نے ان پر قبضہ بھی کر لیا۔

---

[1] Berchtesgaden. (ہٹلر کے رہنے کا محل)

چیکوسلوویکیہ پر اقتدار

۱۲ر مارچ ۱۹۳۹ء کو ہٹلر نے ڈاکٹر ہاشا (Hacha.) صدر جمہوریہ چیکوسلوویکیہ کو برلن کے اندر بلایا اور جبراً رنج کی حمایت کے لئے اس سے دستخط کرائے اور ۱۴ر مارچ ۱۹۳۹ء کو جرمن فوجیں بی ہیمیا (Bohimia) اور موروِیا (.Moravia) میں داخل ہوگئیں، اس کے بعد پراگ (Prague) پر بھی تسلط قائم کرلیا اور نہ صرف چیکوسلوویکیہ کی قبائے جمہوریت کی دھجیاں بکھیر دیں بلکہ بوہیمیا اور موراویا کی مصلحتوں سے چشم پوشی کرکے سلوواکیہ کو ایک آزاد خطہ قرار دیدیا گیا اور چیکوسلوویکیہ کی فوجوں کو منتشر کرکے ان کے اسلحۂ جنگ اور سازوسامان پر قبضہ کرلیا گیا، ہنگری کا منہ بند کرنے کیلئے روتھینیا (Ruthenia) کی ہڈی اس کی طرف بھی پھینک دی گئی۔

میمل پر اقتدار

۲۲ر مارچ ۱۹۳۹ء میں جرمنوں نے میمل (.Memel) کے خطہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔

البانیہ پر اطالیہ کا تسلط

شروع اپریل ۱۹۳۹ء میں اطالیہ کی فوجوں نے البانیہ میں داخل ہوکر اس پر قبضہ کرلیا اور البانیہ کا بادشاہ احمد زوغو مع اپنی ملکہ جیرالدین وہاں سے فرار ہوگیا۔

روزویلٹ کا احتجاج

اس مرحلہ میں پریذیڈنٹ روزویلٹ نے ہٹلر اور مسولینی سے آزاد حکومتوں کے ساتھ چیرہ دستی کے خلاف احتجاج کیا اور ان دونوں کو مفاہمت کے ذریعہ اختلافی مسائل حل کرنے کی دعوت دی چنانچہ اس مقصد کیلئے ایک بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز بھی پیش کی، مگر ہٹلر نے ان باتوں کو درخورِ التفات نہیں خیال کیا بلکہ چند قدم اور آگے بڑھا اور عہدنامہ پولینڈ اور برطانوی بحری معاہدہ کے مہمل ہونے کا بھی غیر مبہم الفاظ میں اعلان کردیا۔

محور کا عسکری معاہدہ

۲۲ر مئی ۱۹۳۹ء میں جرمنی اور اٹلی میں دس سال کیلئے ایک عسکری معاہدہ ہوا، اس میں جارحانہ اور مدافعانہ دونوں صورتوں میں ایک دوسرے کی امداد کرنے کا وعدہ کیا گیا، اس معاہدہ کی تفصیل کسی کو معلوم نہ ہوسکی۔

روس و جرمنی کا معاہدہ

۲۳ اگست ۱۹۳۹ء میں روس اور جرمنی کے درمیان ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا، اس معاہدہ کے ہوتے ہی یورپ کے آسمان پر جنگ کا عقاب منڈلانے لگا۔

پولینڈ کا قضیہ

ہٹلر نے اس زمانہ میں پولینڈ سے مطالبہ کیا کہ ڈانزگ (Danzig) اور پولینڈ کی بندرگاہوں کا جرمنی سے الحاق کردیا جائے۔ دوسری طرف انگلستان سے یہ مطالبہ کیا کہ پولینڈ کو ہماری ضمانت میں دیدیا جائے۔ اس سلسلہ میں اگست ۱۹۳۹ء کے آخر ہفتہ میں برلن، لندن اور پیرس کے درمیان گفت وشنید ہوتی رہی مگر کوئی مفاہمت کی شکل نہ نکل سکی، وجہ یہ تھی کہ ہٹلر نے اپنی اسکیم مکمل کرلی تھی اور پولینڈ کی سرحدوں پر اس کی فوجیں کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھیں!

آغاز جنگ

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کی صبح صادق کے وقت جرمن فوجوں نے پولینڈ پر اچانک حملہ کردیا اور پولینڈ کے خطوں پر بے پناہ بموں کی بارش کردی۔

اسی دن جمعہ کو فرانس اور برطانیہ کے سفیر اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے ہٹلر کے پاس الٹی میٹم لیکر پہنچے اور صفائی سے کہدیا کہ "اگر جرمنی نے اپنی فوجیں پولینڈ سے واپس نہ بلالیں تو فرانس اور برطانیہ پولینڈ کے ساتھ وعدہ وفا کرنے پر مجبور ہوں گے" ہٹلر نے اس دھمکی کو قابلِ التفات خیال نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کے زوال کے وقت برطانوی سفیر نے حکومتِ جرمنی کو اطلاع دیدی کہ انگلستان اپنے آپ کو جرمنی کا حریف خیال کرتا ہے۔ اس کے بعد فرانس کے سفیر نے بھی اپنی حکومت کی طرف سے یہی اطلاع دیدی، اس طرح یورپ کی موجودہ جنگ کا افتتاح ہوا۔

(المصور۔ قاہرہ کا جنگ نمبر)

ع۔ص

ادبیات

عرضِ شوق

بحضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا سید مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی

بادِ بہاری اگلشن خرامے (۱) بشنو کلامے بشنو پیامے

رو سوئے طیبہ اکنوں خدارا (۲) در خدمتِ آں وحدت مقامے

آں شہر یارے آں تاجدارے (۳) والا تبارے با احترامے

آں حق پسندے آں حق سرشتے (۴) ذی اقتدارے ذی احتشامے

رحمت مجسم، نعمت سراپا (۵) در ہر دو عالم باخاص و عامے

سیارِ اقصیٰ، سیاحِ اسریٰ (۶) طوبیٰ خرامے سدرہ مقامے

شیریں مقالے شیریں بیانے (۷) شیریں زبانے شیریں کلامے

صادق لسانے حق ترجمانے (۸) گیتی ستانے صاحب زمانے

مخبر خبیرے، امی دبیرے (۹) روشن ضمیرے، نورِ تمامے

اعلیٰ امینے، درِّ ثمینے (۱۰) کرسی نشینے، ارفع مقامے

شمس الضحائے بدر الدجائے (۱۱) نور الہدائے، کہف الانامے

یاسین تاجے، جنت خراجے (۱۲)
از حور و غلماں ہر یک غلامے

طٰہٰ خطابے، قرآں کتابے (۱۳) از حق عطائے از حق پیامے

والشمس روزش، والنجم لیلش (۱۴) والفجر صبحے واللیل شامے

درِّ یتیمے، خلقِ عظیمے (۱۵) یکتا کریمے، وصفِ تمامے

مقبولِ عالم، محبوبِ داور (۱۶) ایں است شانے ایں است نامے

فغفورِ چین و کسریٰ و قیصر (۱۷) پابند حکمے ادنیٰ غلامے

تابع عطارد، محکوم مریخ (۱۸) گردوں سریرے، قدرت نظامے

در مرسلیں ہم رہبرِ مسلّم (۱۹) در انبیا ہم محکم امامے

عزمِ بلندش، انا فتحنا (۲۰) فیضِ لبانش، یحی العظامے

عرشِ معظم یک گام سیرش (۲۱) چرخِ چہارم ادباش نامے

در بزمِ ایماں کوثر بہ ساغر (۲۲) در رزمِ اعدا خونے بجامے

ہم مرگِ کافر، ہم جانِ مسلم (۲۳) تیغ و نیامش تیغ و نیامے

از فطرتِ او، تخلیقِ فطرت (۲۴)
وز نسبتِ او، قائم نظامے

برطارمِ چرخ، مہرِ درخشاں (۲۵) درغزوۂ بدر، ماہِ تمامے

ازہر دو عارض، ماہے ومہرے (۲۶) ماہے ومہرے روشن مدامے

ازہیبتِ او، دوزخ گریزاں (۲۷) وزرحمتِ او جنت بگامے

کونین قرباں، محشر تصدق (۲۸) برہر نگاہے، برہر خرامے

لوحِ جبینش، لوحِ دو عالم (۲۹) نقشِ نگینش، نقشِ دوامے

زلفش بروئش، رویش بزلفش (۳۰) شامے بصبحے، صبحے بشامے

صوتِ کمالش، صیتِ جلالش (۳۱) ازکوہِ فاراں، تاروم وشامے

ازنعرہ ہائے تکبیرِ وحدت (۳۲) شورے فگندہ اندرانامے

ہردوجہانے، فرماں پزیرش (۳۳) ہریک نظامے، درانتظامے

اللہ اللہ ازدشمنِ خود (۳۴) نے شکوہ برلب، نے انتقامے

دنیا بدستے، عقبیٰ بدستے (۳۵) ایں ہم بجامے، آں ہم بجامے

برسلسبیلے، برحوضِ کوثر (۳۶) سیرابِ موجش، ہر تشنہ کامے

ازچشمِ مستش، صہبا بجوشے (۳۷) وزکیفِ جوشش، جامی بجامے

صہبا چہ صہبا، صہبائے عرفاں (۳۸) جامِ چہ جامے، جامے ختامے

مہرے کہ ثبت است از دستِ ساقی (۳۹) ساقی کہ ساقی! ربِ انامے

ازروزِ اول ہرلحظہ شغلے (۴۰) شغلے چہ شغلے، شغلِ مدامے

بادِ بہاری! پیکِ سُبک رُو
(۴۱)
رحمت ازاں سو برتو مدامے

چوں درحریمش افتد گزارت (۴۲) چوں درسوادش سازی قیامے

کن عرضِ مطلب اے شاہِ خوباں (۴۳) وے رحمتِ حق الطفِ تمامے

(۴۴) وصلِ خزینت برتو فرستد

ازجاں درودے وزدل سلامے

ازجورِ گردوں بے برگ وسامے (۴۵) وزظلمِ دوراں بے ننگ ونامے

پنہاں ست دردل حرص وہوائے (۴۶) پیداست درسر سودائے خامے

ترساں ولرزاں افتاں وخیزاں (۴۷) منزل بمنزل گامے بگامے

بیمارِ عصیاں اندیرگاہاں (۴۸) آہے بلبہا صبحے وشامے

پیشِ نظرآں گلزارِ طیبہ (۴۹) نقشِ خیالِ آں شوقِ تمامے

طیبہ چہ طیبہ! دارالامانے (۵۰) طیبہ چہ طیبہ! دارالسلامے

نے دستگاہے، نے زادراہے (۵۱) نے اہتمامے، نے انصرامے

دشوار راہ وانبارِ عصیاں (۵۲) منزل دراز وہنگام شامے

ہرلحظہ دردل ہرلمحہ برلب (۵۳) انظر الینا، شاہِ انامے

عاجزنوازا! آقا ومولا (۵۴) بنگر بسوئے ادنیٰ غلامے

طالع شود چوں صبحِ قیامت

مقبول گردد ازوے سلامے

✣

روحِ تغزل

از جناب احسان دانش صاحب

چپ کھڑے ہیں درمیانِ کعبہ وبتخانہ ہم
کس سے کہدیں کس طرح کہدیں ترا افسانہ ہم

عشق کی یکجائی وایمانِ محکم کی قسم
تجھ ہی تک محدود ہیں اے جلوۂ جانانہ ہم

ہر دو جانب احتیاط اچھی ہے جبتک ہو، مگر،
جانتی ہے انجمن تم شمع ہو پروانہ ہم

ہوگئی مدت بقیدِ ضبط ہیں قلب و نظر
تم ہی خود کہدو کہ کیا اب بھی نہ ہوں دیوانہ ہم

اک مسلسل کشمکش، اک مستقل کرب وگداز
وہ جہاں آگاہ، اور کونین سے بیگانہ ہم

اب حقیقت کیا کہیں، کس سے کہیں، کیونکر کہیں
کچھ تو دیکھا ہے کہ جس سے ہوگئے دیوانہ ہم

وہ محبت ہی نہیں جس میں نہ ہوں شکوے گلے
اک کہانی تم سنائے جاؤ اک افسانہ ہم

جب یہ دیکھا اپنے مرکز پر ہے ہر شے بیقرار
آگئے آخر ترے قدموں میں بیتابانہ ہم

پاسباں مفہوم ومعنی کو بیاں کرتے رہیں
سن چکے سننا تھا جن کو کہہ چکے افسانہ ہم

التجا ہی التجا باقی ہے شکوے ہو چکے
دل میں اب رکھتے ہیں اک ذوقِ پرستارانہ ہم

رک چلیں احسانؔ نبضیں آگیا ہنگامِ موت
اب یہیں سے چھیڑتے ہیں دوسرا افسانہ ہم

شئون علمیہ

قورینیہ میں یونانیوں کے قدیم آثار

طرابلس الغرب کے مشرق میں شہر "لینوس ماگنا" میں جو آثار پائے گئے ہیں وہ رومی قسم کے ہیں۔ لیکن بنغازی کے مشرق میں جو آثار ملے ہیں وہ پرانے یونانی آثار ہیں اور فنی اور تاریخی اعتبار سے اس کو ایک بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ آثار قورینیہ کے شہر میں ملے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے سات صدی قبل (۶۳۱ء ق م میں) یونانیوں نے بنایا تھا۔ اس کے بعد سے تیرہ صدیوں تک یہ شہر خوب سرسبز و شاداب رہا۔ یہانتک کہ عربوں نے اس کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس شہر کے کھنڈروں پر چونکہ کوئی اور شہر تعمیر نہیں ہوا، اس بنا پر اس برباد شدہ شہر کے آثار زمین کے نیچے محفوظ حالت میں پڑے رہے۔ آخر میں یہاں کچھ عمارتیں بن گئی تھیں۔ مگر اٹلی گورنمنٹ نے ان کو گرا دینے کا حکم دیدیا، تاکہ آثار کی کھدائی کا کام بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہ سکے۔

ان آثارِ تاریخی کا انکشاف سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں ہوا اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۳ء میں، اور جیسا کہ مورخین اور علمائے آثار قدیمہ کو توقعات تھیں۔ اس مدفون شہر کے حماموں میں دسوں عجیب و غریب قسم کے مجسمے دستیاب ہوئے ہیں، ان مجسموں میں سکندرِ اعظم کا بھی مجسمہ ہے جو شہر قورینیہ کے قریب بنغازی کے عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔ مجسموں کے علاوہ یہاں متعدد ایسے کتبات بھی ملے ہیں جو تاریخی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے یونانیوں کے طریقہائے عبادت اور قورینیہ کی تاریخ سے متعلق دلچسپ اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مجسموں میں ایک چھوٹا مجسمہ ملا ہے جو لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یونانی اوائل عہد میں مجسموں کی کاریگری

میں لوہا استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض مجسموں سے ان اصولِ مجسمہ سازی پر بھی روشنی پڑتی ہے جو دراصل یونانیوں کی ایجاد و اختراع تھے مگر بعد میں رومیوں نے ان کی نقل کی۔ اور وہ یونانی آثار کے مٹ جانے کے بعد اب تک رومیوں کی ایجاد ہی سمجھے جاتے تھے۔

آخری عنصر کی دریافت

معلوم ہوا ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے ایک محقق ڈاکٹر والٹر منڈر نے ان بیانوے عناصر میں سے آخری عنصر کا پتہ چلالیا ہے جو اب تک نامعلوم تھا۔ ڈاکٹر موصوف نے اس عنصر کا نام سوئٹزرلینڈ کے ایک شہر کی مناسبت سے ہلوپٹوم تجویز کیا ہے۔ لیکن اس سے جو شعاعیں نکلتی ہیں ابھی ان کا تجربہ کرنا باقی ہے۔

شیر خوار بچوں کی اموات کے اعداد

المقتطف مصر نے دودھ پیتے بچوں کے اموات کے جو اعداد و شمار اپنی اشاعت ماہ مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں مصر دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ بدنصیب واقع ہوا ہے۔ چنانچہ اعداد حسب ذیل ہیں۔

مصر	۲۶۵	فی ہزار	اسٹریلیا	۸۹	فی ہزار
ہندوستان	۱۶۲	"	بلجیم	۸۰	"
بلغاریہ	۱۵۰	"	جرمنی	۶۴	"
اٹلی	۱۰۹	"	انگلستان	۵۸	"
جاپان	۱۰۶	"	ہولینڈ	۳۸	"

مصر میں بچوں کی اس کثرتِ اموات کا سبب یہ ہے کہ یہاں کی عورتوں میں عام طور پر

جہالت غالب ہے۔ وہ بچوں کی تربیت اور حفظانِ صحت کی تدابیر سے بے خبر ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ دائیوں کی قلت۔ عام افلاس، اور پھر مفلسی کے باوجود کثرتِ اولاد۔ مکانوں کی تنگی، ماؤں کا کثرت سے موروثی امراضِ معدہ وجگر وغیرہ میں مبتلا ہونا۔ شفاخانوں اور علاج گھروں کی کمی۔ ان اسباب کو بھی اس مصیبتِ عظمی میں بڑا دخل ہے۔ اب ایک کمیٹی نے جو ان امور کی تحقیق کیلئے وزارتِ صحت کی طرف سے مقرر کی گئی تھی۔ اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے ان تمام اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے تدارک کے صورتوں کی سفارش کرتے ہوئے تجویز پیش کی ہے کہ جگہ جگہ بچوں کی تربیت اور ان کی صحت کی نگرانی کیلئے حکومت کی طرف سے ایسے تربیت گھر ہونے چاہئیں جن میں لائق وقابل دائیاں ہر وقت موجود رہیں۔

عمر خیام کی تاریخ پیدائش

عمر خیام پر یورپ اور ایشیا کے محقق اربابِ قلم نے کثرت سے کتابیں اور مضامین لکھے ہیں مگر خود عمر خیام کی تاریخ پیدائش کو قطعی طور پر کوئی متعین نہیں کر سکا تھا۔ حال میں مسٹر وی۔ ام۔ داتر نے جو پہلے حیدر آباد دکن کی اسٹیٹ سروس میں تھے اور اب وہاں سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ عمر خیام پر ایک نہایت قابل قدر کتاب شائع کی ہے۔ جس میں انھوں نے پورے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ اس شاعر حکیم وفیلسوف کی تاریخ پیدائش ۱۸ رمئی ۱۰۴۸ء (مطابق ۴۴۰ھ) ہے۔ فاضل مصنف کی یہ تحقیق اُس ایک علم ہیئت کے حساب پر مبنی ہے۔ جس کو علامہ بیہقی نے تتمۂ صوان الحکمۃ میں بیان کیا ہے۔ مسٹر داتر پہلے فاضل ہیں جنھوں نے خیام کی تاریخ پیدائش کی قطعی تعیین کر کے خیامیات میں ایک نیا انکشاف کیا ہے۔

تبصرے

پاکستان، ایک قوم (انگریزی) از جناب الحمزہ صاحب۔ ضخامت ۱۲۵ صفحات ٹائپ عمدہ اور جلی خوبصورت مجلد قیمت تین روپیہ۔ پتہ:۔ شیخ محمد اشرف صاحب، ناشر کتب لاہور۔

آج کل پاکستان کا نام ہر چھوٹے بڑے مسلمان کی زبان پر ہے، جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ "متحدہ قومیت" کا نظریہ پیش کرتے ہیں، زیر تبصرہ کتاب میں جناب مولف نے یہ بتایا ہے کہ جو قومیں ہندوستان میں آباد ہیں وہ کس طرح ایک دوسرے سے جغرافیائی، لسانی، معاشرتی اور مذہبی واقتصادی اعتبار سے مختلف ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جناب مولف ہندوستان کو یورپ سے منطبق بھی کرتے گئے ہیں اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب یورپ کے باشندے ایک ہی "سفید فام خاندان" سے متعلق ہونے کے باوجود مختلف قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں، تو پھر ہندوستان میں تو رنگ برنگ کے لوگ آباد ہیں۔ ان سب کو کس طرح ایک قوم بنایا جا سکتا ہے فاضل مولف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یورپ کی موجودہ صنعتی و حرفتی اور علمی ترقی کا راز یہی قومیتوں کا اختلاف ہے۔ اگر ہندوستان کو بھی مختلف قوموں میں بانٹ دیا جائے تو پھر ہمارا ملک بھی ترقی کر سکتا ہے۔ کتاب بحیثیت مجموعی پاکستان بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ نظریۂ اقوام مختلفہ کے متعلق ایک سنجیدہ اور پراز معلومات بحث پر مشتمل ہے۔ اور ہماری رائے میں اگرچہ اس کے بعد بھی مجالِ گفتن بہت کچھ باقی رہتی ہے تاہم کتاب اس لائق ہے کہ موافق و مخالف ہر ایک ٹھنڈے دل کے ساتھ اس کا مطالعہ کرے۔ اچھا ہوتا کہ مصنف بجائے "الحمزہ" لکھنے کے اپنا پورا نام ظاہر کر دیتے۔ کیونکہ پاکستان کی حمایت کوئی منصور کا نعرۂ انا الحق تو نہیں ہے کہ اس کی پاداش میں دار و رسن کا خوف دامنگیر ہو

اور اگر یہ خوف ہو بھی تو کیا مضائقہ ہے جبتک ایک ایک مسلمان منصور کی طرح دار و رسن کے لئے تیار نہیں ہو جائیگا پاکستان کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

بیٹے | مترجمہ احسان علی شاہ صاحب بی۔ اے آنرز تقطیع خورد ضخامت ۲۹۸ صفحات کتابت وطباعت عمدہ جلد اور گرد پوش خوبصورت ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔

یہ امریکہ کی مشہور ناول نویس خاتون پرل۔ ایس۔ بق۔ کے مشہور ناول سنز (Sons.) کا با محاورہ اور سلیس وردان اردو ترجمہ ہے۔ موصوفہ نے چین میں طویل قیام کرنے اور وہاں کی زندگی کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد چین کی زندگی سے متعلق ایک ناول "اچھی زمین" لکھا تھا۔ یہ ناول اتنا کامیاب ہوا کہ مصنفہ کو اس پر نوبل پرائز ملا۔ اور اس کا فلم بھی بنایا گیا تھا۔ "بیٹے" اسی اچھی زمین کے فرزندوں کی نہایت دردانگیز داستانِ حیات ہے جس میں چینیوں کی قحط زدہ زندگی، ان کی انتہائی افلاس اور غریبی کی لرزہ فگن تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ کتاب ادبی اور سماجی مطالعہ دونوں حیثیتوں سے پڑھنے کے لائق ہے۔

ادبی تاثرات | از مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب ایم۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۱۴۴ صفحات کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ مجلد قیمت درج نہیں پتہ:۔ ادارۂ ادبیات حیدر آباد دکن۔

ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری حیدر آباد دکن کے مشہور محقق صاحب قلم ہیں۔ اور بیس سے زیادہ کتابیں اب تک تصنیف کر چکے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو ادب کا مستقبل شاندار بنانے میں ان کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب جناب موصوف کے ہی چھوٹے چھوٹے مقدموں اور تبصروں کا مجموعہ ہے جس میں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شروع میں جناب مرتب کے قلم سے دس صفحات کا ایک مقدمہ ہے جس میں ڈاکٹر زور صاحب کی ادبی خدمات اور ان کے طرزِ انشار و تنقید پر گفتگو کی گئی ہے۔ آخر میں اسماء و اعلام کی فہرست

حروف تہجی کی ترتیب کے اعتبار سے ہے۔

علم خانہ داری مرتبہ محمودہ صاحبہ صدیقی۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۴۸ صفحات. کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت عہ۔ پتہ:۔ ادارہ ادبیات حیدر آباد دکن۔

اس کتاب میں لائق مؤلفہ نے ان ضروری معلومات کو یکجا کر دیا ہے جن کا علم خانہ داری کیلئے ازبس ضروری ہے چنانچہ جسم کی ساخت اور اس کے افعال، پھر مختلف اعضا اور ان کے افعال، عضلات اور اعصاب، جسمانی حفظِ صحت، لباس، غذا وغیرہ کا انتظام، گھر کی نگہداشت، صفائی اور ستھرائی عام وقتی امراض۔ اور ان کی روک تھام۔ یہ اور اُن کے علاوہ دوسری چیزیں جو خانہ داری سی تعلق رکھتی ہیں۔ بہت صاف اور سلجھی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہیں کتاب لائقِ مطالعہ ہی نہیں بلکہ اس قابل ہے کہ اسکا ایک ایک نسخہ ہر گھر میں رہے۔

ہندوستانی کھیل از خواجہ الطاف علی صاحب۔ تقطیع خورد ضخامت ۷۶ صفحات. کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لکھنؤ و لاہور۔

اس کتاب میں ہندوستانی کھیلوں کی ترکیب، ان کی اصطلاحات اور فوائد سہل اور آسان زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ شروع میں تربیتِ جسمانی پر ایک مفید مقدمہ ہے۔ پھر کھیل زیادہ تر وہی ہیں جو ۷ سے ۱۴ سال کی عمر تک بچے کھیل سکتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ انگریزی کھیلوں کی طرح ان میں کچھ ایسا زیادہ صرف بھی نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کتاب بہت دلچسپ اور مفید ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان میں ایک نئی چیز ہے۔

نانسیت از شاہد حسین صاحب رزاقی ایم اے۔ تقطیع خورد ضخامت ۱۶۷ صفحات کتابت وطباعت عمدہ قیمت مجلد عہ پتہ:۔ مکتبہ جامعہ دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنو، بمبئی۔

رزاقی صاحب نے اس کتاب میں تحریک نانسیت یا نازِزم کا وجود اور ارتقا اور اس کا تاریخی پس منظر

سہل اور سلیس زبان میں بتایا ہے۔ اور آخر میں اس تحریک کے اچھے اور برے پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ چونکہ نانسیت کا موجودہ ارتقار ایک بحرانی کیفیت میں ہوا۔ اور یہ فی نفسہ ایک بحرانی اصول ہے اس بنا پر اس کا دیرپا ہونا مشکل ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس تحریک کے حسن و قبح پر اور اسکے تمام پہلوؤں پر آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرنا ممکن ہے۔ پھر اس تحریک کے عوامل و اسبابِ ارتقار، موجودہ جنگ کے ابتک کے نتائج کے پیش نظر کچھ زیادہ واضح اور صاف بھی نہیں ہیں۔ تاہم اردو خواں طبقہ کیلئے یہ کتاب بسا غنیمت ہے۔ اور انھیں اسکے مطالعہ سے تحریک کے متعلق مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

سلطان ٹیپو مرتبہ جناب عبداللہ صاحب بٹ بی۔ اے (آنرز) تقطیع متوسط ضخامت ۲۴۰ صفحات کتابت و طباعت عمدہ قیمت مجلد عہ/ پتہ:۔ قومی کتب خانہ لاہور۔

یہ ان چند متفرق مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو آل پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام "یوم ٹیپو" کے موقع پر لاہور میں پڑھے گئے تھے۔ اس مجموعہ میں جو مضامین درج ہیں اُن سے سلطان مرحوم کی زندگی اور ان کے جہاد کے متعلق بڑی بصیرت پیدا ہوتی ہے اور وہ درسِ عبرت و موعظت تازہ ہو جاتا ہے جس کو مسلمان عرصہ ہوا کہ فراموش کر چکا ہے۔ پنجاب کے زندہ دل اور حساس مسلم نوجوانوں کا یہ کارنامہ بے شبہ تحسین و آفریں کا سزاوار ہے۔ ہم مسلمانوں سے پر زور درخواست کرتے ہیں کہ اس کتاب کی ایک ایک کاپی خرید کر ضرور مطالعہ کریں۔

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را ـــ تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

تعلیم جدید پر ایک نظر از جناب محمد صدیق میمن صاحب صدیقی۔ تقطیع خورد ضخامت ۴۰ صفحات قیمت درج نہیں۔ شائع کردہ انجمن اسلامی تمدن و تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اس مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں کونسا علم مفید ہے اور کونسا غیر مفید انگریزی تعلیم کے رواج سے پہلے ہندوستان میں تعلیم کا کیا انتظام تھا اور مدرسے کس کثرت سے تھے پھر انگریزی تعلیم رائج کی گئی تو کن مقاصد کے ماتحت، اور یہ کہ اس تعلیم جدید نے ہماری ذہنیت، مذہب، معاشرت اور عام تہذیب و تمدن پر کیا اثرات کئے ہیں۔ آخر میں موجودہ تعلیم کے نقائص کو دور کرنے کی اہم تدبیریں بھی بتائی گئی ہیں۔ یہ رسالہ انجمن کے سلسلہ مطبوعات ۷۸ کا چھٹا رسالہ ہے اور مطالعہ کے لائق ہے۔

مسئلۂ وحی پر پہلی محققانہ کتاب

"وحی الٰہی"

"وحی الٰہی" ہماری زبان میں پہلی بے مثل محققانہ کتاب ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے سنجیدہ اور دلپذیر و دلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اسکی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے۔ اس کتاب میں وحی کی لغوی اور شرعی حقیقت، وحی کے اقسام، وحی سے متعلقہ مباحث مثلاً صفاتِ الٰہی خصوصاً صفتِ کلام۔ ملکۂ نبوت اور استعدادِ وحی۔ وحی اوّلاً کس طرح نازل ہوئی اور آخر تک کن کن طریقوں سے نازل ہوتی رہی۔ قرآن نے اپنے وحی ہونے کے کیا کیا دلائل بیان کئے۔ وحی کی حقیقت جدید فلاسفۂ مغرب کے نزدیک ان سب عنوانوں پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں اعجازِ قرآن پر بالکل جدید طرز سے گفتگو کی گئی ہے جس میں وجوہِ اعجاز کی تنقیح کر کے ہر وجہ اعجاز پر بصیرت کی پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ وحیِ الٰہی کے سلسلہ میں جسقدر عقلی اور نقلی شکوک و شبہات کئے گئے ہیں اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کا کلی طور پر ازالہ ہو سکتا ہے اور طالبِ حق کیلئے ہدایت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ترتیب کی دلنشینی اور اندازِ بیان کی شگفتگی کیلئے مولٰنا سعید احمد مدیر برہان کا نامِ نامی کافی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ فرمائیں۔ وحی جیسے نازک اور الجھے ہوئے مسئلہ کا حل اس سے بہتر انھیں کہیں نہیں ملیگا۔

کتابت طباعت نہایت اعلیٰ۔ - قیمت غیر مجلد عہ مجلد عہ دو روپیہ چار آنے

ملنے کا پتہ

منیجر ندوۃ المصنفین قرولباغ نئی دہلی

Registered No. L 4305

قواعد

۱- برہان ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

۲- مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اُتریں برہان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

۳- باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاکخانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیں۔ ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلاقیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

۴- جواب طلب امور کے لیے ۱ر کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵- "برہان" کی ضخامت کم سے کم اسّی صفحے ماہوار اور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۶- قیمت سالانہ پانچ روپیے۔ ششماہی دو روپے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ر

۷- منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر مولوی محمد ادریس صاحب پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ برہان قرول باغ نئی دہلی سے شائع کیا

THE A. L. J. PRESS, ALLAHABAD